ماہنامہ
دوشیزہ
کراچی

September
2015

بانی
سہام مرزا

ماہنامہ دوشیزہ کراچی

مُدیرِ اعلیٰ ــــــــ منزہ سہام
مُدیر ــــــــ کاشی چوہان / رضوانہ پرنس
نائب مُدیر ــــــــ دانیال شمسی
منیجر مارکیٹنگ ــــــــ زین العابدین
قانونی مُشیر ــــــــ جی ایم بھٹو (ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)
انکم ٹیکس ایڈوائزر ــــــــ مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹ)

MEMBER
APNS
CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

ستمبر 2015ء
جلد:43 ☆ شمارہ:09
قیمت:60 روپے

خط وکتابت کا پتا
88-C II۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ
جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز 7۔ کراچی
فون نمبر: 35893122 - 021-35893121
ای میل: pearlpublications@hotmail.com

☆ منیجر سرکولیشن: محمد اقبال زمان ☆ عکاس: موسیٰ رضا / مرزا محمد یاسر

باتیں ملاقاتیں

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

افسانے

انتخابِ خاص

رنگِ کائنات

دوشیزہ میگزین

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)......890 روپے

ایشیا' افریقہ' یورپ......5000 روپے

امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا......6000 روپے

پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: سٹی OB-7 تالپور روڈ۔ کراچی

Phone : 021-35893121 - 35893122

Email : pearlpublications@hotmail.com
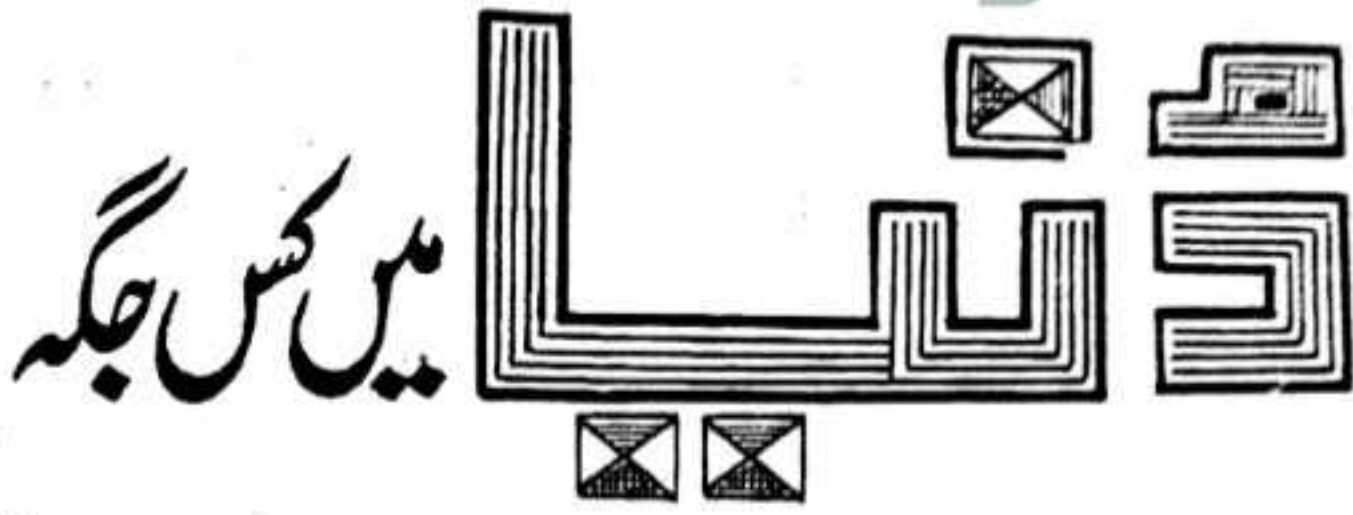
سچی کہانیاں کے چرچے نہیں

اس لیے کہ "سچی کہانیاں" کے مصنفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے، دیکھتے، محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں۔ "سچی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں

یہی وجہ ہے کہ "سچی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے "سچی کہانیاں" میں آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، اعترافات، جرم و سزا کی کہانیاں، ناقابلِ یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین و مُدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ "سچی کہانیاں" میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا — اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

ماہنامہ سچی کہانیاں، پرل پبلی کیشنز : 88-C-II فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔
ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی
فون نمبر: 021-35893121-35893122
ای میل : pearlpublications@hotmail.com

پھر ملیں گے اگر...

پیارے ساتھیو! آج دل چاہ رہا ہے بہت ساری باتیں کروں۔ سب سے پہلی بات...... میں نے زندگی کو جس رُخ پر دیکھا، پرکھا، محسوس کیا، کوشش یہی کی، کہ بالکل اُسی طرح آپ کے گوش گزار کر دوں۔ 2008 سے ہمارا آپ کا ساتھ رہا۔ سال گزرتے چلے گئے...... کتنے پیارے پیارے ساتھی آئے...... میرے ساتھ رہے۔ وقت کا کام گزرنا ٹھہرا۔ وقت گزرتا چلا گیا اور...... وقت ہمیں لیے لیے آگے بڑھتا رہا۔ آج! آپ سب کی محبتیں، میرا مان ہیں۔ کہتے ہیں کہ اپنے ساتھ کچھ ایسا ضرور رکھنا چاہیے جو زادراہ کی صورت، زندگی کے چٹیل میدانوں میں روشنی کا مینار ثابت ہو۔ میرا زادراہ آپ سب کی محبتیں ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ خواب کی دہلیز پر محبت کا پھول 'دن' جیسا روشن مہک رہا ہوگا اور ایک دن محبت آدمی کو مکمل کردے گی۔

ساتھیو! آنکھوں میں خواب دیکھے جاسکتے ہیں اور ان خواب بھری آنکھوں کو درختوں پر محبت کے تعویذ کی صورت مقدس دھاگے میں لپیٹ کر لٹکایا جاسکتا ہے۔ درخت کسی بھی موسم میں کاٹے جاسکتے ہیں۔ کاش! ایسا ہو کہ جب محبت کے دریا بہنے لگیں اور سمندر رستہ بھولنے لگیں۔ ان محبتوں کے درختوں کی کشتیاں بنا کر ان دریاؤں میں بہادی جائیں...... محبت اپنا رستہ آپ بنالیتی ہے۔ محبت کی کشتیاں آپ ہی آپ کسی بھی ساحل پہ اتر کر محبتوں کے شہر آباد کرلیں گی۔

لیجیے ساتھیو! محبتوں کے مان کو میں اِن محبتوں کی کشتیوں میں اتار کر حرف حرف محبتوں کے بادبانوں سمیت آپ کے دلوں میں چھوڑے جا رہا ہوں۔ اگر کسی کا دل دکھا ہو تو...... معاف کیجیے گا۔ سچی کہانیاں کی ادارت کا بوجھ بھاری ہے، لہٰذا انصاف کا تقاضہ ہے کہ...... الوداع......

پیارو! میرا اسلام آخر قبول کرو......

کاشی چوہان

آغازِ سفر

منورہ نوری خلیق

زادِ راہ

انسان استقلال مانگتا ہے تو پہلے آزمائش ہوتی ہے، پھر استقلال آتا ہے۔ انسان قوت برداشت مانگتا ہے تو پہلے نامساعد اور سخت حالات سے سابقہ پڑتا ہے تب قوت برداشت پیدا ہوتی ہے۔ انسان یقین کی دولت چاہتا ہے تو پہلے ہر رشتے سے......

زندگی کو آسان، باعمل اور ایمان افروز بنانے کا روشن سلسلہ

انسان مانگتا ہے اور اللہ تعالیٰ اُسے عطا کرتا ہے مگر سچ یہ ہے کہ انسان نہ اپنی ضروریات سے واقف ہے نہ مانگنے کے طریقے سے، نہ اپنی طلب سے نہ اس کے انجام سے اور نہ اُس شے کی حقیقت سے، جسے وہ مانگ رہا ہے۔ ایک اعرابی، اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہا تھا کہ اے اللہ! مجھے صبر عطا کر۔ حضور ﷺ نے اس کی دعا کو سنا اور فرمایا۔ ''اللہ تعالیٰ سے صبر مت مانگ کیونکہ صبر مصیبت پر کیا جاتا ہے۔ پہلے مصیبت آئے گی، پھر صبر کی توفیق ملے گی۔ تُو اللہ سے شکر ادا کرنے کی توفیق مانگ تو نعمت عطا ہوگی۔ کیونکہ شکر نعمت پر کیا جاتا ہے۔۔ تو شکر ادا کرنے کی توفیق مانگے گا تو پہلے نعمت عطا ہوگی پھر توفیق عطا ہوگی۔'' حضرت لقمانؑ کی والدہ نے نصیحت کی کہ میرے بیٹے! مالک سے مانگنا نہیں بلکہ جو کچھ وہ عطا کرے، اس پر شکر ادا کرتے رہنا۔'' حضرت لقمان علیہ السلام نے عمر بھر شکر کیا اور بارگاہ الٰہی سے ہر نعمت پائی کیونکہ شکر ادا کرنے سے نعمت عطا ہوتی رہتی ہے۔ انسان کو مانگے بنا ہی وہ سب کچھ ملتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ اور اُس کے لیے کیا بہتر ہے یہ اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ کبھی کسی ادنیٰ شے کے لیے انسان سب کچھ قربان کر دیتا ہے اور اُسے خبر ہی نہیں ہوتی۔ مدینہ منورہ میں اسلام آیا تو بہت سے لوگ مسلمان ہوئے۔ ان میں ایک ثعلبہ بھی تھا۔ مدینے میں رہتا۔ چند مویشیوں کا مالک مدینے کی چراگاہ میں بکریاں لے جاتا اور بلاناغہ مسجد میں آتا، گھر سے نکلتا، کچھ وقت کے لیے ضرور خدمت میں حاضری دیتا۔ اس کی سب سے بڑی آرزو تھی دولت، کشائش اور تجارت جس کے لیے اکثر دعا کیا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے خدمت اقدس میں عرض کیا کہ یارسول اللہ! میرے لیے کشائش کی دعا کیجیے۔ حضورؐ نے اُسے دیکھا اور فرمایا۔

''جس تھوڑے پر شکر ادا کیا جائے، وہ اس سے زیادہ بہتر ہے جو غفلت میں لے آئے۔''

ثعلبہ پر اس ہدایت کا کوئی اثر نہیں ہوا، نہ وہ اس کے معنی سمجھا بلکہ دولت کی آرزو اُسے بے چین کرتی رہی اور وہ خدمت میں حاضر ہو کر بار بار دعا کی استدعا کرتا رہا اور یہی اصرار کرتا رہا کہ یارسول اللہ! میرے لیے دولت کی دعا کیجیے۔ پھر اس نے عہد کیا کہ اگر مجھے مال و دولت مل جائے تو میں غفلت میں نہیں پڑوں گا بلکہ خیرات کروں گا۔ حضور اکرم ﷺ نے اس کے لیے

دعا کی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی بکریوں میں برکت پیدا ہوئی۔ اس سال ہر بکری نے ایک بکری کو جنم دیا۔ تجارت میں بھی منافع ہوا۔ بہت کم وقت گزرا تھا کہ ثعلبہ کو لگا کہ مدینے کی چراگاہ اس کے مویشیوں کے لیے ناکافی ہے۔ بکریاں بھوکی رہ جاتی ہیں اور اس کے مویشیوں کے لیے اصطبل بھی چھوٹا ہے۔ پانی بھی کم ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اس نے اپنا سکونتی گھر بھی تبدیل کیا اور مسجد سے فاصلے پر ایک بڑے گھر میں منتقل ہو گیا جہاں چراگاہ بھی کشادہ تھی اور اصطبل بھی بڑا مگر اب وہ ہر نماز کے لیے مسجد نہیں آسکتا تھا لہٰذا صرف جمعے کو آتا اور چھے دن غائب رہتا۔ اور اس کا واضح جواز موجود تھا۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ علاقہ بدلنے سے فاصلہ بڑھ گیا ہے، جانور بڑھ گئے، مصروفیت بڑھ گئی اور اب خدمتِ اقدس میں ہفتے میں صرف ایک ہی دن جایا جاسکتا ہے۔ اور جب وہ اس صورتحال پر غور کرتا تو اُسے اپنی مصروفیات اہم نظر آتی۔ مسجد میں حاضری نہ دینے کا نقصان کم تھا اور مویشیوں سے بے پروائی زیادہ نقصان دہ تھی۔ کچھ وقت اور گزرا اور اس کے مویشیوں میں مزید اضافہ ہوا، تجارت بڑھی اور اللہ تعالیٰ نے اُسے اس قدر برکت دی کہ اب اس کے لیے یہ علاقہ بھی چھوٹا پڑا تب اُس نے مدینہ منورہ سے باہر سکونت اختیار کر لی اور فاصلہ اتنا بڑھ گیا کہ وہ جمعے کو بھی مدینے نہیں آسکتا تھا۔ کچھ وقت گزرا، تو حضور ﷺ نے لوگوں سے دریافت کیا کہ ثعلبہ کہاں ہے؟ لوگوں نے کہا۔

''یارسول اللہ ﷺ ثعلبہ خراب ہو گیا۔'' کسی نے اطلاع دی ''یارسول اللہ ﷺ ثعلبہ اپنی دولت کے حساب کتاب میں گم ہے۔

قرآن پاک میں اسی واقعے کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ ''ان میں سے بعض تو ایسے ہیں جنہوں نے عہد کیا تھا کہ اگر اللہ نے اپنے فضل سے ہمیں نوازا تو ہم خیرات کریں گے اور صالح بن کر رہیں گے مگر جب اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دولت مند کر دیا تو وہ بخل پر اتر آئے اور اپنے عہد سے ایسے پھرے کہ انہیں اس کی پروا تک نہیں ہے۔ نتیجہ یہ کہ ان کی بدعہدی کی وجہ سے جو انہوں نے اللہ کے ساتھ اور اس جھوٹ کی وجہ سے جو وہ بولتے رہے، اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق بٹھا دیا۔ اس کے حضور، ان کی پیشی کے دن تک ان کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ (سورۃ التوبہ......) قرآن پاک کا یہ اشارہ اسی طرف نہیں بلکہ ہم سب کی طرف ہے کیونکہ ہم سب کے اندر کے ثعلبہ موجود ہے۔ جو اپنے اندر کے نفاق سے ناواقف، سود و زیاں کے فرق کو محسوس کیے بغیر جیتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ کس تکلیف کے ساتھ کون سی خوشی ملنے والی ہے اور کس خوشی کے ساتھ کون سی تکلیف آنے والی ہے اور بھول جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کے کامل نظام میں، اس کائنات میں ہر شے پورے کل اور جز کے ساتھ ہے۔ جب انسان بارگاہِ الٰہی سے مانگتا ہے تو وہ شے پورے کل اور جز کے ساتھ عطا ہوتی ہے۔ انسان صبر مانگتا ہے تو پہلے مصیبت آتی ہے، پھر صبر کی توفیق نصیب ہوتی ہے۔ انسان استقلال مانگتا ہے تو پہلے آزمائش ہوتی ہے، پھر استقلال آتا ہے۔ انسان قوت برداشت مانگتا ہے تو پہلے نامساعد اور سخت حالات سے سابقہ پڑتا ہے تب قوت برداشت پیدا ہوتی ہے۔ انسان یقین کی دولت چاہتا ہے تو پہلے ہر رشتے سے مایوسی کے بعد اس ہستی کا یقین آتا ہے کیونکہ جہاں اور جس دل میں خالق حقیقی کا یقین موجود ہو، وہاں کسی شے کی ضرورت ہی نہیں۔ دولت کے ساتھ غفلت اور شہرت کے ساتھ بدنامی آتی ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ دعا خیر کی طلب ہے۔ انسان، اللہ تعالیٰ سے خیر مانگتا ہے، اپنے لیے اور سب کے لیے تو اللہ تعالیٰ خیر عطا فرماتا ہے۔ شاید اسی لیے کہ خیر کا جزو بھی خیر ہے اور کل بھی خیر ہے۔ خیر کا آغاز بھی خیر ہے اور انجام بھی خیر، مگر ہم انجام سے بے پروا ہو کر مانگے چلے جاتے ہیں۔

☆☆......☆☆

دوشیزہ کی محفل

محبتوں کا طلسم کدہ' خوب صورت رابطوں کی دلفریب محفل

خط بھجوانے کے لیے پتا: ماہنامہ دوشیزہ ڈائجسٹ۔ 88-C II ۔خیابان جامی ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی
E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بہت پیارے دوستو!
لندن سے آپ کو خوش آمدید کہتی ہیں آپ یہ مت سمجھیے گا کہ ہم لندن ہی کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ انشاء اللہ اگلے ماہ یہ محفل کراچی سے سجے گی۔ ویسے بھی انٹرنیٹ نے فاصلوں کو کچھ ایسا سمیٹ دیا ہے کہ سات سمندر پار جا کر بھی آپس میں دوریاں محسوس ہی نہیں ہوتیں اب اور آپ سب تو ویسے بھی اپنے پیارے خطوط کے ذریعے ہمارے رابطے میں رہے لیکن پتا ہے دوستو! اب جب اپنے عزیز از جان پیاروں سے دور جانے کا وقت نزدیک آ رہا ہے۔ ایک بے نام سی اُداسی دل میں اترتی محسوس ہو رہی ہے اور سائپرس اور لندن میں گزرا ہوا وقت اپنے دل میں چھپا کے بہت جلد آپ لوگوں کے پاس لوٹ رہے ہیں۔

دوستو! آپ سے ایک اور ضروری بات بھی کرنی ہے۔ اس دفعہ ہمیں ایسے بے شمار میسجز موصول ہوئے جو ہم سے اپنی تحریروں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہ رہے تھے۔ انشاء اللہ کراچی پہنچتے ہی ان تمام تحریروں پر نظر ڈالیں گے آپ لوگوں سے گزارش ہے کہ آپ 15 ستمبر کے بعد اپنی تحریروں کے متعلق ہم سے پوچھ سکتے ہیں۔ اچھا دوستو! یہاں پر اس وقت سیاہ گھٹاؤں اور رم جھم برستی بارش نے موسم کو بہت حسین بنایا ہوا ہے لیکن ذرا یہاں کے لوگ تو دیکھیے۔ سب ہی اس موسم سے بے زاری کا اظہار کر رہے ہیں یہ بھی کمال کی بات ہے۔ کاش کہ اس موسم کے کان ہوتے تو ہم اس کو چپکے سے بتا دیتے کہ تمہاری اصل قدر تو پاکستان میں ہے۔ تو بھئی اس بات کے ساتھ ہم آپ سے اجازت چاہتے ہیں۔ اگلے ماہ آپ سے کراچی ہی سے ملاقات ہوگی۔

✉: محفل میں یہ آمد ہے اپنے تفصیل تبصرے کے ساتھ ہماری بہت پیاری سنبل کی، لکھتی ہیں۔ عرصہ آٹھ ماہ بعد خط لکھ رہی ہوں بہت سارے ساتھیوں کی محبت کا قرض ہے۔ سب سے پہلے آپ کو بہت بہت مبارکباد ہو دوشیزہ میں شمولیت کی۔ میرے بھیا نے دوشیزہ کو چار کے بجائے آٹھ چاند لگائے ہوئے تھے اور آپ دونوں مل کر اِسے یقیناً 16 چاند لگا رہے ہیں۔ اس آٹھ ماہ کے عرصے میں بہت سے ساتھیوں کو خوشیاں اور بہت سے ساتھیوں کو غم ملے۔ میں سب کے ساتھ رہی مگر خط نہ لکھنے کی وجہ سے مبارکبادیں اور تعزیتیں نہ کر سکی سو سب سے پہلے ادھر ہی آتی ہوں۔ رضوانہ جی! آپ کی والدہ، دلشاد نسیم کی والدہ، رضوانہ کوثر کے بھانجے، طلعت اخلاق کی والدہ آپ سب کے پیاروں خصوصاً ماؤں جیسی عظیم دولت چھن

جانے پر دل دکھ سے بھر گیا اور ماں کے بچھڑنے کا دکھ کیا ہوتا ہے یہ شاید ماں کی زندگی میں نہ پتا چلے اس کے چلے جانے کے بعد خوب پتا چلتا ہے کہ رب کائنات موسیٰ سے کہہ اٹھتا ہے ''اے موسیٰ! سنبھل کے، اب تیرے پیچھے دعا کرنے والے ہاتھ نہیں رہے۔ آپ سب کے پیاروں کو اللہ اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین۔ اب باری ہے مبارکوں کی رضوانہ جی آپ کو اک نئے موڑ پر کی اشاعت کی بہت مبارک ہو۔ اس کے علاوہ عادل حسین اور طاہر صدیقی کو شادی کی مبارکیں، نسیم نیازی کو کتاب کی اشاعت احمد سجاد کو ردائے شب کی اشاعت اور بیٹے کی پیدائش، تابندہ سہام کو نئی زندگی کی نئی خوشیاں، شگفتہ شفیق کو کنزل کی شادی، گولڈ میڈل اور شیلڈ کی بہت بہت مبارکباد قبول ہو۔ کوئی سہو ارہ گیا ہو تو معذرت خواہ ہوں۔ اسی دوران عقیلہ حق کا ناول بہت خوبصورتی سے اختتام پذیر ہوا۔ عقیلہ حق ویلڈن جتنا زرقون کو شروع سے رلایا ہے اُسے اتنا ہی اچھا اجر بھی ملا۔ نعمان تمہاری پہلی کوشش ناول کی اچھی تھی بس کوشش یہ کرو کہ جو پیغام دینا ہے تمام کردار و واقعات اور ان کی گفتگو اسی موضوع اور پیغام کے گرد گھومے۔ شمع حفیظ کی آمد بہار کے جوشگوار جھونکے کی مانند ہے مگر ہر بار 11 اگست گزر جاتی ہے اور آپ میری بائیسویں سال گرہ کی مبارکباد دینا بھول جاتی ہیں۔ کچھ لوگوں کی محبتیں نہال کر دیتی ہیں اور رضوانہ کوثر ایسی ہی ہیں میرے بچوں کی سالگرہ ہو یا میری سب سے پہلے وہ وش کرتی ہیں۔ فون SMS غرض محبت کرنا سیکھنی ہے تو رضوانہ کوثر سے سیکھیں۔ خوش رہیں رضوانہ، آباد رہیں نہال رہیں۔ مسز نوید ہاشمی جو لوگ ہم سے محبت کرتے ہیں وہ خود بھی ہمارے دلوں میں رہتے ہیں اور آپ میرے دل میں ہیں مگر پلیز اپنا نام لکھا کریں! کسی کی مسز بن جانے سے ہماری شخصیت ختم نہیں ہو جاتی وہ اپنی جگہ مسلمہ ہے۔ اب آتے ہیں زیر نظر شمارے کی طرف کاشی تمہارے اداریے سوچنے والوں کے لیے لمحہ فکر ہیں ماشاء اللہ۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ہو۔ دوشیزہ کی محفل اپنے گھر میں بجی دوستوں کی تقریب محسوس ہوتی ہے۔ نعت ایمان افروز تھی میرے ساتھیوں آپ سب کو اعتراض ہے کہ آخر ARY کے ہی پروگرامز پر تبصرہ کیوں؟ میرے معصوم ساتھیوں ARY والے کہتے ہوں گے تو وہ کرتے ہیں۔ اگر دیگر چینلز بھی چاہیں تو تبصرہ ہو جائے گا۔ آئم رائٹ نا رضوانہ جی اینڈ کاشی۔ رفعت جی کی تعریف تو سورج کی روشنی میں موبائل ٹارچ جلانے کی سی ہے۔ دام دل نے پہلی ہی قسط سے اپنے سحر میں جکڑ رکھا تھا مگر معذرت کے ساتھ بینا تیرے عشق نچایا اب بور کرنے لگا ہے۔ اگر بینا کہانی میں کوئی ٹوئسٹ لانا ہے تو فوراً

لے آئیں کیونکہ موجودہ قسط کو پورا پڑھنے کے بجائے میں نے صرف ڈائیلاگز پڑھے یہ دیکھنے کے لیے کہ آیا کہانی آگے بڑھی...... مگر ناجی وہ تو وہیں کی وہیں کھڑی ہے۔ بہتر ہے اب اس کا اختتام کر دیں۔ ٹائٹل خاصا بے باک تھا۔ روزینہ حنیف نے بہت عام سی کہانی کو اینڈ میں خاص بنا دیا۔ صدف آصف کا افسانہ فارمولہ افسانہ تھا۔ اُم مریم کی تحریر میں شدت پسندی ہے، انتہاء پسندی ہے اور کمال کی بات یہی شدت وانتہاء پسندی قاری کو جکڑ لیتی ہے۔ باندھ لیتی ہے، سزا لگانے کا شکریہ۔ ہما راؤ کا افسانہ فارمولہ ٹھیک ہی تھا۔ تسنیم جی کا تو انداز اتنا منفرد ہے کہ کیا کہنے عام بات کو بھی اتنا خاص انداز میں کہتی ہیں کہ مزہ آجاتا ہے۔ خولہ عرفان کا افسانہ اگر پہلا تھا تو اچھا تھا۔ فوزیہ کا ناولٹ بہت اچھا جا رہا ہے۔ مجھے تو اس کا نام ہی اتنا پسند ہے۔

لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی۔

نیر شفقت کا افسانہ بہت خوب تھا۔ نفیسہ سعید میری فیورٹ رائٹر ہیں یوں تو مہر النساء بھی اچھا تھا مگر نفیسہ جی! کوئی ''سادا چڑیاں دا چنبا'' جیسی تحریر دوشیزہ کی بھی نذر کریں۔ قدرت اللہ شہاب کی تحریر ماسٹر شار بہت خوبصورت فن پارہ تھی۔ دوشیزہ گلستان بہت اچھا جا رہا ہے۔ نئے لہجے میں سب ہی اچھا لکھ رہے ہیں تب ہی تو چھپ رہے ہیں۔ زین کے جوابات کھٹے میٹھے ہوتے ہیں۔ رنگ کائنات مزیدار تھا۔ نفسیاتی الجھنیں اچھا سلسلہ ہے۔ باقی عقیلہ، فرح کہاں ہو یار! میں تم لوگوں کو مس کرتی ہوں، اور آپ کی لندن سے کب واپسی ہے اور کاشی عالیجاہ! ارحم۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا اور دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

✉: اچھی سنبل! بھئی تمہارے خط کو پورا لگا دیا۔ اب کتنے ماہ بعد حاضر ہو گی تم لڑکی۔

✉: فریدہ جاوید فری لاہور سے شریک محفل ہیں لکھتی ہیں۔ میٹھی رضوانہ پرنس جی۔ رضوانہ جی آپ کا افسانہ جولائی کے شمارے میں ساجن سنگ عید بعد میں پڑھا تھا سوری اتنا اچھا افسانہ لکھنے پر مبارکباد تو بنتی ہے۔ آپ میری پسندیدہ ہستیوں میں سے ایک ہو۔ میں دوشیزہ آٹھویں کلاس سے پڑھ رہی ہوں یعنی کہ بے حد پرانی پڑھنے والیوں میں سے ہوں کیونکہ اس کے افسانے اور ناول بے حد معیاری ہوتے ہیں۔ اس مرتبہ بھی ایک سے بڑھ کر ایک تحریریں ہیں۔ لمحوں نے خطا کی تھی۔ پڑھ کر بے حد مزہ آیا۔ اُم مریم کا مکمل ناول کیا بات ہے اُم مریم جی خوش رہو۔ بے پروں کی تتلی، دام دل اور مہر النساء سب کے سب بہترین لگے۔ اور یہ رشتے اِک بار کہو، فریب انتخاب خاص میں قدرت اللہ شہاب تو ایک نامور رائیٹر ہیں۔ ان کی تو بات ہی اور ہے۔ بے حد بیمار ہوں بس اتنا ہی لکھا جا رہا ہے سب قارئین اور دوست میرے لیے دعا کریں۔ نسیم نیازی، زمر نعیم، رضوانہ کوثر، نزہت اینڈ نگہت غفار، فصیحہ آصف، عقیلہ حق، شمیم فضل خالق، اقبال بانو، اُم مریم، فاطمہ نذار ضوی اور سباس گل کو پرنس شہزادی رضوانہ جی اینڈ سوہنا منڈا کاشی کو بے حد سلام دعا اور پیار۔ اپنا ایڈیٹرا ور غزل تحفہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔

✉: فریدہ پیاری! ہم سب تمہاری صحت کے لیے دعا گو ہیں۔ تمہاری آمد ہمیں بے حد پسند ہے۔ تبصرہ مختصر مگر جامع تھا۔ اچھا لگا۔

✉: کراچی سے عقیلہ حق کی محفل میں آمد ہے لکھتی ہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ میں جو ریگولر تبصرہ لکھتی ہوں اور جو کبھی غائب ہو جاؤ تو کوئی یاد بھی نہیں کرتا کوئی پوچھتا بھی نہیں عقیلہ حق تم کہاں ہو؟ ہائے رے دنیا

والوں دل توڑ دیا۔
میں ملک سے باہر تھی۔ آپ کی زندگیوں میں تو تھی۔ یا وہاں سے بھی...... آہ...... کیا کروں اور کیا لکھوں۔ دوشیزہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ خوبصورت ٹائٹل لیکن میرے خیال سے...... کاشی کا اداریہ بہت زبردست رہا اور محفل میں رضوانہ چھائی رہیں ماشاء اللہ۔ زادراہ تو منورہ صاحبہ کے لیے بھی زادِ راہ ہی ثابت ہورہا ہے۔ عاصمہ جہانگیر کی باتیں اچھی لگیں۔ سلسلے وار ناول اچھے جارہے ہیں اور رفعت سراج صاحبہ کے خوبصورت جملے دل کو چھو لیتے ہیں۔ ARY کے پروگرامز پر کیا تبصرہ کروں، میں ٹی وی بالکل نہیں دیکھتی اور یہ تو مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ کامیابی لائف بوائے کے ساتھ کی وجہ سے ملتی ہے۔ (ہا...... ہا...... ہا) اندر کا انسان رضیہ مہدی کی مناسب تحریر رہی۔ محبت بجھتی نہیں بس ایک مناسب تحریر رہی۔ چاند تک اچھا افسانہ تھا۔ زندگی اسی کا نام ہے اپنے لیے کچھ، دوسروں کے لیے کچھ۔ سنبل سزا کے ساتھ آئیں ہمیشہ کی طرح باکمال تحریر۔ ویلڈن سنبل۔ ویسے کیسی ہیں آپ؟ اک بار کہو ایک اچھی اور ہلکی پھلکی تحریر تھی۔ تسنیم منیر علوی کی تحریر بہترین رہی یہ صحیح ہے۔ لوگ چہروں پر ماسک سجائے رکھتے ہیں۔ چہروں پر کچھ اور دل میں کچھ اور ہو۔ زندگی ایسے لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ مفاد پرست اور جھوٹے لوگ، بہترین تحریر۔ خولہ عرفان کی تحریر فریب اچھا موضوع رہی۔ زندگی میں بہت سارے ایسے لوگ ملتے ہیں جن کے سلوک، رویے اور کاٹ ہمیں بلندیوں پر لے جاتے ہیں؟ ہمیں ان سے ناراض ہونے کے بجائے ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ زنگ کائنات پڑھا بہت انجوائے کیا اور صدر ایمپریس مارکیٹ کا نقشہ آنکھوں میں گھوم گیا۔ نئے لہجے اور نئی آوازیں میں شاعری اچھی رہی۔ لیکن راحت وفا کی نظم بہت زبردست رہی۔ باقی افسانوں پر تبصرہ اُدھار ہے میں پڑھ نہیں سکی۔ دوشیزہ کا گلستان، گلستان ہی لگتا ہے۔ اور سوال جواب بے حد چٹ پٹے۔ انتخاب خاص، خاص ہی رہا۔ مختصر یہ کہ ڈائجسٹ ایک مکمل ڈائجسٹ رہا۔ تلاش کے باوجود کہیں کوئی کمی نظر نہیں آسکی۔ اللہ اور ترقی دے۔ لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ رضوانہ اور کاشی کے ساتھ ساتھ ہر شخص بھی اپنی ذمہ داری احسن طریقے سے پوری کررہا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرید کامیابیوں سے ہمکنار کرے۔ گوکہ پورا رسالہ نہیں پڑھ سکی لیکن پھر بھی ٹوٹا پھوٹا سا تبصرہ کرنے کی جسارت کر بیٹھی ہوں۔

ﻬ: عقیلہ پیاری! ہم تو تمہیں یاد کرتے ہیں۔ یہ تم نے کیا لکھا۔ یہ چھوا اپنے سیل فون سے۔ تبصرہ پڑھ کر مزہ آیا۔

✉: روبینہ شاہین کراچی سے محفل کا حصہ بن رہی ہیں لکھتی ہیں آپ سب کے لیے بے شمار نیک خواہشات اور دعائیں اس ماہ کا شمارہ ماہ اگست کا ہے جبکہ آزادی کے رنگوں سے سجا ہوا ہے۔ سرورق بھی جاذب نگاہ ہے۔ ابتدائیہ ''ہیٹ اسٹروک'' کاشی برادر کی متاثر کن تخلیق ہے جوکہ عام لوگوں کا ترجمان ہے۔ زادراہ میں ہماری زندگی ایمان اور انسانیت کی روشنی سے منور کرنے کا سلسلہ ہے۔ دوشیزہ کی محفل میں بھی خوب رونق ہے۔ اور یہی محفل، اس کی اپنائیت دوشیزہ کی پہچان ہے۔ ناول دامِ دل کی قسط بہت دلچسپ اور پرلطف ہے مہر النساء بھی مکمل ناول ہے، اگرچہ طویل ہے خاص طور پر ناول بہت کم پڑھتی ہوں لیکن اس دفعہ یہ ناول لطف دے گیا۔ رضیہ مہدی کا اندر کا انسان ایک معاشرتی سچائی ہے لیکن ہمارے یہاں سے ایسے اندر کے انسان کو بڑی بے دردی سے قتل کیا جاتا ہے۔ چاند تک بہت حساس رومینٹک کہانی

ہے یہ رشتے، جیتنے کے شوق میں ہارنے والی عورت کی کہانی ہے۔ سچ ہے جو بیویاں شوہروں کو مجبور اور محصور کر کے رکھتی ہیں ان کا برا انجام ان کی اولاد کے ہاتھوں لکھا ہوتا ہے۔ 'ایک بار کہو' فریب اچھی کہانیاں ہیں لیکن سزا اور محبت بجھتی نہیں بہترین کہانیاں ہیں انتخابِ خاص نہایت عمدہ اور شاندار ہے۔ دوشیزہ میگزین بھی بہت عمدگی سے پیش کیا گیا۔ یہ ہوئی نا بات بہت اچھا رہا، مسکراہٹیں اس میں بکھرنے لگی ہیں۔ ملاقات کا سلسلہ بھی خوبصورت ہے۔ آپ سب کے تحفظ کی دعائیں اب اجازت۔

ھ: روبینہ! مختصر مگر کمال تبصرہ کیا مزہ آ گیا۔ تمہاری تحریر بھی بہت جلد دوشیزہ کا حصہ ہوگی۔

✉: شادی وال، گجرات سے عائشہ نور عاشا محفل کا حصہ بن رہی ہیں لکھتی ہیں۔ پہلی بار شرکت کر رہی ہوں اور اُمید ہے خوش دلی سے ویلکم کیا جائے گا اور بنا جسارت کے کچھ شاعری بھی بھیج رہی ہوں۔ پلیز نظر ثانی کریں اور شکریہ کا موقع دیں۔ اس کے علاوہ مجھے اجازت چاہیے کہ کیا میں چھوٹے چھوٹے افسانے لکھ کر بھیج سکتی ہوں۔ دوشیزہ ڈائجسٹ کے تمام رائٹر اور شاعر بہت زبردست ہیں جناب اس لیے تو میں دوشیزہ کو ڈھونڈ کر یہاں اس محفل میں چلی آئی۔ کیونکہ میں بھی ایک اچھی رائیٹر اور شاعرہ بننا چاہتی ہوں۔ پلیز میری راہنمائی کریں۔ لگتا ہے کچھ لوگ بور ہو رہے ہیں اس لیے اجازت چاہوں گی اللہ دوشیزہ کو ہمیشہ کامیابیوں سے ہمکنار رکھے آمین۔

ھ: اچھی لڑکی! لوگ بور کب ہو رہے ہیں ویلکم کر رہے ہیں۔ تبصرہ کہاں ہے دوشیزہ پر۔ اگلے ماہ تبصرے کا انتظار رہے گا اپنی تحریر فوراً بھجواؤ۔

✉: کراچی سے خولہ عرفان محفل میں حاضر ہیں لکھتی ہیں۔ پرنسز آپ کے اندازِ تخاطب سے معلوم ہو گیا کہ میری آپ سے وابستہ امیدیں اور خواہشات بار آور ہو چکی ہیں آپ بفضلِ تعالیٰ بخیر و عافیت اور خوش خرم ہیں۔ محفل کے ابتدائیہ میں آپ نے جولندن کی فضاؤں کی تصویر کشی کی ہے اس کو پڑھ کر بے اختیار دل سے اٹھنے والی دعا کو ذہن نے لفظوں کی صورت رقم کر لیا کہ

پردیس سے تم یہ لکھتے ہو ☆☆ تم بے فکری سے ہنستے ہو
تمہیں نیند سکون سے آتی ہے ☆☆ بے خوفی سے بھی رہتے ہو
یہ رب سے دعا ہے آج میری ☆☆ اے کاش کہ خط اک ایسا ہی
میں اپنے وطن سے بھی تم کو ☆☆ آمین کہو ! تحریر کروں

اگرچہ مسافتیں بلا کی ہیں مگر ٹیکنالوجی نے ان فاصلوں کو سمیٹ لیا ہے پھر بھی اپنے ملک کی فضاؤں میں واپس بخیر و عافیت اب دوشیزہ کی طرف آتی ہوں۔ ماہِ اگست کا دوشیزہ ہمیشہ کی طرح بہت شاندار لگا۔ کاشی چوہان کا اداریہ اپنے اچھوتے اندازِ بیان کے ساتھ پھر چونکا گیا اور اپنی حقیقت اس طرح ذہن و دل میں اتار گیا جس سے کسی صورت انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ساتھ ساتھ رضوانہ اس قدردانی کا بہت بہت شکریہ کہ جن محبتوں کے ساتھ آپ نے میرے افسانے کو دوشیزہ میں اشاعت ہونے کا اعزاز بخشا ہے۔ اب کے تمام افسانے مختلف موضوعات کے ساتھ ذرا ہٹ کر تھے۔ رضیہ مہدی صاحبہ کا اندر کا انسان بہت اچھی تحریر تھی۔ صدف آصف کا چاند تک جملوں، کرداروں اور ان کے ناموں کے انتخاب کے لحاظ

دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

اگست 2015 کا نتیجہ، قارئین نے مندرجہ ذیل تحریر کو پسند کیا ہے

''بے پروں کی تتلی'' تسنیم منیر علوی

آپ کی نظر میں اس ماہ ''دوشیزہ'' کی بہترین تحریر کون سی ہے؟

دوشیزہ | ستمبر 2015

عنوان: ____________________

قلم کار: ____________________

نام: ____________________

پتا: ____________________

ماہنامہ دوشیزہ کراچی

سے بھی خوب تھا۔ انداز بیان بھی عام فہم اور جاندار تھا۔ سنبل کی تحریر سزا بہترین سزا لگی۔ نوید جیسا دوست اور شہر جیسے باپ بہت کم ہوتے ہیں اور اس پر ایسی سزا دینے کی ہمت بہت کم لوگ دکھاتے ہیں۔ روزینہ حنیف کی تحریر محبت بجھتی نہیں ہے، نیئر شفقت کا یہ رشتے، ہماراؤ کا ایک بار کہو سب بہت خوبصورت تحریریں تھیں۔ مہر النساء میں نفیسہ سعید کا قلم کہانی کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتا نظر آیا۔ جملوں کا ٹھہراؤ اور ماحول کی بہت خوبصورت عکاسی کی۔ تسنیم منیر علوی نے تو بے پروں کی تتلی میں کمال ہی کر دیا۔ تحریر کے کیا کیا رنگ دکھائے ہیں۔ ہر جملے کے ساتھ تاریخ کے جھرکوں میں خود کو اسی زمانے میں محسوس کر رہی تھی قدرت اللہ شہاب کی تحریر ماسٹر نثار ہمیشہ کی طرح دل کو چھوگئی۔ اپنی تحریر پڑھ کر بہت خوشی ہوئی لیکن اس پر تبصرہ کوئی اور کرے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ لمحوں نے خطا کی تھی تھوڑا سا رُکا ہوا لگا۔ لیکن دلچسپی ہنوز برقرار ہے۔ اُم مریم کا رحمٰن رحیم سدا سائیں! بینا عالیہ کا تیرے عشق نچایا مکمل جذبات نگاری اور جملوں کی بے ساختگی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ اور رفعت سراج کا دام دل خود ہمارے دل کو اپنے دام میں کیے ہوا ہے۔ دوشیزہ میگزین کے تمام عنوانات بہت عمدہ ہیں۔ نئے لہجے اور نئی آوازوں کی خوبصورت کاوشیں قابل تحسین ہیں اور زین العابدین کے جوابات بہت عمدہ۔ پورے خلوص اور محبت کے ساتھ آپ کی، کاشی چوہان صاحب کی اور دوشیزہ واہلیانِ دوشیزہ کی ترقی کے لیے دعا گو۔

ﷲ: اچھی لڑکی! تبصرہ بہت اچھا لگا تمہارا۔ اور تمہاری نظم نے ہمیں بہت محظوظ کیا۔

✉: منعم اصغر ڈیزہ غازی خان سے محفل میں شریک ہیں۔ لکھتے ہیں میں دوشیزہ کی محفل میں دوبارہ حاضر ہوا ہوں۔ جس کی وجہ آپ لوگوں کی حوصلہ افزائی ہے۔ میرا پہلا خط شائع کرنے کا ڈھیروں شکریہ۔ سچی کہانیاں اور دوشیزہ کی ایک بات مجھے بڑی ہی اچھی لگتی ہے کہ آپ نئے اور پرانے دونوں لکھاری و قاری کو برابر کا پیار دیتے ہیں۔ قارئین کا دل جیت لیتے ہیں اور ہم سب کی دعائیں ہمیشہ آپ لوگوں کے ساتھ رہیں گی۔ اب تبصرہ ہو جائے دوشیزہ کی کہانیوں پر۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ لندن میں ہیں، بہت بہت مبارک۔ اس بار دوشیزہ کا ٹائٹل بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ سب سے پہلے تو دام دل پڑھا۔ اس بار کی قسط بھی جاندار تھی۔ رفعت سراج کی تعریف کرنا تو سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ رحمٰن، رحیم، سدا سائیں بہت دلچسپ ناول ہے، جو مجھے بہت پسند آ رہا ہے۔ مکمل ناول میں اس بار مہر النساء شامل تھا۔ رائٹر کا نام دیکھ کر ہی مسکراہٹ لبوں کو چھوگئی۔ نفیسہ سعید میری پسندیدہ رائٹر ہیں۔ ان کی تحریریں مجھے بہت پسند آتی ہیں مہر النساء جیسا خوبصورت ناول لکھنے کے بعد بھی دوشیزہ کے لیے لکھتی رہیے گا۔ ناولٹ میں لمحوں نے خطا کی تھی اور بے پروں کی تتلی تسنیم منیر علوی کی خوبصورت تحریر دل کو چھوگئی۔ بہت خوب مبارک باد۔ اور افسانے تو اس بار ماشاء اللہ سات تھے۔ اندر کا انسان، چاند تک۔ یہ رشے، فریب، ایک بار کہو، سزا، محبت بجھتی نہیں، ہائے میں کس کس کی تعریف کروں۔ اتنا ہی کہوں گا کہ ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ ہمیشہ کی طرح اس بار کا رسالہ بیسٹ اینڈ بیسٹ تھا۔ کہیں کوئی کمی خامی نظر نہیں آئی۔

ﷲ: منعم اصغر! محفل میں دوبارہ آمد پر خوشی ہوئی۔ اچھی تحریر اپنی جگہ آپ بنا لیتی ہے۔ بے فکر رہو۔

✉: محفل میں مسز نوید ہاشمی کی نارتھ ناظم آباد کراچی سے لکھتی ہیں۔ عید اور 14 اگست آپ لوگوں نے

بہت دھوم دھام سے منائی ہوگی اپنوں کے ساتھ ہماری نس ملدی، پیاری سی رضوانہ پرنس بھی اپنوں کے پاس گئی ہیں۔اور ہمارے اپنے لندن سے واپس پاکستان آ گئے تو ہماری عید بھی خوبصورت ہوگئی تھی۔میرے سسر والد اور ساس مانچسٹر میں رہتے ہیں۔میرے نوید ہاشمی لیور پول میں، میرے جیٹھ لندن میں، میرے دیور بھی لندن سے پاکستان آ گئے تو عید کا لطف دوبالا ہوگیا۔کاشی چوہان میرے بھائی اس عید پر ہم نے محبت کی تلاش کر لی تھی۔اپنوں کے گلے لگ کر عید منانے کا مزہ ہی اور ہے۔دوشیزہ کی محفل میں رضوانہ پرنس محفل سجائے بیٹھی ہیں۔وہاں آکر مجھے بہت مزہ آتا ہے۔سب کی پیاری پیاری میٹھی میٹھی باتیں بہت مزہ دیتی ہیں۔شکر کے مریض بھی اس محفل میں آ کر دیکھیں آپ کو بھی یہ مٹھاس محسوس ہوگی۔نیلم اسلم، عقیلہ حق، نگہت غفار، رُخ چوہدری، زمر نعیم، خولہ، شگفتہ، تمثیلہ کیسی ہو تم۔ریحانہ، انزاء معصومہ رضا، ماہین، افشاں، ندیا مسعود، یاسمیں اقبال، ثمینہ عرفان، راحت وفا، نفیسہ سعید، فصیحہ آصف، سحر فاطمہ، رضوانہ کوثر آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔ خدا آپ کو صحت عطا فرمائے۔جیسے میرے دوست دوشیزہ کی محفل میں شامل ہیں سب کو عید اور 14 اگست کی بہت بہت مبارک باد قبول ہو۔دوشیزہ جولائی کا عید نمبر پڑھ کر مزہ آ گیا۔عید ختم ہوگئی مگر دوشیزہ کی صورت میں ہم بار بار کہانی پڑھ کر عید مناتے رہے۔سب کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔پھول جیسے رشتے اللہ میاں جی، ساجن سنگ عید، چاند عید اور ہم، عید کا چاند دریچے میں، عید سرپرائز اس ماہ کی خوبصورت کہانیاں تھیں۔رفعت سراج اور بینا عالیہ سلسلہ وار ناول شاندار جا رہا ہے۔اُم مریم آپ چھا گئی ہو۔پھر اسماء اعوان، زین العابدین، نادیہ طارق، ڈاکٹر خرم مشیر کی وجہ سے دوشیزہ میں چار چاند لگ گئے ہیں۔

ﻬ: مسز نوید ہاشمی! آپ کا تبصرہ بہت اچھا لگا۔اور آپ کے خط میں موجود اپنا پن ہمارے لیے سب سے بڑا گفٹ ہوتا ہے۔

✉: کراچی سے ہماری بہت پیاری لکھاری ساتھی نگہت اعظمی کی محفل میں بڑے دنوں بعد آمد ہوئی ہے عرض کرتی ہیں۔اُمید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔بہت دنوں بعد افسانہ لے کر آئی ہوں۔ لیکن خدا کے لیے زیادہ انتظار نہ کرانا۔پچھلی دفعہ جو افسانہ بھیجا اُسے چھپنے میں کئی ماہ لگ گئے۔تم خود رائٹر ہو سمجھ سکتی ہو۔کتنی کوفت ہوتی ہے۔اگست کا دوشیزہ پورا پڑھا، رفعت سراج کا ناول بہت اچھا لگ رہا ہے۔سب سے پہلے پڑھتی ہوں۔پھر رضیہ مہدی، سنبل، تسنیم منیر، غزالہ عزیز، کے افسانے پسند آئے۔پڑھے تو سب افسانے ہیں لیکن رائٹر کے نام ذہن میں نہیں آ رہے ہاں ایک بات خاص طور پر کہنی ہے۔افسانوں کا معیار بہت بہتر ہو رہا ہے۔پرانی رائٹر کو آواز دو۔شائستہ عزیز سے کہنا ہے کہ میرا پرانا فون کھو گیا ہے۔جس میں سب کے نمبر تھے۔جو نمبر ڈائری میں ہیں اس پر کوئی فون نہیں اٹھاتا سیما مناف بہت مصروف ہیں۔اُسے ڈسٹرب کرنا اچھا نہیں لگتا۔بہر حال تم سب چاہے وہ فرزانہ آغا ہو، شائستہ عزیز ہو، صبیحہ شاہ ہو، زمر نعیم ہو، نسیم نیازی ہوں فرح اسلم ہو، رضوانہ کوثر ہو رضیہ مہدی، غزالہ عزیز، سیما رضا، سیما بنتِ عاصم اور ساری رائٹر کریں نہ کریں میں انہیں ہر لمحہ یاد کرتی ہوں اور ہمیشہ ان کی تحریروں کی منتظر رہتی ہوں۔ان سب کو جمع کرو اور دوبارہ سے دوشیزہ کو ان کی تحریروں سے چار چاند لگاؤ۔ادارے میں سب کو بہت بہت سلام اور دعائیں۔

ھ: نگہت تمہارا محفل میں آنا ہمیں بہت اچھا لگا۔ انشاء اللہ ہم پھر سب کو جمع کریں گے۔

✉: کراچی سے ہماری مستقل قاری اور شاعرہ ثمینہ عرفان محفل میں حاضر ہیں لکھتی ہیں۔ ماہ اگست کا دوشیزہ کا شمارہ پڑھ کر پتا چلا کے آپ ''لندن'' میں ہیں پھر آپ نے لندن کے بارے میں بہت کچھ لکھا۔ جو یہاں ہے وہاں یعنی لندن میں نہیں ہے اور آپ کا دورہ بہت اچھا گزر رہا ہے۔ یہ ساری باتیں کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ ہمارے اسلام کی بہت سی باتیں ان لوگوں نے چرا کر اپنالی ہیں۔ یہاں بحیثیت مسلمان آپ کو اپنا دل وسیع کرنا چاہیے انہوں نے اختیار کرلی ہیں یا اپنالی ہیں۔ میں خط میں مزید کچھ لکھوں ایک شعر لکھنا چاہوں گی۔

اثر کرے نہ کرے میں کہوں گا اپنی بات ☆☆ نہیں ہوں داد کا طالب، ہوں میں بندہ آزاد

اندر کا انسان محترمہ رضیہ مہدی صاحبہ کا افسانہ شروع کچھ اور طرح ہوا اور اختتام؟ شاید ہم سمجھ نہ سکے۔ روزینہ حنیف محبت بجھتی نہیں کبھی، وقت پر صحیح فیصلہ نہ کرنے والے، اپنے فضول قسم کے فلسفوں کے شکار لوگ شر میں ہی کی طرح ساری زندگی بے لوث محبت رفاقت کو ترستے ہیں۔ سنبل کا افسانہ سزا، آخر میں پوچھا گیا جو صائمہ کو دی گئی سزا اس کے متعلق کہیں یہ سزا زیادہ تو نہیں ہوگئی۔ شہرام صاحب نے اپنی اولاد کے مفاد کے پیش نظر دوسری بیوی کو سزا دینے کے لیے تیسری شادی کی۔ ایک بانجھ سے لیکن اگر تیسری بانجھ نہ ہوتی تو سزا کا سلسلہ کہاں پر ختم ہوتا۔ ہمارا ڈاک بار کہو، ایک مخصوص انداز میں لکھا ہوا افسانہ۔ ماں مرگئی، روایتی سوتیلی ماں کا مخصوص انداز اور سلوک اور پھر ایک ہمدرد کا آجانا اور بات شادی پر ختم۔ خولہ عرفان کا افسانہ فریب اچھا تھا۔ خاندان میں ممانی جیسے لوگوں کو چٹکی لینے والا کوئی ایک تو ضرور ہونا چاہیے۔ چٹکی نہیں بلکہ آئینہ دکھانے والا۔ عورت کی زندگی کی انتہائی تلخ حقیقت سے جڑا نیئر شفقت کا افسانہ ''رشتے'' اچھا تھا۔ مہر النساء، نفیسہ سعید آپ سے معذرت کے ساتھ ہمارے بالوں میں بھی چاندی جھلملانے لگی ہے۔ ہم نے ہمیشہ 'رکشا' ہی کیا ہے اور سنا ہے۔ پاکستان میں رکشا کب سے آٹو ہوگیا۔ کچھ کچھ یوم پاکستان یا قیام پاکستان کی کتھا لیے ہوئے تسنیم منیر کا ناولٹ، بے پروں کی تتلی پڑھنے کو ملا بہت اچھا افسانہ تھا۔ مفاد پرستوں کا یہ ٹولہ آج بھی ہمارے ملک میں سرگرداں ہے۔ زین العابدین کا کالم پڑھ کر طبیعت میں تھوڑی سی بشاشت آئی۔ منعم اصغر کا میرے خط پر پسندیدگی کا اظہار اچھا لگا۔ آپ نے گذشتہ محفل میں میرے جواب میں لکھا تھا اگلا تبصرہ مکمل پرچے پر کرنا ہے آپ نے۔ تو جناب آپ کے حکم کے مطابق اس دفعہ کافی حد تک تبصرہ پرچے کے مضامین پر ہے، اب دیکھنا ہے کہ یہ تبصرہ کس حد تک پرچے میں جگہ پائے گا۔ آپ جیسے محبت کرنے والے اور مثبت تنقید سننے والوں کی محبت کی وجہ سے ہماری زبان کچھ زیادہ ہی دراز ہوگئی اور قلم بے قابو۔ ہماری تحریر سے آپ کی یا ادارے کی کوئی دل آزاری ہوئی ہو تو مجھے دل سے معاف کیجیے گا۔

ہم نہ کہتے تھے کہ حالی چپ رہو ☆☆ راست گوئی میں ہے رسوائی بہت

ھ: لیجیے ثمینہ! ہم نے آپ کو رسوائی سے بچالیا۔ تبصرہ اچھا تھا۔ آپ کا ہر شکوہ ہم نے سنا۔ آپ کا حق ہے مگر کچھ چیزیں پالیسی میں آجاتی ہیں ورنہ آپ کا مکمل تبصرہ شائع کرتے۔

✉: اس شعر کے ساتھ محفل میں بڑے دنوں بعد ہماری پروفیسر صفیہ سلطانہ مغل صاحبہ جیکب آباد سے محفل کا حصہ بن رہی ہیں لکھتی ہیں۔

کسی کا پیار کسی کی دعا ضروری ہے ☆☆ دیار حبس میں تازہ ہوا ضروری ہے
اُمید ہے آپ دیارِ غیر میں خوش و خرم ہوں گی۔ دامِ دل کی کہانی گو کہ عام گھروں کی کہانیاں ہیں لیکن ہمارے معاشرتی رویے کی بدصورتیوں کا احساس اجاگر ہوا ہے۔ یہ کہانی تو ہر دوسرے گھر کی ہے۔ کہانی کا ٹھہراؤ، اور رشتوں کا الاؤ اس ناول کی جان ہے۔ رفعت سراج، سکہ بند ناولسٹ ہیں۔ بہت عمدہ لکھتی ہیں۔ رضیہ مہدی کا افسانہ، اندر کا انسان بہت دیر بعد زندہ ہوا، اچھا موضوع تھا۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ☆☆ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
روزینہ حنیف کا افسانہ بہت ہی عمدہ تھا۔ مگر عنوان اچھا نہیں لگا۔ کیونکہ کہ اُسے اُس سے پھر بھی محبت نہ ہو سکی۔ بہر حال اچھی کاوش تھی بہت اچھی......

محبت مار دیتی ہے ☆☆ محبت مر نہیں سکتی
صدف آصف کا تحفہ بھی عید پر اچھا رہا۔ چاند سے چاند تک عام سی کہانی کو افسانے کا رنگ دے کر صدف نے موضوع سے انصاف کیا ہے۔ ام مریم کا ناول رحمٰن، رحیم، سدا سائیں ہر قسط میں اک نیا موڑ، تجسس اور تنوع اس ناول کا خاصہ ہیں۔ مریم جی بہت مبارک ہو۔ آپ کی تحریروں میں اصلاح کا پہلو ہمیشہ نمایاں رہتا ہے۔ بھئی بہت خوب! تلوار کا کام آپ قلم سے لیتی ہیں۔ بہت خوب نام بھی کرداروں کے بے حد منفرد اور بامعنی ہیں۔

کتنا نازک ہے وہ پری پیکر ☆☆ جس کا جگنو سے ہاتھ جل جائے
سنبل ایک منجھی ہوئی رائٹر ہیں ان سے ایسی ہی توقع تھی۔ سوتیلے رشتوں سے جڑا یہ افسانہ ان ماؤں کے لیے مشعل راہ ہے جو ان رشتوں کا اعزاز کھو بیٹھتی ہیں۔

کسی کے جو رو ستم یاد بھی نہیں کرتا ☆☆ عجیب شہر ہے فریاد بھی نہیں کرتا
تسنیم منیر علوی کی 'بے پروں کی تتلی' بھی اچھی تحریر ہے۔ ماضی کی عہد گمشدہ کی غلام گردشوں میں سفر کرتی یہ کہانی ایک نیا رنگ اور اک عمدہ امنگ لیے ہوئے سیدھی دل پہ اثر کر گئی۔

چاہتے دونوں بہت ہیں ایک دوسرے کو مگر ☆☆ یہ حقیقت مانتا تو بھی نہیں میں بھی نہیں
خولہ عرفان کا فریب در فریب بھی دل فریب تھا۔ کیا کیا فریب دل کو دیے اضطراب میں
فوزیہ رانا یار تم نے فون نہیں کیا۔ بہر حال لمحوں نے خطا کی تھی ہم نے کیا خطا کی تھی صدیوں کی سزا دے دی۔ مگر اتنے اچھے ناول پر جاؤ تمہیں معاف کیا۔ بہت پیارا ناول ہے۔ یہی کردار ہمارے آس پاس بھی موجود ہیں۔ جن کے خوبصورت رویے معاشرے اور خاندان میں بگاڑ پیدا کرنے کا موجب ہیں۔ بینا عالیہ کے ناول کی جتنی تعریف و توصیف کی جائے کم ہے۔ باقی تمام سلسلے بھی بہت عمدہ ہیں۔ کس کس کی تعریف کروں آپ دونوں کی اور جملہ ارکان کی کاوشیں بارآور ثابت ہو رہی ہیں ادارے کے تمام کارکن قابل تعریف اور قابلِ تحسین ہیں اجازت دیں۔

ھ: صفیہ پیاری! تم محفل میں آئیں تو لگا دنیا نے ہی کروٹ بدل لی۔ تبصرہ ہمیشہ کی طرح زبردست رہا۔

✉: صائمہ بشیر پہلی بار سرگودھا سے محفل میں ہمارے ساتھ ہیں لکھتی ہیں۔ پہلی بار دوشیزہ میں حاضر ہو رہی ہوں دوشیزہ کو بہت سالوں سے پڑھ رہی ہوں لیکن اس میں خط لکھنے کا یہ پہلا تجربہ ہے۔ کاشی کا

ہیٹ اسٹروک بہت ہی اچھا تھا۔ کاش ہم جان سکیں کے یہ دنیا اور اس کا نیلا شفاف آسمان خدا نے یہ سب ہمارے لیے بنایا ہے لیکن ہم نے اس چمکیلے آسمان کو کالے دھوئیں سے اتنا بھر دیا ہے کہ اللہ کی دی ہوئی ی نعمت اب ہم سے ہماری محبت اور زندگیوں کا خراج مانگ رہی ہے۔ باقی پرچہ ابھی پڑھ نہیں سکی۔ ممتاز کی کاوش غزل کی صورت میں اچھی تھی۔ اپنی غزل دیکھ کر بے تحاشا خوشی ہوئی آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ ہماری حوصلہ افزائی کرتے ہو تو ہماری جرأت اور بڑھ جاتی ہے۔ سب لکھنے والوں کو صائمہ آپی کا بہت بہت پیار اور سلام۔

ج: اچھی صائمہ! آپ سب کا حوصلہ افزائی کرنا ہمارا فرض ہے۔ تبصرہ کیوں نہیں کیا مکمل پرچے پر آپ نے؟؟

✉: بھٹ شاہ سے سیدہ کاظمی پہلی بار محفل کا حصہ بن رہی ہیں لکھتی ہیں۔ کیسے مزاج ہیں آپ کے۔ اُمید ہے بخیریت ہوں گے۔ باجی میں نے اپنی تین کہانیاں ارسال کی تھیں ان کے بارے میں پوچھنا تھا۔ پتا نہیں آپ تک پہنچی ہیں یا نہیں۔ اور دوسری بات یہ کہ میں سچی کہانیاں کی سالانہ خریدار بننا چاہتی ہوں۔ اس کا طریقہ بتا دیں کیونکہ مجھے ہر ماہ یہ رسالہ ملنے میں دشواری ہوتی ہے۔ اور کبھی مل بھی نہیں پاتا۔ میں چاہتی ہوں مجھے یہ ہر ماہ گھر بیٹھے ملے۔ بنا کسی دشواری کے۔

ایک بات اور رسالے میں نئے نئے تجربات سے بھی تبدیلیاں آتی ہیں جس سے رسالے کی اشاعت میں بڑا فرق پڑتا ہے۔

ج: اچھی بہن! سیدہ کاظمی بہت جلد تمہاری کہانیوں پر رائے دیں گے۔ سالانہ خریدار بننے کے لیے 890 روپے کا منی آرڈر بنام دوشیزہ ارسال کردو۔ ہر ماہ گھر بیٹھے پرچہ آپ کے ہاتھ میں ہوگا۔

✉: کراچی سے یہ آمد ہے ہماری بہت شگفتہ، بہت شفیق سی شگفتہ شفیق کی، لکھتی ہیں پیاری رضوانہ دیکھ لیں کہ ہم نے تو آپ کا پیچھا لندن میں بھی نہیں چھوڑا اور آپ سے لندن جا کر مل آئے۔ سب دوست پریشان ہو رہے ہوں گے کہ یہ کیا کوڈ ورڈز میں باتیں ہو رہی ہیں۔ تو بات یہ ہے میرے پیارے احباب کہ کنزل کی رخصتی کے بعد دل کا عجب عالم تھا کہ بہت اداس تھا کہیں نہیں لگ رہا تھا۔ میرا تو کھانا پینا تک چھوٹ گیا تھا۔ تو اُس کا ہم نے حل یہ نکالا کہ لندن جا کر بیٹی داماد سے مل آیا جائے۔ سو ایک شام ہم نے اعلان کر دیا کہ میرا ٹکٹ کنفرم کرا دیں کہ میں چاہے دو دن کے لیے ہو جانا چاہتی تھی۔ یوں اگلے دن کی فلائٹ سے ہم لندن چل دیے۔ اور کنزل۔ تابش کے ساتھ ساتھ بہت سارے پیارے لوگوں سے جن میں رضوانہ پرنس، رخسانہ بھابی،، شاہین بھائی ...... سرفہرست ہیں سے مل آئے۔ وہ خوبصورت دن اپنی حسین یادوں کے ساتھ میری یادداشت میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگیا ہے۔ شاہین بھائی کی دلچسپ گفتگو نے اچھی طرح بتا دیا کہ رضوانہ کی پوری فیملی ہی بے حد پرخلوص اور زندہ دل ہے۔ اُس دن اتنا ہم لوگ ہنسے ہیں کہ حد نہیں۔ تابش اور کنزل نے بھی بہت سب کو انجوائے کیا اور ہمارے مہمانوں کی حتی الامکان خاطر تواضع کی اور مہمانوں کے جانے کے بعد اُن کی بہت تعریفیں کیں۔ ہم الگ سے اس دن کا احوال لکھیں گے۔ ابھی تو ہم واپس آ کر اس قدر مصروف ہوگئے ہیں۔ سعدیہ سیٹھی بھی بہت دور نا ٹنگھم سے ملنے آئی تھیں۔ اُن کی دوست ہما اشرف بھی بے حد پرخلوص خاتون تھیں جن سے مل کر ہم تو خوش ہوگئے۔ بہت انجوائے کیا تھا ہم نے اُس دن بھی۔ کنزل تابش نے بہت خیال کیا۔ ماشاءاللہ بیٹی کو آباد اور گھر سنبھالتے دیکھ کر ہم اب اطمینان سے ہیں الحمدللہ، اللہ اُن کو سدا شاد رکھے۔ آمین۔ اب کچھ ہو جائے دوشیزہ کی بات

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کردینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آئیے اور اپنے بابا جی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم..... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

۔خوبصورت تحاریر سے سجا ہوا میگزین گھر آتے ہی ملا۔ جیسے ہی کھولا کاشی کے ہیٹ اسٹروک نے یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ میرا یہ پیارا بھائی سچ کہتا ہے کہ پودے لگائے جائیں کہ زندگی میں تازگی اور دلکشی آئے۔ کاشی نے ہمارے ایوارڈ کی تقریب کا احوال اتنی اچھی طرح لگایا تھا کہ بے شمار لوگوں نے ٹیلیفون پر پھر سے مبارکباد یں دیں۔ آپ سب پیارے احباب کی ممنون ہوں اور مقروض بھی۔ تسنیم منیر علوی کا ناولٹ بے پروں کی تتلی اور رضیہ مہدی کا افسانہ اندر کا انسان بہت پسند آئے۔ سنبل کا افسانہ سزا بہترین لگا۔ انتخاب خاص بہت اچھا تھا۔ میری غزل لگانے پر ممنون ہوں۔ بہت خوش رہو۔ ہماری پیاری منزہ کو بہت سلام دعا۔ اور سارے احباب کو بہت سلام

ھ: شگفتہ سی شگفتہ! تمہاری محبت کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں بس تم ہنستی اچھی لگتی ہو۔ تبصرے کے لیے تمہاری ممنون ہوں۔

✉ محفل میں ملتان سے یہ آمد ہے فصیحہ آصف خان کی لکھتی ہیں۔ ہیٹ اسٹروک کا کالم جاندار الفاظ سے لبریز تھا۔ اللہ پاک اپنا کرم خاص کرے آمین۔ مال و دولت کے ضمن میں اسلامی مضمون کارآمد رہا۔ ''اونچی حویلی او نچے محل، پل بھر میں جائیں گے بنگلے بدل۔ بس جی سمجھے کوئی تو۔ کھٹی میٹھی باتوں کی محفل میں آکر تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ محترمہ فری صاحبہ آپ کا بے حد شکریہ۔ منعم اصغر آپ کا بھی شکریہ اور جن بہنوں نے میرا ناولٹ پسند کیا ان سب کا شکریہ اللہ ان کو بہت خوش رکھے۔ شگفتہ جی آپ کے لیے بے حد دعائیں اور رضوانہ آپی آپ کے لیے بھی۔ ایک محترمہ فرح عالم نے غالباً (ہری کالی اور لال مرچیں کھا کر خط لکھا ہے) انہیں عالیہ توانہ سے شکایت ہوئی۔ کچھ کے افسانے عام سے لگے۔ اور خاص طور پر میرا افسانہ عامیانہ سا۔ ذرا وضاحت تو کر دی جاتی۔ ویسے فرح ایسے چھوٹے چھوٹے خط لکھنے والوں کو بڑی بڑی باتیں نہیں کرنی چاہیں۔ اصلاحی تنقید ہو تو بات اور ہے۔ آپ بھی کوئی افسانہ لکھیں پھر ہم دیکھیں گے آپ کتنے پانی میں ہیں۔ محض تنقید کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ آئندہ احتیاط کیجیے گا۔ اور غصہ وافسوس اس بات پر بھی ہوا کہ آپ آئیں اور چھا گئیں۔ (فصیحہ فرح عالم نئی نہیں ہیں عرصہ دس سال سے تبصرے لکھ رہی ہیں) دام دل میں دلچسپی برقرار ہے، خاص طور پر رفعت سراج کے جملے جو موقع کی مناسبت سے زبردست لگے۔ بانو آپا کا کردار ہر دوسرے گھر کا کردار ہے۔ اندر کا انسان رضیہ مہدی کے مخصوص انداز کا افسانہ رہا۔ روزینہ حنیف بھی کامیاب رہیں۔ صدف آصف کا مسکراتا افسانہ دل کو بھایا۔ سزا پڑھ کر دل بہت افسردہ ہوا، جانے ان سوتیلی ماؤں کے دل میں پتھر کیوں فٹ ہوتے ہیں۔ ہماراؤ کا اک بار کہو بہت جاندار الفاظ میں لکھا گیا، دل کو چھو گیا۔ 'بے پروں کی تتلی، تاریخی انداز لیے ہوئے تھا اور ایک کامیاب تحریر رہی۔ فریب تو ایسے لگا کہ جیسے مثل مشہور ہے کہ دوسرے کی آنکھ کا تنکا نظر آجاتا ہے اور اپنی آنکھ میں لگا شہتیر بھی دکھائی نہیں دیتا۔ سبق آموز تحریر رہی۔ کھو کھلے رشتوں پر مبنی تحریر یہ رشتے احساس دلا گئی کہ سچا رشتہ صرف بندے اور رب کا ہے۔ ایک شعر یاد آ گیا۔

چند رشتوں کے کھلونے ہیں جو ہم کھیلتے ہیں ☆☆ ورنہ سب جانتے ہیں کون یہاں کس کا ہے

نفیسہ سعید کا ''مہر النسا'' مکمل ناول کی صورت میں اگست کے دوشیزہ میں بچ گیا۔ ماسٹر شار ''قدرت اللہ شہاب'' کے خزانوں سے ایک ہیرا چنا آپ نے۔ ہر ماہ ایک ادبی تحریر رسالے میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ باقی تمام سلسلے بھی اپنی مثال آپ تھے۔ اگر یہ کہیں گے تو کچھ غلط نہ ہوگا کہ دوشیزہ کا

معیار عروج کی بلندیوں کو چھو رہا ہے۔ کاشی بھائی کی ان تھک محنت سامنے آ رہی ہے۔ اللہ انہیں صحت و تندرستی کے ساتھ اس جذبے و ولولے کو قائم رکھے (آمین)۔

ط: پیاری فصیحہ! تبصرہ بہتر، انداز دلربا۔ ارے لڑکی کیوں ظلم کرتی ہو۔ تم بھی چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل سے نہ لگایا کرو۔ ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں۔

✉: کراچی سے نزہت جبیں ضیاء محفل میں شریک ہیں لکھتی ہیں۔ اگست کا دوشیزہ ملا۔ 'ہیٹ اسٹروک' کاشی کے قلم سے نکلی تلخ سچائی جو ہم سب کے لیے لمحہ فکریہ ہے ویل ڈن کاشی۔ پھر زادِ راہ زندگی سہل بنانے کی کامیاب کوشش کی شکل میں ہمارے سامنے تھا۔ بشرطیکہ اس سے فائدہ بھی اٹھایا جائے۔ ''دوشیزہ کی محفل میں ہمارے بہن بھائیوں کی خوبصورت باتیں پڑھنے کو ملیں۔ رضوانہ لندن میں بیٹھ کر جس طرح ہم لوگوں کے ساتھ ہیں وہ قابلِ تعریف ہے۔ سب سے پہلے تو شکریہ ادا کروں ان دوستوں کا جنھوں نے میرے ناولٹ عید سرپرائز کو تعریفی سند سے نوازا۔ صفیہ مغل بہت شکریہ۔ تم نے میری تحریر کو، منہاج کی شادی کے احوال کو پسند کیا۔ تمہیں بھی بیٹے کی شادی بہت بہت مبارک ہو۔ فریدہ فری، شگفتہ شفیق، شاہانہ احمد، رضوانہ کوثر، بے حد شکریہ میری تحریر کو پسند کرنے کا۔ پیاری فرح عالم تم نے بہت جامع اور بھرپور تبصرہ کیا۔ جس طرح تم نے گہرا مطالعہ کیا ہے میرے خیال میں ہر قاری کو اسی طرح تبصرہ کرنا چاہیے۔ میں اس بات کے لیے خاص طور پر تمہیں مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ تمہارا تبصرہ اور اس سے زیادہ تمہاری تنقید سر آنکھوں پر۔ ہم رائیٹرز کے لیے تم لوگوں کی تعریف اور تنقید ہمیں مزید ہمت و حوصلہ اور کوتاہیاں دور کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ تمہیں میرے ناولٹ میں عید کے رنگ نظر نہیں آئے۔ چلو ٹھیک ہے مگر 'عامیانہ پن' کیا ہے اور وہ کہاں کس طرح نظر آیا اس کی وضاحت کر دیتیں تو آگے محتاط رہنے کی وجہ مل جاتی۔ (برامت ماننا اپنی اصلاح کرنے کے لیے وضاحت مانگی ہے) اب آتی ہوں تحاریر کی جانب، تسنیم منیر علوی کا ناولٹ بے پروں کی تتلی بلاشبہ بہترین تحریر تھی۔ الفاظ کے چناؤ میں عمدہ مہارت تھی۔ اس کے علاوہ چاند تک، فریب، اور اندر کا انسان اچھے لگے۔ انتخاب خاص میں قدرت اللہ شہاب کی تحریر ''ماسٹر شار'' زبردست رہی۔ نئے لہجے نئی آوازیں میں راحت وفا، فریدہ جاوید فری اور علی حسنین تابش کے کلام پسند آئے۔ دیگر سلسلے بھی اچھے رہے۔ آخر میں آپ تمام لوگوں کے لیے دلی دعائیں۔ اللہ پاک تمام عازمین حج اور حج کی عبادتوں کو قبول فرمائے۔ اور ہم سب کو بھی حج کی سعادت نصیب فرمائے۔ (آمین ثم آمین)

ط: اچھی نزہت! فرح تک تمہارا پیغام پہنچایا جا چکا۔ تبصرہ کرنے کے بے حد شکریہ مگر ذرا جلد تبصرہ روانہ کیا کرو۔

آپ کی بے حساب محبتوں کے ساتھ اب ہم اس محفل کو اختتام پذیر کرتے ہیں...... آپ نے ہماری کاوشوں کو سراہا آپ کا شکریہ۔ اُمید کرتے ہیں آئندہ بھی آپ ہمارے ساتھ یونہی جڑے رہیں گے اور اپنی قیمتی آراء سے آگاہ کرتے رہیں گے۔ آپ کی محبتیں ہم پر قرض ہیں۔ کراچی آ کر فرداً فرداً ان تمام لوگوں سے رابطہ کریں گے جنھوں نے دوشیزہ کو پڑھا اور پسند کیا...... ان الفاظ کے ساتھ آپ سے اجازت چاہتے ہیں اور یہ شعر آپ کی نذر کرتے ہیں۔

خامشی بے حسی کو کہتے ہیں
حرف عرضِ ہنر تراشا کر

دعاؤں کی طالب
رضوانہ پرنس

سُن کے سے سوال

معروف ماڈل و اداکار

فہد مرزا

ذیشان فراز

☆ وہ نام جو شناخت کا باعث ہے؟
❤ : فہد مرزا۔
☆ گھر والے کیا کہہ کر پکارتے ہیں؟
❤ : فہد ہی کہتے ہیں۔
☆ وہ مقام جہاں سے آشنا ہو کر آنکھ کھولی؟
❤ : کراچی
☆ زندگی کس برج (star) کے زیر اثر ہے؟
❤ : ٹورس
☆ علم کی کتنی دولت کمائی؟
❤ : ایم بی بی ایس جنرل سرجری ٹریننگ مکمل کر کے پلاسٹک سرجری میں ٹریننگ کر رہا ہوں۔
☆ کتنے بھائی بہن ہیں۔ آپ کا نمبر؟
❤ : تین بہنیں ہیں۔ میرا دوسرا نمبر ہے۔
☆ برسر روزگار ہو کر پریکٹیکل لائف میں داخل ہو گئے؟
❤ : بالکل۔
☆ موجودہ کیریئر (مقام) سے مطمئن ہیں؟
❤ : ایک حد تک۔
☆ پروگرام کے لیے اپنی طبیعت اور مزاج کے برعکس موڈ بنانا ضروری ہوتا ہے؟
❤ : بالکل۔
☆ : اس زندگی میں کون سا کام سب سے مشکل ہے؟
❤ : سب کا خیال رکھنا۔
☆ : کوئی ایسی خواہش جو اب تک پوری نہ ہوئی ہو؟
❤ : نصیر الدین شاہ کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہوں۔
☆ : کون سی چیز کی کمی آپ آج خود میں محسوس کرتے ہیں؟
❤ : اب تو کوئی کمی محسوس نہیں کرتا۔ جب چھوٹا تھا تو سوچتا تھا کہ کاش بال ایسے ہوتے، قد لمبا ہوتا وغیرہ وغیرہ۔
☆ : اپنی کون سی عادت بہت پسند ہے؟
❤ : میرا دل بہت اچھا ہے صاف ستھرا اور نرم۔
☆ : اپنی کون سی عادت سخت ناپسند ہے؟
❤ : میں لوگوں پر زیادہ بھروسہ نہیں کرتا۔
☆ : زندگی میں کون سے رشتوں نے دُکھ دیے؟
❤ : ...... جانے دیں اس سوال کا جواب۔
☆ : لباس جگ بھاتا پہنتے ہیں یا من بھاتا؟
❤ : دونوں۔

☆: اردو والے ''سفر'' کا ذریعہ کیا ہے؟
♥: اپنی گاڑی۔
☆ صبح کا آغاز کس طرح کرتے ہیں؟
♥: صبح سات بجے اٹھ جاتا ہوں۔
☆ بہترین تحفہ آپ کی نظر میں؟
♥: کیش۔
☆: حساس ہیں یا......؟
♥: بہت زیادہ۔
☆: کون سے ایسے معاشرتی رویے ہیں جو آپ کے لیے دکھ اور پریشانی کا باعث بنتے ہیں؟
♥: بھروسہ ٹوٹتا ہے تو دل بھی ٹوٹ جاتا ہے۔

متاثر نہیں ہوتا۔
☆: خودستائشی کی کس حد تک قائل ہیں؟
♥: ایک حد تک تو سب ہوتے ہیں یار۔
☆ یاد کا کوئی جگنو جو تنہائی میں روشنی کا باعث بنتا ہو؟
♥: بہت کرائسس میں وقت گزارا ہے۔
☆: شوبز میں پہچان کون سا ڈرامہ بنا؟
♥: شناخت بہت ہٹ ہوا اور OREO بسکٹ کا کمرشل۔
☆: غصے میں کیا کیفیت ہوتی ہے، خاموشی یا چیخ وپکار؟
♥: چیزیں توڑنا شروع کر دیتا ہوں۔

☆: دولت، عزت، شہرت، محبت اور صحت اپنی ترجیح کے اعتبار سے ترتیب دیجیے۔
♥: محبت، صحت، عزت، دولت، شہرت۔
☆: سمندر کو دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟
♥: سمندر سے مجھے عشق ہے۔
☆: پہلی ملاقات میں ملنے والے کی کس بات سے متاثر ہوتے ہیں؟
♥: کسی بات سے بھی نہیں۔ میں جلد کسی سے

☆: لوگوں کی نظر میں آپ کی شخصیت کیسی ہے، اعلیٰ، اچھی، بس ٹھیک؟
♥: مزیدار سوال ہے مگر اس کا جواب لوگ دیں تو اچھا ہے۔
☆: کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟
♥: اپنے گلاسز والٹ اور موبائل۔
☆: کس کے بغیر زندگی ادھوری ہے؟
♥: انٹرنیٹ اور اپنوں کے بغیر۔
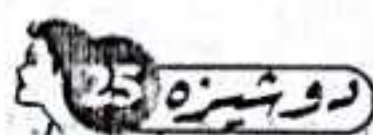
☆: وقت کی پابندی کرتے ہیں؟
♥: کوشش کرتا ہوں۔
☆: خدا کی حسین تخلیق کیا ہے؟
♥: انسان۔
☆: موت خوف کا باعث ہے؟ اور اس کے علاوہ ڈرنے کی کوئی وجہ؟
♥: موت سے نہیں ڈرتا۔
☆: فراز کے اس خیال پر کس حد تک یقین رکھتے ہیں کہ دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا؟
♥: سو فیصد۔
☆: کھانا گھر کا پسند ہے یا باہر کا فاسٹ فوڈ؟
♥: دونوں۔
☆: کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟
♥: اپنے خانساماں محمود کا۔
☆: کون سا کھانا اچھا پکا لیتے ہیں؟
♥: کچھ نہ کچھ تو پکا ہی لیتا ہوں۔
☆: زندگی کے معاملات میں آپ تقدیر کے قائل ہیں یا تدبیر کے؟
♥: دونوں کا
☆: کون سے الفاظ عام بات چیت میں زیادہ استعمال کرتے ہیں؟
♥: بہت سارے ہیں۔
☆: زندگی کا وہ کون سا پل تھا جس نے یکدم زندگی ہی تبدیل کر دی؟
♥: ثروت سے محبت نے زندگی ہی تبدیل کر دی۔
☆: ویک اینڈ کیسے گزارتے ہیں؟
♥: سمندر پر جا کر اپنی کشتی چلاتا ہوں۔
☆: شہرت، رحمت ہے یا زحمت؟
♥: رحمت ہے مگر کبھی کبھی زحمت بھی بن جاتی ہے۔
☆: اگر آپ میڈیا پر نہ ہوتیں تو کیا ہوتیں؟
♥: ڈاکٹری کے پروفیشن میں 'In' ہوتا۔
☆: آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟
♥: شکر ادا کرتا ہوں۔
☆: ''ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا'' کس حد تک عمل کرتے ہیں؟
♥: کوشش کرتا ہوں، جتنا عمل کر سکوں۔
☆: کون سی چیز وقت سے پہلے مل گئی؟
♥: پیار وقت سے پہلے مل گیا۔ جب دس سال پہلے ثروت میری زندگی میں آئی تھی۔ اُس کو پانے کے لیے دس سال انتظار کیا۔
☆: اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ موسیقی روح کی غذا ہے؟ اگر ہے تو کیسی موسیقی؟
♥: بالکل۔ مجھے میوزک کا کریز ہے۔
☆: پسندیدہ شخصیت؟
♥: الگزینڈر دی گریٹ۔
☆: خودکشی کرنے والا بہادر ہوتا ہے یا بزدل؟
♥: بہادر۔
☆: آپ پاکستان میں کس تبدیلی کے خواہاں ہیں؟
♥: سیاست دانوں کا احتساب ہونا چاہیے۔
☆: مطالعہ عادت ہے یا وقت گزاری؟
♥: مطالعہ کرنے کا بہت شوق ہے اخبارات کو انٹرنیٹ پر پڑھتا ہوں اور جو آن لائن اچھی چیزیں ہوتی ہیں وہ ضرور پڑھتا ہوں۔
☆: انٹرنیٹ اور فیس بک سے کتنی دلچسپی ہے؟
♥: بہت زیادہ ہے۔ کام کے سلسلے میں۔
☆: عورتوں کی کیا بات سب سے اچھی لگتی ہے؟
♥: ارے...... آپ لکھتے لکھتے تھک جائیں گے اور میں بولتے بولتے نہیں تھکوں گا۔
☆: خواتین کی سب سے بری بات کیا لگتی ہے؟
♥: (قہقہہ) مجھے خواتین کی کوئی بات بری نہیں لگتی۔
☆: حرف آخر کیا چاہنا چاہیں گے؟
♥: کبھی بھی برے وقت سے ہار نہ مانیں کیونکہ ہمیشہ اندھیرے کے بعد ہی سویرا ہوتا ہے۔

☆☆ ...... ☆☆☆

رنگین اسکرین

اے آر وائی کے خوبصورت پروگرام

م ش خ

قارئین حقیقی کامیابی بہت محنت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ مگر اس میں ہمیں اپنے ناظرین کے دیے ہوئے حوصلوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ آیئے ناظرین اب چلتے ہیں پروگراموں کی طرف۔ ڈرامہ سیریل

ARY ڈیجیٹل کی سیریل ''خاتون منزل'' میں ایمن

'میرے اجنبی' کی کہانی مختصراً یہ ہے کہ مسز فاروق اپنے بیٹے آیان سے بہت محبت کرتی ہیں۔ مزاج میں تکبر پایا جاتا ہے اور ان کے دو بچے ہیں ایان اور روما۔ نو جوان حریم جو بہت نازک اور شاعرانہ مزاج کی حامل لڑکی ہے ... کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اسے اردو ادب سے بہت لگاؤ ہے مگر اس کے والد مصطفیٰ خان بہت زیادہ شکی مزاج، ضدی اور ہٹ دھرم طبیعت کے مالک ہیں۔ انہیں اپنی بیوی ریحانہ اور بیٹی حریم سے کوئی خاص لگاؤ نہیں۔ ان کی زندگی کا مقصد اپنے بزنس کو پھیلانا ہے اور پیسہ کمانا ہے۔ حریم کو اخبارات میں لکھنے کا بہت شوق ہے۔ وہ اس شوق کی تکمیل کے لیے اکثر حریم خان کے نام سے آرٹیکل تحریر کرتی رہتی ہے۔ میمونہ بیگم مصطفیٰ کی دوسری بیوی ہیں۔ بہت سلجھی ہوئی اور محبت کرنے والی خاتون ہیں۔ پہلی شادی اولاد نہ ہونے کی وجہ سے ناکام ہوئی رابعہ بیگم میمونہ بیگم کی بڑی بہن ہیں اور اچھی طبیعت کی عمر رسیدہ خاتون ہیں اور موحد کی والدہ ہیں۔ شجاع احمد رابعہ بیگم کے شوہر ہیں اور موحد کے والد ہیں۔ موحد ان کی اکلوتی اولاد ہے۔ حریم کی شادی ان کے والد مصطفیٰ اپنے دوست کے لڑکے سے طے کر دیتے ہیں جبکہ حریم اپنے کزن کو پسند کرتی ہے آگے کہانی کیا رُخ اختیار کرتی ہے یہ تو ڈرامہ سیریل ''میرے اجنبی'' دیکھنے کے بعد ہی پتا چلے گا۔ اس کو تحریر کیا ہے صائمہ اکرم چوہدری نے جبکہ ہدایت احمد بھٹی کی ہیں۔ اس کے فنکاروں میں صبا حمید، ہما نواب، فردوس جمال، وسیم عباس اور فرح شاہ شامل ہیں۔ یہ سیریل ہر بدھ کی رات کو 9 بجے ARY ڈیجیٹل سے دکھائی جا رہی ہے۔

سیریل 'میرے جیون ساتھی' کا مرکزی خیال کچھ

یوں ہے کہ قسمت کبھی کبھی مخالف سوچ رکھنے والے افراد کو ایک دوسرے کی زندگی میں شامل کر دیتی ہے۔ ایسے میں تعلق توڑنا مسائل کا حل نہیں ہوتا کبھی کبھی قسمت ایک منفی کردار کی اصلاح کے لیے اسے مثبت کردار سے

انتقال ہو چکا ہے۔ وہ اپنے والد کی بہت لاڈلی بیٹی ہے۔ زرمین کی ایک بڑی بہن فضیلت ہے جو شادی شدہ ہے۔ زرمین سکندر کو پسند کرتی ہے جبکہ فضیلت زرمین کی سگی بہن ہونے کے باوجود زرمین کے لیے حسد اور جلن دل میں

ARY ڈیجیٹل کی سیریل ''میرے اجنبی'' میں اُروا...... ARY ڈیجیٹل کی سیریل ''تیرے در پر'' میں سوبر علی اور سبرین ہسبانی

قریب کر دیتی ہے۔ ایسے میں مثبت کردار کے حامل لوگوں کو اپنا کردار خوبصورتی نبھانا چاہیے۔ ہر شخص میں خوبیاں اور خامیاں ہوتی ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہر انسان کی خامیاں اس کی خوبیوں کو ڈھانپ لیا کرتی ہیں۔ ایک اچھا جیون ساتھی ہمیشہ اچھی خوشیوں کی تلاش میں رہتا ہے اور یہ رویہ تعلقات کو بہتر انداز میں رکھتا ہے۔ سیریل میرے جیون ساتھی کو تحریر کیا ہے ماہا ملک نے جبکہ ہدایت عبداللہ بدنی کی ہے۔ سیریل کے فنکاروں میں یسی پاشا، وسیم عباس، صبا حمید، حریم فاروق، حسن نیازی، فرحان سعید، اُروا، احمد حسن، ہما نواب، اور فردوس جمال قابل ذکر ہیں۔ یہ سیریل ہر بدھ کی رات 9 بجے اے آر وائی ڈیجیٹل سے دکھائی جائے گی۔

ڈرامہ سیریل 'تیرے در پر'' کی کہانی کچھ یوں ہے کہ زرمین ایک سیدھی سادھی لڑکی ہے جس کی ماں کا

رکھتی ہے۔ جب اپنوں کی بے وفائی مقدر بن جائے تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ یہی سیریل کی کہانی ہے۔ اس سیریل کو تحریر کیا ہے رخسانہ نگار نے جبکہ ہدایت عبداللہ بدنی کی ہیں سیریل کے فنکاروں میں سبرین ہسبانی، شہود علوی، سوبر علی، قوی خان، نائلہ جعفری اور راشد فاروقی شامل ہیں۔ سیریل ''تیرے در پر'' ہر منگل کی رات 9 بجے ARY ڈیجیٹل سے دکھائی جائے گی۔

سیریل 'خاتون منزل' میں حنا دل پذیر نے قدوسی صاحب کی بیوہ کے بعد ناقابل فراموش کردار ادا کر کے اپنے آپ کو منوا لیا ہے۔ مصنف فصیح باری نے اس خوبصورت تحریر کیا سیریل میں قوی خان اور حنا دل پزیر نے کمال کی اداکاری کر کے چار چاند لگا دیے سیریل 'خاتون منزل'' ہر جمعرات کی رات 8 بجے ARY ڈیجیٹل سے دکھائی جا رہی ہے۔

☆☆......☆☆

ڈیئر قارئین! یوں تو دوشیزہ سمیت دیگر جرائد میں آپ نے شادیوں کے بہت سے احوال پڑھے ہوں گے مگر ہمارے بیٹے کی شادی اوراس سے قبل منگنی طے پائی وہ قدرے دردناک اور دل چسپ ہے۔ اب آپ سوچیں گے کہ دردناک کیوں!

تو صاحب! ہوا یوں کہ 8 ستمبر 2012 کو پورے پاکستان سمیت سندھ میں برساتوں کا جو سلسلہ شروع ہوا۔ اور وزراء، سفراء، اور امراء نے اپنی زمینوں کو بچانے کے لیے سندھ کے ذیلی علاقوں کی جانب سیلاب کارخ کردیا۔ ایک تو قہر خداوندی، اور پھر یہ خدائی فوجدار۔ 8 ستمبر 2012 کو ہمارا گھر اور نصف شہر نذر سیلاب ہوگیا۔

اٹھانے دی تھی کب سیلاب نے تصویر تک تیری
میری گلیوں سے پانی کو گزر جانے کی جلدی تھی

ہمارا پختہ گھر بھی سڑک کے نیچے ہونے کے باعث سیلابی ریلے میں آگیا۔ ہم اپنی بوڑھی امی اور بیٹے کے ساتھ اپنی دوست رابعہ پٹھان کے گھر دو دن رہے۔ اور بعد ازاں بڑی مشکل سے کرائے کا گھر ملا۔ یہ دورانیہ صبر واستقامت کا ہم نے کراچی میں اپنی بہن ذکیہ سلطانہ کے گھر گزارا۔ جب واپس کرائے کے مکان میں شفٹ ہوئے تو اپنا گھر...... گھر کی ایک ایک چیز، اپنی

پروفیسر صفیہ سلطانہ مغل اپنی بہو ماروی سومرو کے ہمراہ

کتابیں، پرانے خطوط، گمشدہ ڈائریاں، اپنی بیاض، افسانوں کے مسودے، ادھوری غزلیں، نا مکمل قافیے، ضدی ردیف...... آہ...... ہماری طبع شدہ مجموعہ ہائے کلام، ناول، غرض یہ کہ ہم کچھ بھی

نہ بچا سکے۔

ان سب یادوں نے تخلیق اور تخیل کا سرمایہ نذرِ آب ہونے کی وجہ سے ہمارا ذہن بالکل ماؤف اور ادھر ہماری امی بھی جو ضعیف العمر ہیں وہ بیمار، ایسے میں ہمارا اکلوتا بیٹا شرجیل اقدس تھا۔ سب نے ہم دونوں کو نہ صرف سہارا دیا بلکہ گھر کی تعمیر کے جملہ مسائل بھی حل کیے۔ سو ہمارا آشیانہ زیرِ تعمیر تھا۔ ایک دن اچانک امی ہم سے کہنے لگیں کہ صفیہ تم شرجیل کی شادی کر دو۔

شرجیل اس وقت بی اے فائنل کر رہا تھا۔ ہم نے حیرانی سے امی کو دیکھا...... کہ محدود وسائل...... گھر کی تعمیر...... بجٹ کی کمی...... ایسے میں ہماری امی کو 'ہری ہری' سوجھ رہی ہے۔ نہ ہی وہ برسرِ روزگار...... بلکہ صرف 23 سال کا مگر ہماری امی نے جیسے قسم کھالی کہ مجھے اپنی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، تم میری زندگی میں ہی اس کی شادی کر دو۔''

کیونکہ والدین کے گھر رہنے کی وجہ سے امی نے ہی اس کو پالا تھا۔

ہم نے شرجیل سے بات کی۔ وہ اکھڑ گیا۔ امی ہو کیا گیا ہے ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔ نہ جاب ہے کون لڑکی دے گا۔'' ہم نے اسے کہا کہ تم فکر نہ کرو یہ ہمارا دردِ سر ہے اور کہا کہ جا تجھے کشمکشِ دہر سے آزاد کیا۔

☆......☆......☆

یوں جناب اگلے دن ہی اپنی دوست خورشید کے گھر پہنچ گئے۔ چونکہ پہلی بار کسی کا رشتہ لے کر گئے تھے اور ان آداب سے بھی ناواقف تھے۔ سو ہماری مشکل خورشید نے آسان کر دی۔

شرجیل کی دو دودھ شریک بہنیں حمیرا اور نمیرا بھی تھیں۔ انہوں نے مدعا پیش کیا۔ ان محترمہ کو شاید یہی توقع تھی۔ فوراً ہاں کہہ دی۔ گویا تیار بیٹھی تھیں (بھئی ہمارے جیسی سمدھن انہیں کہاں ملتی) خیر جناب اس وقت رشتہ طے پایا۔

ہمارے ارمان دل میں رہ گئے کہ بیٹے کے لیے رشتہ لے کر جائیں گے۔ خوب ضافتیں اڑائیں گے۔ جوتیاں گھسیں گی مگر کہاں جناب، آج تک ہمارا کوئی ارمان پورا ہوا ہے تو جناب 2 مارچ 2013 کو شرجیل اور ماروی سومرو کی منگنی ہوگئی۔ یہ قصہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ مگر اس ذکر کو رہنے دیں۔ کرائے کا گھر ہمارے لیے بہت نیک شگون ثابت ہوا۔ گھر نامکمل، فرنش نہیں ہوا۔

ضروریاتِ زندگی کا سامان تو تھا مگر آسائشاتِ زندگی نامکمل، یوں ڈیڑھ سال کے عرصے میں الحمدُللہ ہمارا گھر مکمل ہو گیا۔ اب شرجیل کی شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں مگر میں اکیلی جان، شرجیل میرا اکلوتا بیٹا نہ کوئی بھابی نہ بہن بلکہ باپ کا سایہ بھی نہیں۔

میں نے تیری خاطر بیٹا بیٹا وقت یہ تنہا کاٹ لیا
لیکن غم کی دیمک نے اندر سے مجھ کو چاٹ لیا

سو میرا غم دوگنا اور خوشی چوگنی تھی۔ تمام شاپنگ آن لائن کی۔ نیٹ پر ڈیزائن پسند کیے۔ واٹس اپ پہ ماروی سومرو کو بھیج دیتی۔ وہ شرما کر Reply کرتی۔ ''مام جیسے آپ کی مرضی۔ آپ کی چوائس بہت اچھی ہے۔''

سب سے بڑا مرحلہ ہر شادی میں نکاح اور ولیمے کے جوڑے کا ہوتا ہے۔ آن لائن شاپنگ میں بھی یہ مسئلہ چار بار آیا۔

ڈل ریڈ کلر پر ڈل گولڈن اور وائٹ Beats کی کڑھائی مشکل مرحلہ تھا۔ مگر بالآخر ترتیب پا گیا۔ ڈل ریڈ شرارہ، لونگ شرٹ، اور 7 گز کا بھاری دوپٹہ ہم سب کو پسند آ ہی گیا۔ جبکہ ولیمے

کے لیے حیدر آبادی فراک پشواز نمارائل بلو کام کے ساتھ، لیمن اور اورنج کنٹراسٹ میں پسند آئی۔ تنگ پاجامہ اور نیٹ کا دوپٹہ تِلّے کے شاہی کھسے اور دیگر لوازمات کے ساتھ قریب

وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھے اور طبیعت بے حد خراب۔ 9 دسمبر کو جب رات کو ڈاکٹرز نے انہیں جیکب آباد آنے اور سفر کرنے کی اجازت دی۔ تب اسی رات 10 بجے ذکیہ اور حمیرا، نمیرا مایوں

دولہا شرجیل اقدس اور دلہن ماروی سومرو اپنی شادی کے موقع پر

کپڑوں کی تیاری مکمل ہوگئی۔

زیور ہم پہلے ہی بنوا چکے تھے۔ (اس کی تفصیل میں جانا بحث ہے)

ماروی کی امی چونکہ میری دوست تھیں۔ سو کسی شرط پر نکاح حق مہر اور نان نفقہ ایشو نہیں ہوا محض پندرہ ہزار روپے حق مہر پر یہ معاملہ طے پایا جو کہ شرجیل نے اسی وقت ادا کر دیا۔

دسمبر 9 تاریخ سے شادی کا آغاز ہوا۔ 6 دسمبر کو میری چھوٹی اور اکلوتی بہن ذکیہ سلطانہ مع اپنے شوہر (میرے ماموں زاد بھائی انصار اور اپنے چاروں بچوں سمیت جیکب آباد پہنچی۔ تو ہماری مسرت دیدنی تھی۔ لیکن بڑے اور اکلوتے بھائی طاہر احمد کی طبیعت خراب ہوگئی۔

اور شادی کی دعوتیں دینے نکلیں۔ بھیا جان کی حالت کے پیش نظر مایوں میں صرف مخصوص لوگ شامل تھے۔ پھر بھی پندرہ گاڑیوں میں یہ قافلہ ماروی سومرو کے گھر پہنچ گیا۔

یلو اور گرین چوڑی دار پاجامے اور گھیر دار فراک، اور نیٹ کے ایمبرائڈری دوپٹے میں ماروی نظر لگ جانے کی حد تک پیاری لگ رہی تھی۔ (چونکہ وہ لوگ سندھی ہیں تو ان کی اور ہماری رسومات دونوں بہت اچھی رہیں) رسم کے بعد بریانی اور رائتے سے تواضع کی گئی۔ بارہ بجے واپسی ہوئی۔ وہاں براہوی اور سندھی گانوں پر چاپ، اور جھومر (سندھی رقص) ماروی کی بہنوں، کزنوں نے کیا۔ جبکہ ہم لوگوں نے اپنی

مہارت شادی کے لیے رکھ چھوڑی۔
اس سے اگلے دن ہم نے ریسپشن دی۔ جس میں شہر بھر کی ہماری سہیلیاں رشتے دار، اسٹاف، کولیگز، سب شامل تھے۔ کراچی سے ذکیہ کی پوری سسرال 30 افراد پر مشتمل، وہ بھی کراچی سے آ گئے۔
یوں خوب رونق لگی۔ اس عشائیے میں کھانے کی پانچ متنوع ڈشز تھیں (تفصیل عبث ہے منہ میں پانی آجائے گا آپ کے) کھانا کھانے کے بعد ہلہ گلہ شروع ہو گیا۔ شرجیل کی دودھ شریک بہنوں حمیرا، نمیرا میری بہن ذکیہ اور میں نے خوب ڈانس کیا۔
ہماری کولیگز بھی شامل ہو گئیں، بالخصوص ہماری نئی لیکچرر جو بہت کم عمر ہے) شبانہ مہر نے ہمارا خوب ساتھ دیا۔ ڈانڈیا، چاپ، جھومر، سولو رقص، غرض یہ کہ صبح اذانوں تک ہم لوگ موج مستی کرتے رہے۔ ناشتا اس دن ہم نے باہر سے منگوایا، حلوہ پوری چنے کی دال آلو کی بھجیا کے ساتھ ناشتا مزہ دے گیا۔ تھکن کا احساس بالکل نہ تھا۔
اگلے دن جمعہ تھا۔ 11 دسمبر کو نکاح بعد نمازِ عصر ہونا تھا۔ شرجیل میرا پیارا بیٹا سفید کاٹن کے سوٹ پشاوری کھسے اور سندھی ٹوپی میں بہت پیارا لگ رہا تھا۔ اس کے تمام دوستوں نے خوب اسے گود میں اٹھا کر بھنگڑا ڈالا۔
ہم سب نے نظر اتاری، نماز عصر کے بعد مسجد میں نکاح ہوا۔ نکاح کے بعد بیکری پارسل دیے گئے۔ جسے تناول کرنے کے بعد بندہ عشاء تک صبر کر سکتا تھا۔
نکاح کے بعد شرجیل جب گھر واپس آیا تو پتا نہیں کیوں میں اُسے گلے لگا کر رو پڑی۔ وہ پریشان ہو گیا۔ امی میں بیٹی تو نہیں کہ پرائی ہو گئی۔ بیٹا ہوں اور آپ کے ساتھ ہی ہوں۔ لیکن میں اندر سے بہت رنجیدہ تھی۔ بہت دکھ جھیل کر اس کو پالا تھا۔

میں نے تیری خاطر بیٹا وقت یہ تنہاء جھیلا تھا
اک تھی میری ٹوٹی کشتی اور غموں کا ریلا تھا

نیرّ سلطانہ کے اس جذباتی سین کے بعد ہم نے اپنے آنسو صاف کیے اور شادی کی تیاریوں میں جت گئے۔ صد شکر کے ہمارے تمام مہمان مہذب، شائستہ، اور پابندی وقت کے اصولوں پر کاربند تھے۔ لہٰذا بارات بہت جلد تیار ہو گئی بارات میں 60-50 افراد تھے۔
مردوں میں صرف شرجیل کے دوست، اس کے (سوتیلے بھائی جنہیں ہم نے اور شرجیل نے کبھی بھی نہیں سمجھا سوتیلا) فاروق بروہی، مسعود بروہی اور مقصود بروہی تینوں کی بیویاں سب شامل تھے۔ شرجیل کے چند قریبی دوست شامل تھے (چونکہ نکاح میں بھی شامل ہو چکے تھے)۔
رات کا کھانا ہم نے اپنے گھر میں کھایا، شرجیل نے قناتیں اور اسٹیج بہت اچھا بنوایا تھا۔ ابھی اور تیز ہونے والی جگمگاہٹیں تھیں (یہاں شادی ہال نہیں ہیں) دلہن والوں کو ہم نے وہاں کھانا دیا تھا۔
(سندھیوں میں یہ رواج ہے کہ بارات کا کھانا دولہا والے دیتے ہیں) ہم یہاں اور وہ لوگ وہاں جب کھانے سے فارغ ہوئے (بر وقت) ہم نے اپنے گرلز ڈگری کالج کی نئی نویلی بس کا انتظام کیا تھا۔ نصف ٹرین جتنی بس تھی جبکہ میں فاروق کی بیوی سعیدہ (فاروق میرا بہت پیارا بیٹا، اور اپنے سگے بیٹے سے زیادہ پیارا ہے) دیگر گاڑی میں تھے۔

گاڑی بالکل سادہ تھی۔ شرجیل کو شور شرابہ، ہلہ گلہ، ڈھول تاشے بالکل پسند نہیں (شریعت کا بے حد پابند ہے) سو ہم بہت سادہ سی بارات لے کر ماروی (دلہن) کے گھر پہنچے۔

وہ آئے بزم میں میر نے اتنا تو دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

خیر جناب اس کا بھی انتظام کیا تھا۔ خود کار جنریٹر چل اٹھا۔ سبز قالین کی روش پر دلہن کو اس کی

صفیہ سلطانہ مغل اپنے بیٹے شرجیل اور بہو ماروی و دیگر احباب کے ہمراہ خوشگوار موڈ میں

انہوں نے ایک وسیع میدان کو قناتوں سے شادی ہال کا رنگ دے دیا تھا۔ مردانہ حصہ الگ تھا۔ (دلہن) ابھی تک حسبِ معمول پارلر میں تھی۔ تب تک خوب ناچ گانا ہوتا رہا۔

خاص طور پر جب میں نے اور (ماروی کی امی) خورشید نے کیا تو سب نے بہت انجوائے کیا۔ کیونکہ (شرجیل اور ماروی) کے ساتھ میری اور خورشید کی جوڑی بھی بہت پسند کی گئی۔ ماروی کے والد بھی فوت ہو چکے تھے۔ سو ہم دونوں کا دکھ بھی مشترکہ تھا۔

ٹھیک بارہ بجے جب دلہن پارلر سے آئی اور شادی ہال میں قدم رکھا اسی وقت لائٹ چلی گئی۔ ہم نے با آواز شعر پڑھا۔

بہنیں، سارہ، سحر اور صبا، کزنز اسٹیج پر لے کر آئیں۔ چشم بد دور، ماروی بہت پیاری لگ رہی تھی۔ میں نے فوراً اس پر سے نوٹ وار کر دیے۔ فوٹو سیشن ہوا۔ مووی بنی، اور پھر رسومات کا سلسلہ۔

ہمارے کراچی کے مہمانوں کے لیے ایک رسم بڑی دلچسپ رہی۔ وہ یہ کہ ان لوگوں میں دولہا دولہن کو فرشی بستر پر بٹھایا جاتا ہے۔

آمنے سامنے پھر چاندی کا ایک چھلہ دودھ میں ڈالتے ہیں۔ وہ برتن (باؤل بڑا سا) دونوں کے سامنے رکھتے ہیں۔ ان دونوں کو چھلہ تلاش کرنا ہوتا ہے۔ جسے پہلے مل جائے اس کے حامی نعرے لگاتے ہیں، شور کرتے ہیں سمجھا جاتا ہے کہ

وہ فریق حاوی رہے گا۔ چھلہ ماروی کو مل گیا (وہ حاوی) رہی۔ اس کے بعد کاٹن (روئی) رکھی جاتی ہے۔

دونوں روئی کے گالے اٹھا اٹھا کر ایک دوسرے کے سر پر ہلکے سے مارتے ہیں۔ اس کے بعد آخری رسم یہ ہے، پیشانی پیشانی کے ساتھ آہستہ سے ٹکرائی جاتی ہے (یہ لاجک سمجھ میں نہیں آتی) تمام رشتہ دار دوست احباب باری باری سات سات مرتبہ ٹکراتے ہیں۔

اس کے بعد رخصتی کا مرحلہ آیا۔ تو خورشید اور ماروی (دلہن) کی بہنیں اِدھر اُدھر ہوگئیں (ماروی رونے لگی تو اُدھر بھی ہم نے اس کا ساتھ دیا۔ وہاں بھی سب حیران کے دلہن کا رونا تو سمجھ میں آتا ہے۔

(ساس) کیوں رو رہی ہے چونکہ ماروی کو اپنی بیٹی کی طرح سمجھتی ہوں (میری بیٹی بھی نہیں ہے)۔ سو بیٹی کی رخصتی پر تو رونا آئے گا نا۔ جب بارات واپس لائے تو پھر رسموں کا سلسلہ شروع جو بمشکل 3 بجے ختم ہوا۔

ایک دن کے بعد ولیمہ تھا۔ ولیمہ ہمارے گھر میں ہوا۔ مردوں کا انتظام میونسپل ہال میں کیا گیا جبکہ خواتین کے لیے گھر میں انتظام تھا۔

ماروی اور شرجیل بہت خوش ہیں۔ مجھے بہو کی صورت میں ایک بیٹی، دوست اور غم گسار ساتھی مل گئی۔ ہم سب بہت خوش ہیں۔ ماروی بہت سلیقہ شعار چاق و چوبند اور ہر فن مولا ہے۔ (ہماری طرح ہا...... ہا......ہا) بیٹی کس کی ہے۔

شرجیل ہمارے انتخاب پر نازاں ہے۔ ماروی بہت مسرور ہے۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کی جوڑی سلامت رکھے۔ محبت اور پیار سب کے مابین قائم رہے۔ اللہ پاک نیک اور صالح اولاد سے نوازے۔ (آمین)

☆☆......☆☆

Life Bouy.. اصلی ہیروں کی کھوج لائے

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

Best Style Awards کی تقریب گزشتہ دس برس سے منعقد کی جارہی تھی۔ گوری ناتھا خان کا خواب آج پورا ہونے جارہا تھا۔ اُس نے تو بس ایک خواب دیکھا تھا لیکن اُسے کیا خبر تھی کہ وہ ایک دن خود خواتین کا خواب بن جائے گی۔ وقت پلٹتے دیر تو نہیں لگتی تو بھلا وقت سے آگے کون جاسکتا ہے اور وقت کس کے سر پر 'ہما' بٹھا دے کون جانے۔ گوری ناتھا خان کا شمار بھی اُن ہی شخصیات میں ہوتا تھا۔ وہ ہاتھوں میں تقریب کا انویٹیشن کارڈ پکڑے مسلسل کارڈ پر اپنے کمپوزڈ نام کو تکے جارہی تھی۔ آنسو کارڈ پر گرتے اور اُس کی چکنی سطح سے لڑھکتے اُس کے دامن میں جذب ہورہے تھے۔ اچانک موبائل کی بیل بجی اور دوسری جانب سے آتی آواز اُس کے ماتھے کی شکنوں پر جال بناتے، بتا رہے تھے کہ اُس کو ناپسندیدہ باتیں سننے کو مل رہی ہیں۔ گوری نے غصے سے تیوراکر موبائل آف کیا اور صوفے پر اچھال دیا۔

”کس کا فون تھا؟ کیا ہوا بیٹا؟ کس سے باتیں کررہی تھیں؟“ چندا بوا فوراً ہی اُس کے قریب آ گئی تھیں۔

”یہ تمہارے چہرے کو کیا ہوا ہے؟ ارے بات کیا ہے بھئی... کیوں اتنی پریشان لگ رہی ہو۔ خیر تو ہے ... ماتھے پر آیا اپنا پسینہ صاف کرتے ہوئے بولی تھیں۔

وہ ان سے بھلا اپنی پریشانی کیسے چھپا سکتی تھی۔ فوراً ہی اُن کے کاندھے سے لگ کر آنسو بہانے لگی۔ مگر منہ سے کچھ بول کر نہ دی۔

”ارے بیٹیا...... کیوں رونے لگیں۔ ابھی یہ کارڈ آیا تو تُو اتنا خوش تھی پھر یکلخت کیا ہوا کہ یوں چہرہ ہی اُتر گیا؟“ وہ ان کے پاس سے اٹھی اور واز میں رکھے پھول پھر سے ترتیب سے رکھنے لگی۔

”کچھ نہیں ہوا بوا! بس وہ میری ایک فرینڈ مجھ سے بہت زیادہ ناراض ہے۔“ وہ اتنا بول کر واپس صوفے پر آ بیٹھی۔

”ائے ہئے تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ تم نے تو میرا کلیجہ ہی جلتے توے پر رکھ دیا تھا۔ بٹیا! دیکھ لینا کسی دن اس طرح کے تمہارے واویلے سے میں مروں گی بس...... پھر تم رہنا موج مستی میں گم اور دیکھوں گی کہ پھر تم کسے ڈراتی ہو۔“

”بوا اللہ نہ کرے کہ خدا آپ کو اپنے پاس بلا لے۔ ارے ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے۔“ گوری نے ستر سالہ بوا کو دیکھ کر جھٹ سے ٹکڑا اچھالا اور مسکرانے لگی۔

”ہاں یہی کوئی سولہ برس کی بالی عمریا ہوگی بوا کی۔“

اچانک سے علی شان کمرے میں نمودار ہوا اور گوری کا جملہ اچک لیا۔

"تم بہت بدمعاش ہو بوا۔ اُس دن جو شام کو کہا تھا کہ باہر جا رہے ہو تو ایک چھٹانک سری لنکا کی چھالیہ اور سانچی پان آدھا پاؤ لا دینا مگر ناں بھئی۔" بوا نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"ارے میری پیاری ڈارلنگ بوا! بس آج میں آدھا پاؤ چھالیہ اور ایک پاؤ سانچی پان آپ کو لا دوں گا۔" علی شان نے بوا کے گلے میں بازو حمائل کیے۔ انہوں نے جھٹکے سے اُس کے ہاتھ دور کر دیے۔

"اے بس بس رہنے دو اپنے منہ دیکھے کے چاؤ چونچلے...... تم کو بوا پتا چلے گا جب بالی عمریا والی کو سولہ بازو قبرستان لے جا رہے ہوں گے۔"

"بوا بس بھی کریں ناں...... ہر وقت مرنے مارنے کی باتیں کرنا اچھا لگتا ہے کیا؟" گوری نے بوا کو خاموش کرایا اور اپنے کمرے کی جانب چل دی۔

☆......☆......☆

"کیا ہوا؟"

"وہ...... دیکھو نا۔ کیسے بال لہرا رہی ہے۔"

ندیم شان نے اُس کی اشارہ کرتی انگلی کی سمت دیکھا تھا۔ اُس کے چہرے کے تاثرات جانچے اور پھر ٹھنڈے لہجے میں پوچھا۔

"ہوا کیا تھا آخر۔" سویرا کے منہ سے زیادہ الفاظ نہ نکل سکے بس واش روم کی طرف ہی اشارہ کرتی رہی۔

"آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ وہ چڑیل یہاں بھی آ گئی ہے۔"

"واٹ ربش یار! کیا بکواس ہے۔ کہاں ہے گوری؟ تم ہر وقت اسے کیوں سوچتی ہو؟"

"میں سوچتی نہیں ہوں ندیم! وہ خود بخود اپنے بال لے کر میرے سامنے آ جاتی ہے۔ مجھے کہتی ہے کہ میں آ گئی ہوں؟ میں زندہ نہیں چھوڑوں گی تمہیں۔ میں نہیں چھوڑوں گی تمہیں۔" وہ کہتی جا رہی تھی اور ندیم شان سُن سُن کر ہلکان ہوتا جا رہا تھا۔ اور پھر وہ چپ ہو گئی اور سر جھکا کر اپنے ہاتھوں کو گھورنے لگی۔

"کیا کچھ اور......" ندیم کی بات پر اُس نے سر اٹھا کر شکوہ کناں نگاہوں سے اُسے دیکھا اور پھر تیزی سے کھڑی ہو گئی۔

"چلتی ہوں۔"

ندیم نے اُسے روکا نہیں۔ ایک ایک سیڑھی اترتے ہوئے سویرا کو لگا کہ وہ پاتال میں اُتر رہی ہے۔ آنکھوں میں گوری کا عکس ٹھہرا تھا اور اِکلاپے کا گولہ حلق میں پھنس کر سارے الفاظ گونگے بہرے کر گیا تھا۔

اُس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا کہ شاید ندیم شان اُس کے پیچھے آیا ہو...... مگر...... اُس کے پیچھے سناٹا ناچ رہا تھا۔ اس کی امید بھی دم توڑ گئی۔ آج پھر اُسے لگا تھا کہ سب کچھ ہار گئی ہو۔ اُس نے اپنے بالوں کو ہاتھ لگایا تو لگا جیسے یہ نرم نرم سلکی بال نہ ہوں بلکہ برق بھری تاریں ہوں اور آج یہی تاریں اُسے زندگی کی بازی ہارنے میں معاون ثابت ہونے والی ہوں۔

☆......☆......☆

اک عمارت
ہے سرائے شاید
جو میرے سر میں بسی ہے
سیڑھیاں چڑھتے اُترتے ہوئے جوتوں کی دھمک
بجتی ہے سر میں
کونے کھدروں میں کھڑے لوگوں کی سرگوشیاں
سنتا ہوں کبھی
سازشیں پہنے ہوئے کالے لبادے سر تک
اڑتی ہیں...... بھوتیا محلوں میں اڑا کرتی ہیں
چمگادڑیں جیسے
اِک محل ہے شاید......
ساز کے تار چٹختے ہیں فسوں میں
کوئی کھول کے آنکھیں
پیتاں پلکوں کی جھپکا کے بلاتا ہے کسی کو!
چولہے جلتے ہیں تو مہکی ہوئی گندم کے دھوئیں میں
کھڑکیاں کھول کے کچھ چہرے بجھے دیکھتے ہیں
اور سنتے ہیں، جو میں سوچتا ہوں
ایک مٹی کا گھر ہے
اک گلی ہے جو فقط گھومتی ہی رہتی ہے
شہر ہے کوئی، مرے سر میں بسا ہے شاید......

بہت عرصہ نہیں گزرا، بس یہی کوئی پانچ برس پہلے کی بات ہے۔ وہ بھی گاؤں کی الہڑ مٹیار کی طرح گھڑا سر پر لیے پانی بھرنے جا رہی تھی۔ اُس کے گاؤں میں ڈاکومینٹری فلم بنانے کے لیے کچھ لوگ اپنے ساز و سامان سمیت آئے تھے۔ ایک بہت گریس فل سی خاتون جینز ٹی شرٹ پہنے سر پر اسکارف لپیٹے پانی بھرنے والی دوشیزاؤں کے پاس کھڑی مختلف سوالات کر رہی تھیں۔ جب وہ اپنی دھن میں مگن اپنا گھڑا ابھرنے لگی تو خاتون کی نگاہ خود بخود اُس کے ریشمی سیاہ چمکدار بالوں کی طرف اٹھی تو اُن زلفوں میں کھو کر جیسے رستہ ہی بھول گئی۔

''واؤ! لگتا نہیں ہے یہ لڑکی گاؤں کی ہے۔'' اُس نے دل میں کہا اور اُس کی سادگی پر قربان ہوتی اُس کے قریب ہو گئی۔

''ہیلو! بیوٹی کوئن!'' اُس خاتون کے پکارنے پر وہ جھجک کر پیچھے ہوئی۔

''کیا ہوا لڑکی! کیوں ڈر رہی ہو۔ میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

اُس نے اُس خاتون کی طرف دیکھا اور گھڑا سائیڈ پر رکھ دیا۔ اور مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''جی باجی!'' اُس کی سادگی نے خوش بخت کو متاثر کیا۔

''کہاں رہتی ہو۔''

''باجی بس یہیں قریب ہی میرا گھر ہے۔''

''پڑھی لکھی ہو!''

''مڈل تک پڑھا ہے باجی۔''

''اور آگے کیوں نہیں پڑھا؟''

''باجی! بہت ہے اتنا ہمارے لیے۔'' وہ نرم مسکراہٹ سجائے بولی تھی۔

''تم گاؤں کی نہیں لگتی ہو؟'' خوش بخت کے منہ سے نکل ہی گیا۔ اس بات کے جواب میں وہ پھر سے مسکائی تھی۔

کیسی مسکراہٹ تھی۔ دل موہ لینے والی، پتھروں میں دراڑ ڈال دینے والی۔

''میں تمہارے گھر آنا چاہتی ہوں۔'' خوش بخت نے خواہش کا اظہار کر ہی دیا۔

''بالکل باجی! شوق سے آئیں۔ آپ ایسا کریں۔ فارغ ہو کر 'قمری منیار' کا گھر کسی سے بھی پوچھ لیں، وہ آپ کو بتا دیں گے۔ باجی آنا ضرور! میں انتظار کر رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ گھڑا اٹھائے اپنے گھر کی طرف چل دی اور خوش بخت اُس کی پنڈلیوں تک آتی ریشمی چمکدار زلفوں کو دیکھتی رہ گئی۔

☆......☆......☆

''آ گئی بندیا!'' قمری منیار نے بیٹی کو خوشی خوشی گھڑا چوکی پر رکھتے دیکھا تو پوچھ بیٹھا کیونکہ آج کا دن کوئی عام دن نہ لگتا تھا۔ بندیا کی آنکھوں میں خوش کن اُجالا پھیلا تھا۔ جیسے وہ کسی جوتش سے اپنی قسمت کا حال سُن کر آئی ہو اور اُس نے کہا ہو کہ تیری قسمت میں اچھا دور شروع ہوا چاہتا ہے۔ جا اور اپنے آنے والے کل کے لیے تیاری کر لے۔''

''بڑی خوش لگ رہی ہے بیٹی؟'' آخر وہ پوچھ ہی بیٹھا۔

''ہاں بابا! بابا آج شہر سے ایک باجی آئی ہے۔ پنگھٹ پر لوگوں کے انٹرویو لے رہی ہے۔ باجی نے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہتی ہے تیرے گھر آؤں گی۔ بتا بابا! کیا میں خوش نہ ہوؤں۔ بابا مہمان تو خدا کی رحمت ہوتے ہیں اور اگر رحمت خود راستہ روک کر بولے کہ میں تیرے گھر آؤں تو......''

''تُو تو جھلی ہے!''

بابا! میرے لائف بوائے شیمپو کے ساشے لائے نا۔''

''ہاں ہاں پتر! میں پوری ایک چھڑی لے آیا ہوں۔''

''بابا! تم یہ شیمپو کی لڑی کو چھڑی کیوں کہتے ہو۔''

''ارے پگلی! دکاندار بھی اِس گولڈ لائف بوائے لڑی کو چھڑی ہی کہتا ہے۔ سمجھی کہ نا......''

''ٹھیک ہے! لاؤ بابا میری لائف بوائے شیمپو کی لڑی...... ارے چھڑی۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا اور قمری منیار نے اُس کے ہاتھ میں شاپر سے نکال کر لائف بوائے شیمپو کے ساشوں کی 24 ساشے والی لڑی دے دی۔ جسے پا کر بندیا کی خوشی دیدنی تھی۔

☆......☆......☆

خوش بخت اپنی ٹیم کو Stay کرانے کا کہہ کر قمری منیار کے گھر چلی آئی تھی۔ اُس کے ساتھ بس اُس کا بھائی تھا جو اس ٹیم میں کیمرہ مین کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔

قمری منیار نے شہری مہمانوں کو عزت سے بٹھایا اور بندیا نے مہمانوں کے لیے تازہ بٹیرے بھون دیے تھے۔

کھانا اتنا لذیذ تھا کہ خوش بخت حیران رہ گئی تھی۔ کئی فائیو اسٹار ہوٹلوں سے بڑھ کر Taste قمری منیار کی بیٹی کے ہاتھ میں تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر خوش بخت نے اپنے پرس میں ہاتھ ڈالا اور ایک پانچ ہزار کا نوٹ نکال کر بندیا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''باجی! یہ کیا ہے؟'' بندیا حیران ہو کر بولی تھی۔

''یہ تم جیسی پیاری اور نمبر ون لڑکی کے لیے ہماری طرف سے ایک Gift ہے۔'' خوش بخت مسکراتے ہوئے بولی۔

''باجی! کیسا گفٹ ہے یہ...... میں یہ نہیں لے سکتی۔ آپ نے ہماری غربت کا مذاق اڑایا ہے۔'' وہ تن فن کرتی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''کول ڈاؤن پلیز! بندیا یہ کیا بات کہہ دی تم نے۔ تم غریب کب ہو بیوٹی کوئن! تم کو خدا نے جو حسن کی دولت دی ہے تو بڑے بڑے قارون کا خزانہ رکھنے والے روسا کے پاس بھی نہیں۔ یہ احساسِ کمتری تم جیسی پیاری لڑکی کے دل میں آیا کیسے بے بی!'' خوش بخت نے اُسے پاس بٹھایا۔

''لیکن باجی......'' وہ کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ خوش بخت نے اُسے خاموش کرایا اور اُس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''دیکھو سب سے پہلے تو مجھے یہ بتاؤ کہ ایک لڑکی کا سب سے بڑا ہتھیار کیا ہوتا ہے؟'' بندیا نے حیران نظروں سے خوش بخت کو دیکھا۔

''پتا نہیں باجی!''

''ارے پگلی! یہ جو تمہارا معصوم حسن، کٹورا آنکھیں ہیں اور یہ پیارا سا چہرہ۔ یہ سب بے کار ہو جاتے اگر اس چہرے کے ساتھ یہ خوبصورت ریشمی زلفیں نہ ہوتیں۔ سچ بتاؤ! تمہاری ماں نے تمہارے بالوں میں کیا جادو کیا ہے جو یہ اتنے حسین اور نفیس، ملائم گھٹاؤں جیسے ہو گئے ہیں۔''

یہ بات سُن کر ایک سایہ سا بندیا کے چہرے پر لہرایا۔ قمری منیار مہمانوں کے استقبال کے بعد جا چکا تھا۔ اب صرف بندیا ہی خوش بخت کے پاس موجود تھی۔

''باجی! میری ماں نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر اُس کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ خوش بخت نے اُسے ساتھ لگا کر پیار کیا۔

''آئی ایم سوری بندیا!''

''کوئی بات نہیں باجی! میں آپ لوگوں کے لیے چائے بناتی ہوں۔'' وہ اُٹھ کر جانے لگی لیکن خوش بخت نے اُسے روک دیا۔

''نہیں بیوٹی کوئن! پھر کبھی...... ہم تمہارے ہاتھ کی چائے پی کر جائیں گے۔ اپنے بالوں کا خیال رکھا کرو۔ یہ تو پھر God Gifted ہوئے نا۔''

''نہیں باجی! بال تو خدا کا تحفہ ہیں مگر ان کا اصل حسن نکھارنے کے لیے انسان ہی خدا کی دی ہوئی عقل کا استعمال کرنے کے لیے محنت کرتا ہے۔''

''کیا مطلب۔''

''ارے باجی! مطلب یہ ہے کہ میرے بال پہلے ایسے نہ تھے۔ ہم غریب لوگ ہیں۔ بالوں کی آرائش پر کتنا خرچ کر سکتے ہیں۔ میرے خوبصورت حسین بالوں کا حسن ہے میرا لائف بوائے شیمپو، باجی یقین کریں میں نے تین سال سے مستقل لائف بوائے شیمپو کا استعمال شروع کیا۔ تو میرے بال خوب سے خوب تر ہوتے چلے گئے۔ دومونہے بالوں کا مسئلہ، بالوں کا روکھا پن اور بالوں کی بے رونقی سب کچھ ختم ہو گیا۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ شیمپو نہیں کوئی جادو ہے، جو ماں سے بڑھ کر بالوں کی Care کرتا ہے۔'' بندیا اپنے بالوں کو سہلاتے ہوئے بولی۔

''مگر یہ لائف بوائے شیمپو تم افورڈ کر لیتی ہو۔'' خوش بخت کا سوال اس دیہی ماحول اور غربت کے لحاظ سے فطری تھا۔

''ارے پیاری باجی! سب سے کم قیمت میں، اصل معیار کے ساتھ صرف لائف بوائے شیمپو ہی ہر ایک کی جیب میں سما سکتا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' خوش بخت چونکی۔

"مطلب یہ ہے کہ باجی اپنی جیب کے حساب سے ہر ماہ لائف بوائے شیمپو ہم بہت آسانی سے افورڈ کر سکتے ہیں۔ آپ ہمارے گاؤں پر نہ جائیں۔ اب اس پسماندہ گاؤں کی ہر ہٹی (دکان) پر لائف بوائے شیمپو موجود ہوگا۔ کیونکہ آج ہی چاچا رحیم بخش نے گاؤں کے دکانداروں کو تنبیہہ کی ہے کہ دو نمبر شیمپو سے بہتر ہے اُس قیمت میں ایک نمبر شیمپو بیچو۔ میرا بابا خود بھی اپنی ہٹی (دکان) پر صرف لائف بوائے شیمپو ہی رکھتا ہے۔ جس کی جیب میں گنجائش ہو وہ بوتل لے لے ورنہ ساشے تو ہے ہی۔ میری جیب میں فٹ صرف ساشے آتا ہے کیونکہ اس ساشے میں شیمپو کی ایک خاص مقدار موجود ہوتی ہے۔ نہ کم نہ زیادہ بالکل پرفیکٹ سو اس لیے باجی میں کہتی ہوں۔

لائف بوائے شیمپو ہٹ۔ ہر ایک کی جیب میں فٹ۔"

اس نے جوش سے کہا تو خوش بخت مسکرا کر رہ گئی۔

اُس نے ہر ایک شیمپو استعمال کیا تھا۔ امپورٹڈ شیمپو کی بات ہی اور ہوتی ہے لیکن اب...... بندیا اُسے ایک نئی دنیا دکھا گئی تھی۔ بندیا کے مقابلے میں اُس کے بال کچھ بھی نہ تھے۔

خوش بخت نے لمحوں میں ایک بہت بڑا فیصلہ کر لیا تھا۔ بلیک ہیئر بیوٹی باہر نہیں اپنے گاؤں میں......

اچانک ہی ایک نئی ڈاکومینٹری فلم بنانے کا منصوبہ طے پا گیا تھا۔

خوش بخت بندیا سے بڑے تپاک سے مل کر رخصت ہوئی تھی اور بہت جلد اُس سے گاؤں میں دوبارہ ملنے کا وعدہ کر گئی تھی۔

☆......☆......☆

آج پورے دو ماہ بعد خوش بخت ایک نئے عزم اور کامیابی کے نئے منصوبوں کے ساتھ بندیا کے گاؤں میں داخل ہوئی تھی۔ قمری منیار سے مل کر سب سے پہلے اُسے اپنی آمد کا مقصد بتانا تھا۔

قمری منیار سے ملاقات کے بعد خوش بخت نے بتا دیا تھا کہ وہ کیوں اور کس مقصد کے تحت دوبارہ اس کی دہلیز پر موجود ہے۔ قمری نے سب سے پہلے بندیا سے پوچھا کہ اُس کی کیا رائے ہے۔ اسکرین پر آ کر گاؤں والے بندیا کو کبھی اس گاؤں میں قبول نہ کرتے کیونکہ

قمری منیار کھلے دل اور ذہن کا انسان تھا۔ بیوی داغ مفارقت دے گئی تو بندیا سات سال کی تھی۔ مگر قمری نے کسی کے دباؤ میں آ کر دوسری شادی نہ کی تھی کہ وہ اکیلا اپنی بیٹی کو پال سکتا ہے۔

آج پھر سے وقت اُسے دوراہے پر لے آیا تھا۔ خوش بخت نے بندیا کے مستقبل کی ذمہ داری اُٹھا کر قمری منیار کی ساری سوچیں اور فکریں ختم کر دی تھیں۔ مگر...... وہ کیسے بھول جاتا کہ وہ ایک بن ماں کی بیٹی کا باپ ہے۔

ڈاکومینٹری فلم کا نام رکھا گیا تھا۔ "لائف بوائے...... اصلی ہیروں کی کھوج لائے"۔

اس فلم میں مرکزی کردار بندیا ادا کر رہی تھی۔ مگر بندیا کا اصل نام یہ نہ تھا۔ وہ تو گوری ناتھا خان تھی اور قمری منیار...... قمر ناتھا خان تھا۔

خوش بخت نے فلم کا آغاز ریشمی کالی گھٹاؤں سے بالوں والی گوری کی خوبصورت زلفوں سے ہی کیا تھا۔ تیزی سے کام جاری تھا۔

گاؤں والے عجیب عجیب طرح کی باتیں بنا رہے تھے۔ ندیم شان جو کہ خوش بخت کا بھائی تھا۔ کیمرہ مین کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ جیسے جیسے فلم اختتام کی جانب بڑھ رہی تھی اُس کے دل میں گوری کی محبت کا پودا جڑیں پکڑتا جا رہا تھا۔

"یہ دنیا بہت Materialist ہو گئی ہے۔ سب اپنا فائدہ دیکھتے ہیں لیکن کچھ لوگ اسمِ باسمیٰ ہوتے ہیں جیسے خوش بخت...... خوش بخت نے اس گاؤں کی سیدھی سادھی لڑکی کے لیے بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ اس کنول کو وہ پوری دنیا کے سامنے دکھانا چاہتی تھی کہ ابھی خدا بندوں سے ناامید نہیں ہوا۔ بس تھوڑی سی Care بہت کچھ بدل سکتی ہے۔"

یہی اُس کی فلم کا سلوگن تھا۔

انٹرنیشنل فلم فیسٹیول میں منتخب ہونے والی اس ڈاکومینٹری فلم نے Best Film کا ایوارڈ جیت کر گوری کو راتوں رات اسٹار بنا دیا تھا۔ آج گوری کامیابی کے مینار پر کھڑی تھی۔ اُسے سب کچھ بہت عجیب لگ رہا تھا۔ اُس کا محبت کرنے والا بابا اُس کی اتنی بڑی خوشی کو برداشت نہ کر پایا تھا اور جس روز اُسے بین الاقوامی طور پر سراہا گیا ایک ہارٹ اٹیک اُسے بیٹی کی آسمان چھوتی

کامیابی کے ساتھ محوِ سفر کر گیا تھا۔

گوری کو Life Buoy Diamond Girl کے لقب سے پکارا گیا تھا۔ کیسی انہونی تھی کہ اس خوشی نے اُسے عظیم دکھ سے بھی دوچار کر دیا تھا۔ ماں کے بعد اس کا واحد سہارا اُس کا باپ، اس کا بابل اُسے بھری دنیا میں تنہا چھوڑ گیا تھا۔

ایسے موقع پر جب گوری اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہی تھی، خوش بخت نے اُسے بڑھ کر تھام لیا تھا۔ اب وہ مکمل طور پر خوش بخت کے اختیار میں تھی۔ وہی اس کی سرپرستی کے فرائض انجام دے رہی تھی۔

☆......☆......☆

رات جب وہ بستر پر لیٹی تو جانے کہاں سے اماں اور بابا خواب میں آ گئے۔

وہ پانی سے بھرا مٹکا اٹھائے بمشکل گھر میں داخل ہوئی تھی۔ سات برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ گھر کچا تھا مگر صاف ستھرا تھا۔ گھر میں داخل ہوئی ہی تھی کہ اُس نے سامنے چارپائی پر پڑی تڑپتی ہوئی ماں کو دیکھا تھا۔ اور اس حالت میں اُسے تڑپتا دیکھ کر اُس کے حواس معطل ہو گئے تھے۔

''اماں......اماں......'' وہ چلانے لگی تو اُس کی درد ناک چیخوں سے کچے در و دیوار ہل گئے۔ آس پڑوس والے جمع ہو گئے مگر نور فاطمہ درد کی شدت سے بے حال تھی۔ اچانک ہی اپنڈکس کے درد نے اُسے اَدھ موَا کر دیا تھا۔ گاؤں میں سہولیات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ چھکڑا گاڑی میں بیٹھ کر تو اچھے سے اچھا مریض بھی اپنی موت کو دعوت دے دیتا ہے۔ تو بھلا تڑپتی، بلکتی نور فاطمہ کیسے زندگی کا گوہر پا سکتی تھی۔

قمر شہر کے لیے نکل گیا تھا۔ شام کے دیوں میں روشنی کی رمق جاگی تو قمر کی واپسی ہوئی تھی۔ مگر...... یہ کیسی اُداس اجڑی شام تھی۔ جس میں دن کی تھکن اُتر رہی تھی۔ رات کے اندھیرے شام کو دیوں کو کھا رہے تھے۔ اندھیرا اور گہرا ہوتا جا رہا تھا اور پھر جلد ہی قمر پر اس بھیانک عفریت کی حقیقت واضح ہو گئی۔

نور فاطمہ اس کی اور گوری کی زندگی سے اپنی روشنی کا دیا دوگز زمین کے اندر روشن کرنے کو لے گئی تھی۔

''......ابا! اماں!!'' وہ چیخ مار کر اٹھی تھی۔

''اماں......ابا......ابا...... کہاں ہو تم؟'' پسینے سے شرابور وہ بھا نبڑ بھا نبڑ جل رہی تھی۔

خوش بخت اُس کی چیخ سُن کر دوڑی چلی آئی تھی۔

''کیا ہوا؟ میری جان بتاؤ نا...... کیا بات ہو گئی؟''

خوش بخت کے پیچھے چندا بوا بھی کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ اُن کے ہاتھ میں دم کیا ہوا پانی کا گلاس تھا اور وہ مسلسل پڑھ پڑھ کر گوری پر پھونک رہی تھیں۔ گوری کی حالت پانی پی کر بحال ہو گئی تھی۔ اب وہ بہتر محسوس کر رہی تھی۔

''میں ہوں نا تمہارے پاس۔ چلو شاباش! Cheer Up۔'' وہ اُسے سینے سے لگائے ہوئی بولی تھی۔

''بٹیا...... تم ڈر گئیں۔ یہ درگاہ کا دھاگہ ہم تمہارے ہاتھ پر باندھ رہے ہیں۔ انشاء اللہ کرم کرے گا۔''

چندا بوا نے لال دھاگہ اُس کی کلائی پر باندھ دیا تھا۔ علی شان بھی منہ بسورتا کمرے میں آ گیا تھا۔

خوش بخت کے دو ہی بھائی تھے۔ ایک علی شان ایک ندیم شان...... ندیم شادی شدہ تھا۔ سویرا سے اس کی ارینج میرج تھی۔ مگر دونوں میں ذہنی ہم آہنگی مفقود تھی۔ کیونکہ ازدواجی زندگی کو لگنے والی دیمک شک ہوتا ہے اور سویرا کے اندر شک کا دیمک کھرچ کھرچ کر اس کی روم روم میں اپنی جگہ بنا چکا تھا۔ وہ فطرتاً ایسی ہی تھی اس لیے کیا کرتی۔ میاں خوبصورت ہو تو بیوی کو لاکھ دھڑکے ویسے ہی لگے رہتے ہیں۔

جانے کس وقت اُس کی نیّا میں سوت کا پاؤں آ جائے اور ازدواجی کشتی ڈوبنے لگے...... سوچ پر پہرے نہیں بٹھائے جا سکتے۔ مگر سویرا ندیم کے لاکھ لاکھ یقین دلانے کے باوجود بھی اس 'خوفِ سوتن' سے چھٹکارہ نہ پا سکی تھی۔

سویرا بھی کم حسین نہ تھی مگر ندیم شان کے آگے اُس کا حسن دب جاتا تھا اور بس وہ اپنے احساسِ کمتری میں مبتلا ایک جانب ہو جاتی اور اُس کا جی چاہتا کہ وہ ندیم شان کو اپنی مٹھی میں بند کر لے۔

وہ یہ نہ جانتی تھی کہ مٹھی زیادہ دیر بند رہے تو تنفس کی کمی انسان کی جان لے لیتی ہے اور محبت کو ہر دم تازہ آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے، جو محبت کے حسن کو قائم رکھتی ہے اور محبت کا پھول ہر دم اپنی مہکار سے تر و تازگی اور فرحت بخشتا رہتا ہے۔

دوسرا بھائی علی شان بھی پچیس برس کا تھا اور بی ایس سی فائنل کا ایگزام دے کر میڈیکل کے شعبے پر احسانِ عظیم کرنے جا رہا تھا۔

ندیم جتنا سوبر، بردبار تھا علی شان اتنا ہی چلبلا اور شریر تھا۔

ندیم شان نے جب پہلی بار گوری عرف بندیا کو دیکھا تو اُس کے چمکیلے بال اُسے اپنی زلفِ گرہ گیر کا اسیر بنا گئے تھے۔ وہ چاہ کر بھی ان گھنیری زلفوں کی قید سے نہ بچ پایا تھا۔ سویرا سے شادی، اس کو زندگی کا بھیانک سچ لگنے لگا تھا۔ اس سے وہ گھر والوں کے آگے مجبور تھا۔ شادی مجبوری نہیں تھی کیونکہ اُسے نہیں معلوم تھا کہ سویرا کی شکی عادت اُس کی زندگی عذاب بنا دے گی۔ مگر اب وہ سویرا سے فرار چاہتا تھا۔ وہ اس کی تھانیدار خصلت کو ناپسند کرتا تھا۔ اُس نے جو فیصلہ گوری کو دیکھ کر کیا تھا۔ اُس پر عملی جامہ پہنانے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ اب وہ سویرا کو جھیل نہیں رہا تھا بلکہ اُس سے جان چھڑانے کے لیے دن گن رہا تھا۔

☆.........☆☆.........☆

پہاڑوں کی گپھاؤں میں
کسی نے جستجو جلا کے رکھی تھی
اور انتظار کے لیے
سمے کی انتہا ہٹا کے رکھی تھی
عبادتیں تراشیں پتھروں پر اور گھر بنا لیے خیال کی پناہ کے لیے
بس اِک امید کے گناہ کے لیے

آج بہت اہم Even تھا۔ خوش بخت کی فلم کو بیسٹ ڈاکومینٹری فلم کا ایوارڈ مل رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک لاکھ ڈالر کا کیش پرائز بھی تھا۔ خوش بخت نے کیش پرائز اپنے اور گوری کے ساتھ ففٹی ففٹی بانٹ لیا تھا۔

”گوری...... تم ملنے والی اس رقم کا کیا کرو گی۔“ خوش بخت نے دلار سے پوچھا تھا۔

”باجی! میں اس رقم سے اپنے گاؤں میں ہیلتھ سینٹر تعمیر کراؤں گی تاکہ صحت کا حصول ہر انسان کے لیے اُس کی دسترس میں ہو۔ کسی اور کو گوری کی ماں اور باپ کی طرح صحت کی بنیادی سہولیات میسر نہ ہونے کی صورت میں موت کو گلے نہ لگانا پڑے۔“ یہ کہہ کر گوری پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ چندا بوا اور علی شان بھی اُسے چپ کرانے لگے تھے۔

”گوری بٹیا...... اللہ خیر کرے، تیری یہ خواہش بھی ضرور پوری ہوگی۔ تُو بس جی چھوٹا نہ کر بٹیا۔“ اتنے میں ہال کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور سویرا کسی طوفان کی طرح کمرے میں داخل ہوئی۔

”کیا سمجھتی ہے تُو لمبے بالوں والی چڑیل۔ میرے میاں کو اپنے بالوں کے جادو میں پھانس لے گی۔ میں تیرا خون پی جاؤں گی۔ آوارہ...... اپنے گھروں کو چھوڑ کر دوسروں کے گھروں کو خراب کرنے آ جاتی ہیں بے غیرت عورتیں۔“

اِس افتاد کے لیے تو کوئی بھی تیار نہ تھا۔ نہ ہی کبھی کسی نے ایسا سوچا تھا۔ یہ اچانک کیا ہو گیا تھا؟ خوش بخت تو زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ ایسے میں چندا بوا نے اپنے حواس بحال کیے۔

”ارے چندا! میری بچی! سویرا بٹیا ہوش میں آؤ۔ کیا واہی تباہی بکے جا رہی ہو بٹیا...... کیا ہو گیا ہے ایسا کہ تم تو علی علی کرتے ہم پر چڑھ دوڑیں۔“ بوا نے سویرا کو اپنے ہاتھوں میں بھرا۔

”خوش آپا! میں اپنے میاں کو اِس ناگن کا نہیں ہونے دوں گی۔“ سویرا دہاڑی۔

”ارے بھابی! بات کیا ہے۔ پتا تو چلے۔“ علی شان بھی بول پڑا۔

”پوچھو اپنی اس چہیتی سے۔ کیا گھول کر پلا رہی ہے میرے میاں کو...... رات کہہ رہے تھے کہ تم دن گن لو۔ میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا جلد ہی Divorce دے کر جان بخشی کرا لوں گا۔ ارے بتاؤ اتنے عرصے کا ساتھ اس چڑیل کے آتے ہی برا لگنے لگا۔“ اس سے پہلے کہ سویرا مزید بکواس کرتی خوش بخت بول پڑیں۔

”بس سویرا! ختم کرو یہ ڈرامہ...... میں ندیم سے بات کروں گی۔ اور ہاں...... آئندہ یہاں آتے ہوئے دھیان رکھنا کہ یہ تمہارا گھر نہیں ہے۔ یہ گھر میرا ہے۔ اور تمہارا گھر وہ ہے جس میں تم رہتی ہو۔ ایٹی کیٹس سیکھو۔ میرے ہی گھر میں تم نے مجھے ذلیل کر دیا۔ اس یتیم مسکین

بچی پر اتنے الزام لگاتے تمہیں شرم نہ آئی۔ اب میں تم سے یہ بات بیانگ دہل کہہ رہی ہوں کہ اگر تم نے اپنا رویہ چینج نہ کیا تو تمہاری کوئی حیثیت نہ رہے گی اور نہ ہی تم 'اپنے' گھر کا سکون پا سکوگی۔ او کے...... اچھی طرح اپنے ذہن میں یہ بات بٹھا لو...... امید ہے آئندہ تم اپنی حدود کراس نہیں کروگی۔ اب تم جاسکتی ہو۔ آئندہ اِس طرح' اِس گھر میں قدم رکھنے کی تم کو اجازت نہیں۔''

خوش بخت نے فیصلہ کیا اور بغیر یہ دیکھے کہ سویرا پیر پٹختی باہر جارہی ہے۔ گوری کو لے کر اپنے کمرے میں آگئیں۔

☆......☆......☆

گوری نے رقم ملتے ہی علی شان، ندیم شان اور خوش بخت کی پشت پناہی پر گاؤں میں ہاسپٹل کی تعمیر شروع کرادی تھی۔ خوش بخت کی فلم نے ایوارڈ پاتے ہی گوری کے مشن کی تکمیل کا سُن کر دیگر این جی اوز کو بھی اس جانب متوجہ کرلیا تھا۔ تیزی سے اسپتال کی تعمیر جاری تھی۔ ایک چھوٹا سا منصوبہ اب ایک بہت بڑے پراجیکٹ میں تبدیل ہوگیا تھا۔ وہ دن بھی جلد ہی آپہنچا جب اسپتال کا افتتاح ہونا تھا۔

آج ہی اُسے Best Style Awards کے لیے Nominate ہونے کا انویٹیشن کارڈ بھی موصول ہوا تھا۔ وہ کارڈ ہاتھوں میں لیے اپنے آنسو بہا رہی تھی۔

کل 14 اگست تھی اور گوری اپنے اس ہاسپٹل جیسے عظیم مقصد کی تکمیل اور بیسٹ ایکسٹرا ایوارڈ کی کامیابی پر آنکھوں میں آنسو لیے اپنے والدین کو یاد کررہی تھی کہ اچانک ہی موبائل بجنے لگا۔

اُس نے موبائل اٹھایا تو دوسری جانب سویرا تھی۔ جو اُسے بڑے بڑے القابات سے نوازتی جارہی تھی اور اس کی باتیں سن کر گوری کے ماتھے پر شکنوں کا جال پھیلتا جارہا تھا۔ تنگ آکر اُس نے موبائل آف کرکے صوفے پر اچھال دیا تھا۔

اُسے اب اپنی دراز زلفوں کو لائف بوائے شیمپو سے مزید نکھارنا، سنوارنا تھا۔ اُس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ بھی ندیم شان کی ہم قدم بن کر، ہم سفر بن کر اپنے ہاسپٹل میں قدم رکھے گی۔ اُس کے قدم اپنے کمرے کی جانب تھے...... جبکہ اور علی شان مسکراتے ہوئے اُس کے عزم کو

سلام کررہے تھے۔

☆......☆......☆

پورا ہال بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ ہر چہرہ روایتی چمک لیے موجود تھا۔ اور اُن سب کے درمیان گوری ناتھا خان اپنے اعتماد کے ساتھ براجمان تھی۔

اب باری ہے بیسٹ کریٹک ایوارڈ کی۔ جس کے لیے ہم بہت احترام سے پکاریں گے اپنی ''لائف بوائے ڈائمنڈ گرل'' میں ''گوری ناتھا خان'' کو...... پنڈال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ ساری لائٹس کے جھماکے گوری پر تھے۔

اس کے ساتھ ہی لائف بوائے شیمپو کے ذریعے گاؤں میں اپنے سیاہ بالوں سے اجالا کرتے ہوئے گوری کو اسکرین پر دکھایا جارہا تھا۔ گوری خوش بخت اور ندیم شان کی معیت میں اسٹیج پر آئی۔

''تھینک یُو خوش بخت آپا! تھینک یو ندیم! آئی لو مائی لائف بوائے...... تھینک یُو لائف بوائے شیمپو! آج میں تمہاری ہی وجہ سے اس جگہ کھڑی ہوں۔ اگر تم نے ہوتے تو یہ بال......'' گوری نے ایک جھٹکے سے اپنے بال لہرائے۔

''تو یہ بال نہ ہوتے اور بال نہ ہوتے تو میں اِس ڈاکومینٹری فلم کا حصہ نہ بنتی اور نہ ہی میرا گاؤں ایک بہترین ہاسپٹل اپنے نام کرا پاتا۔ آج میں بہت خوش ہوں کہ میرے لائف بوائے شیمپو نے میرا اور میرے والدین کا نام فخر سے بلند کردیا ہے۔'' کمپیئر نے سوال کیا۔

''گوری جی! آپ کے ہاسپٹل کا نام کیا ہے۔''

''میرے ہاسپٹل کا نام ہے Life Buoy Apna Hospital...... جس طرح لائف بوائے شیمپو سب کی دسترس میں ہوسکتا ہے، اس طرح لائف بوائے اپنا ہاسپٹل بھی سب کا ہے۔''

پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا تھا اور اس پُرعزم لڑکی کے اعتماد پر فخر کررہا تھا۔ سویرا کا آسیب ندیم شان نے کل طلاق کی صورت اتار پھینکا تھا اور آج وہ گوری کا ہاتھ تھامے مطمئن تھا کہ دونوں کی رضامندی کو خوش بخت نے شادی کے بندھن میں باندھنے کی حامی بھری تھی۔

اسٹیج پر لگی اسکرین پر خوب چمک رہا تھا۔

''لائف بوائے...... اصلی ہیروں کی کھوج لائے۔''

☆☆☆......☆☆☆

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں، جو دھڑکنیں بے ترتیب کر دیں گی
رفعت سراج کے جادوگر قلم سے، نئے سلسلے وار ناول کی آٹھویں کڑی

چمن آہستہ آہستہ چلتی بانو آپا کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔
''امی! اثمر غصے میں تھے۔ کبھی کبھی اُن کو بہت زیادہ غصہ آ جاتا ہے۔ اگر انہوں نے غصے میں مجھے گھر سے جانے کو کہہ دیا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں سچ مچ گھر سے نکل جاؤں۔'' چمن نے برداشت کی آخری

چوٹی پر بمشکل خود کو لڑکھڑانے سے روکا اور بہت سکون سے بات کی۔

''ارے تو کیا پیار سے گھر چھوڑنے کو بولے گا۔ آج تک پیار محبت میں بھی کبھی کسی نے بیوی کو طلاق دی ہے۔ یہ آخری کام تو غصے میں ہی ہوتا ہے۔''

بانو آپا کے نزدیک وہ ڈھٹائی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ امید و امکانات معدوم دیکھ کر انہوں نے نئے سرے سے کمر کسی اور اکھاڑے میں اتر گئیں۔

'طلاق...... آخری کام؟' چمن نے حق دق ہو کر بانو آپا کی شکل دیکھی۔

''یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ جو کچھ آپ چاہتی ہیں، وہ ثمر کی خواہش ہرگز نہیں ہے۔ وہ اکثر غصے میں بھڑک اٹھتے ہیں مگر سوری بھی کر لیتے ہیں۔'' چمن نے اپنا لب و لہجہ بہت مہارت سے کنٹرول کر کے جواب دیا۔

''بس بی بی! اب وہ دن لد گئے۔ جب خلیل خان فاختہ اڑاتے تھے۔ اب کوئی سوری ووری نہیں ہوگی۔ وہ صبح جاتے ہوئے مجھے کہہ گیا ہے کہ شام کو گھر واپس آؤں تو یہ منحوس شکل گھر میں دکھائی نہ دے۔ بہت لحاظ کیا کہ ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر نہیں نکالا۔ چلو...... نکلو...... میرے بیٹے کو ذلیل کرتی ہے...... اور پھر انتظار کرتی ہے کہ وہ اس سے سوری بولے گا۔ ارے اب تم ایک ٹانگ پر کھڑی ہو کر معافی مانگو تو بھی وہ تمہاری طرف پلٹ کر نہیں دیکھے گا۔ یہی سکھایا ہے ماں نے...... جہاں بیٹھو وہاں حرام لقمہ توڑو۔ جس کی کمائی پر عیش کرتی ہے اسی کو گالی دیتی ہے۔''

بانو آپا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ چوٹی سے پکڑ کر باہر نکال دیں۔ اللہ اللہ کر کے تو یہ دن دیکھے تھے۔ آخر شاہ جی کے تعویذ، چینی، ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر کیا گیا چلّہ کام آ ہی گیا تھا۔

''امی جان! اس دور میں یہ عام سی بات ہے۔ کیا کسی انسان کو کوئی پرابلم'' نہیں آ سکتی؟ بے عیب تو صرف اللہ کی ذات ہے۔''

''خاموش...... اب بے وقوف بنانے کے لیے کوئی اور گھر دیکھو۔ اپنا عیب چھپانے کے لیے میرے بچے کو ذلیل کرتی ہے۔ ایک نمبر کی مکار ہے...... میرے منہ لگنے کی ضرورت نہیں۔ یہ Ph.D اپنی ماں کو پڑھاؤ جا کر۔ شرافت سے نکل جاؤ۔ ثمر نے آ کر دھکے دیے تو لوگ تماشا دیکھیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ جانے کو پلٹیں۔

''ابھی میں آپ کے سامنے ان سے بات کرتی ہوں۔ اس طرح سے تو نہیں جاؤں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے آگے بڑھ کر اپنا سیل فون اٹھایا اور ثمر کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ بانو آپا تذبذب کی کیفیت میں رُک کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ دل انجانے خدشات میں گھرنے لگا۔

''ائے ہئے...... کہیں اس کم بخت کو روک ہی نہ لے۔''

''چمن نے نمبر ڈائل کیا اور سیل کان سے لگا لیا۔ Ring پاس ہو رہی تھی اور ہر Ring پر اس کا دل اچھل کر حلق تک آ رہا تھا۔ ثمر نے کال ریسیو نہیں کی ریکارڈنگ شروع ہو گئی تھی۔

چمن کا ہاتھ یوں گرا جیسے آخری ضرب پر درخت جڑ سے اکھڑتا ہے۔

''دیکھ لیا...... بی بی...... بھلائی اور عزت اسی میں ہے کہ چپ چاپ نکل جاؤ۔ بس اتنے ہی دن کا دانا
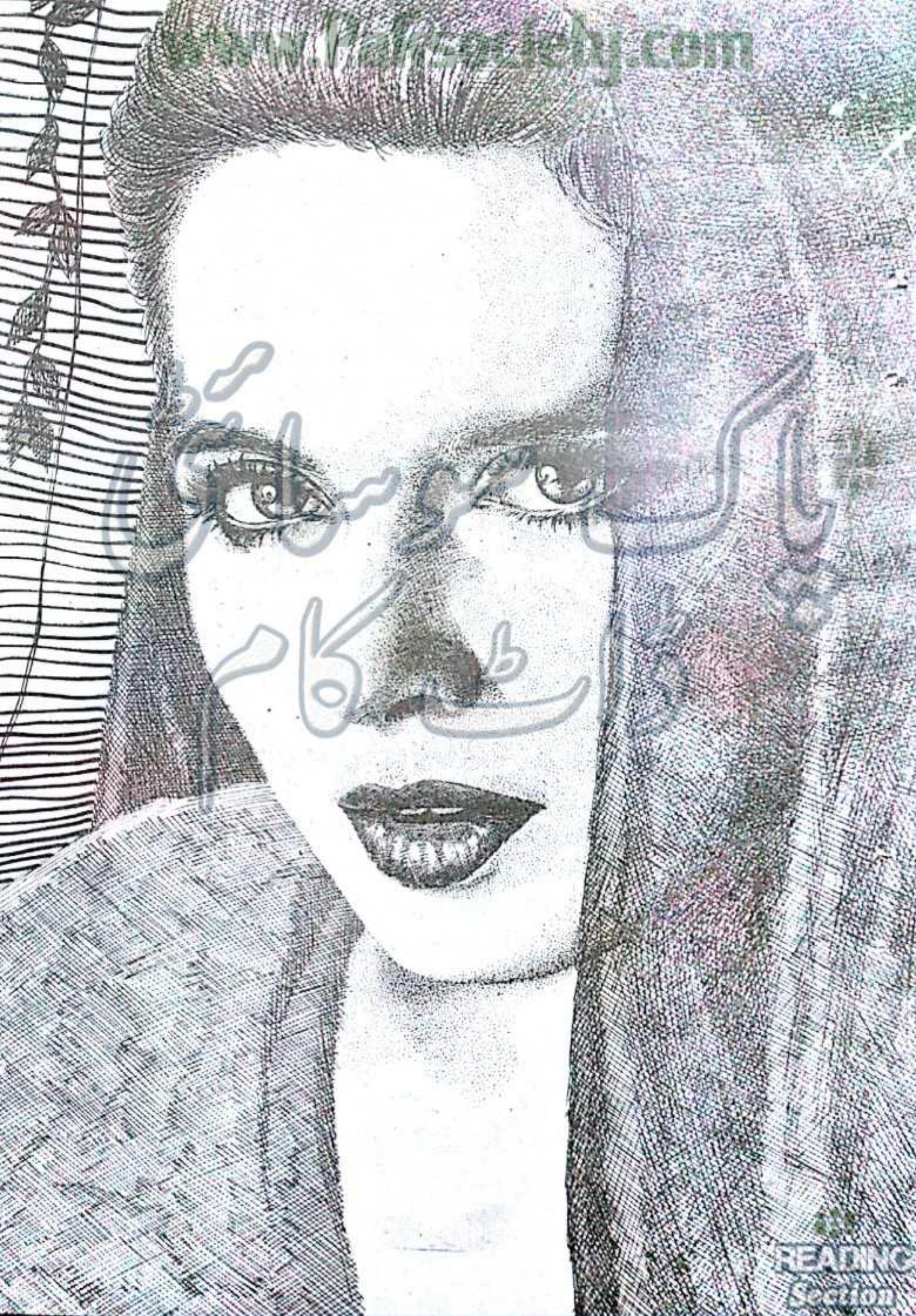
پانی لکھا تھا یہاں ...... اب باپ کے گھر عیش کرو۔'' یہ کہہ کر وہ تو چلتی بنیں۔ چمن پتھر کے بُت کی طرح اپنی جگہ گڑ کر رہ گئی۔

☆......☆......☆

بانو آپا نے چمن سے دو دو ہاتھ کر کے پہلی فرصت میں بیٹی کو فون ملایا اور کامیابی کی خوش خبری سنائی۔ افشاں کی تو مارے خوشی کے زبان ہی گنگ ہوگئی۔ جیسے ہی اوسان بحال ہوئے شک و بے یقینی کی کیفیت نے حملہ کر دیا۔

''رہنے دیجیے امی جان! آپ تو ذرا ذرا سی بات پر خوش اُمید ہو جاتی ہیں۔ پتا نہیں بھائی نے کیا کہا آپ نے کیا سنا۔ بھائی تو بھابی کے بے دام غلام ہیں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اتنی آسانی سے بھابی کو گھر سے جانے کے لیے کہہ دیں۔'' اس کے آخری الفاظ نفرت کی چنگاریوں کا استعارہ تھے۔

''ارے...... تیری جان کی قسم افشاں! اللہ نے تمہاری سن لی۔ تُو گھر تو آ۔ دونوں مل کر اسے گھر سے باہر کرتے ہیں۔ ابھی تو ڈھیٹ ہڈی بنی بیٹھی ہے۔ ثمر کے گھر آنے سے پہلے پہلے یہ کام کرنا ہے۔ ایسا نہ ہو وہ گھر آئے اور یہ کوئی تعویذ پانی میں گھول کر پلا دے اور وہ اپنا فیصلہ بدل ڈالے۔'' بانو آپا جذبات کی تندی میں کف اڑانے لگیں۔

'جان کی قسم'، افشاں تو حق دق رہ گئی۔ وہ جانتی تھی اس کی ماں اس کی جان کی قسم کبھی بھی بے سوچے سمجھے نہیں کھا سکتی۔ اس کی جان تو افشاں میں اٹکی رہتی تھی۔

''کیا بھائی نے سچ مچ فیصلہ سنا دیا؟'' وہ سناٹے میں تھی۔

''ارے صاف صاف...... اور کیوں نہ سنائے۔ اس نے شوہر کو وہ ننگی گالی دی ہے۔ جو کوئی بھی غیرت مند مرد برداشت کر ہی نہیں سکتا۔'' بانو آپا نے اس وکیل کی طرح دلیل دی جو کیس کی پوری تیاری اور ثبوت کے ساتھ عدالت میں آیا ہو۔

''اگر گالی دی ہے تو پھر واقعی کچھ ہو گیا ہے۔ اس کی اتنی ہمت کہ میرے بھائی کو گالی دے؟''

''اور آپ اتنا صبر کس خوشی میں کر رہی ہیں۔ دھکے دے کر گھر سے باہر کیوں نہیں نکالا۔ آپ بھی کچھ زیادہ ہی نرم دل ہیں۔'' افشاں تو لفظ گالی سُن کر مزید بحث و مباحثے کی دوکان بڑھا گئی تھی۔ اب تو مارے طیش کے اس کا B.P شوٹ کرنے لگا تھا۔

جنک فوڈز اور مرچ مسالے کھا کھا کر B.P ہائی کا عارضہ لگا لیا تھا۔ ماں کو بتاتی تھی کہ ساس اتنا Stress دیتی ہیں کہ میرا B.P ہائی رہنے لگا ہے۔ اور خدا لگتی یہ تھی کہ ساس بہت باوقار و خاموش طبع تھیں۔ تیز طرار افشاں کو سمجھتے ہی وہ کنارے پر ہو گئی تھیں کہ اپنی عزت اپنے ہاتھ۔

''کیا کروں! انسانیت بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ پانچ سال سے ساتھ رہ رہی ہے۔ بدنصیب نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماری ہے۔''

بانو آپا نے بیٹی کی نظر میں اپنی کھوکھلی ساکھ پر مزید ملمع چڑھانے کی کوشش کی۔

''انسانیت ...... اسے تو میں آ کر بتاتی ہوں۔ میرے بھائی کو گالی دیتی ہے اور ابھی بھی جم کر خم ٹھونک کر بیٹھی ہے۔''

افشاں کو سلگانے بھڑکانے کی کوشش سو فیصد کامیاب جارہی تھی۔ اب وہ اڑان کے لیے پر تول چکی تھی۔

عہد سلیمانی کا وہ جن بن جانے کو جی چاہتا تھا جو ملکۂ سبا کا تخت پلک جھپکتے میں دربار سلیمانی میں لے آیا تھا۔

اس کا بھی جوش اس عالم میں تھا کہ پل میں چمن کو گھر سے باہر کرے۔

''امی جان بس میں ابھی آئی۔ اب ساس صاحبہ کو بھی تو رام کرنا ہے ورنہ بیٹے کو دل سے جوڑ جوڑ کر خبریں دیں گی۔'' افشاں نے بے قراری سے کہا۔ ایک ایک پل شاق گزر رہا تھا۔

''اے...... بیٹا! اسی (80) برس کی تو خیر سے ہو رہی ہیں۔ لگتا ہے قیامت کے بوریے یہی سمیٹیں گی۔ تمہاری دیورانیاں بہت چالاک نکلیں۔ ساس کو تمہارے سر لگا کر خود امریکہ بھاگ گئیں۔ منحوس وہاں عیش کر رہی ہیں، میری بیٹی بیٹھی خدمتیں کر رہی ہے۔

''بس آجاؤ! جلدی نکلو۔ میں راہ دیکھ رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر بانو آپا نے فون بند کر دیا۔

''یہ قضیہ شام سے پہلے پہلے نمٹانا ہے۔ قسمت بار بار دروازے پر دستک نہیں دیتی۔ اُس سے بڑا جاہل کون جو موقع سے فائدہ نہ اٹھائے۔'' وہ بڑبڑا رہی تھیں۔

☆......☆......☆

چمن ایک بڑے سے بیگ میں اپنے کپڑے اور ضروری چیزیں رکھ رہی تھی۔

بے اولادی کے طعنے...... ہر وقت کی خدمت کے باوجود ماحول آئے دن مکدر ہو جاتا تھا۔

ایک مرتبہ جا کر دکھانا تو ہوگا۔ یہ آگ کا دریا تو پار کرنا ہوگا۔ تاکہ یہ آئے روز کی چخ چخ تو بند ہو۔ ثمر کو ٹھنڈے دماغ سے غور و خوض کرنے کا موقع ضرور دینا چاہیے۔

میری رپورٹس ٹھیک ہیں اور مجھے مجرموں کی طرح رہنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ ساس کے ہاتھوں ناحق ذلت اٹھانے کے بعد چمن نے بھی ایک جرأت مندانہ فیصلہ بالآخر کر ہی لیا تھا۔

☆......☆......☆

اس نے ایک بیگ میں چند ضروری چیزیں اور پانچ چھ جوڑے کپڑوں کے رکھے تھے اور باقی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ثمر ہر ماہ ایک مخصوص رقم پاکٹ منی کے طور پر دیا کرتا تھا جو جمع ہوتی رہتی تھی لاکھ ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہو چکی تھی، اُس نے وہ اپنے ہینڈ بیگ میں ضرور رکھ لی تھی کیونکہ اس رقم پر اسے کلی اختیار حاصل تھا۔

ثمر بھی گھر میں کیش رکھتا تھا مگر اس نے ثمر کی رقم کو آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ تیاری مکمل ہونے کے بعد وہ کمرے سے باہر آئی ہی تھی کہ افشاں کی آواز کانوں میں پڑی۔ اُس کی آواز سنتے ہی اُس نے کلمۂ شکر ادا کیا اور اپنے بروقت فیصلے پر مطمئن ہوئی۔ اگر یہ فیصلہ نہ کرتی تو کچھ بعید نہیں تھا کہ دونوں ماں بیٹی دھکے دے کر اسے گھر سے نکال دیتیں۔

اب وہ بڑے بھرم اور دھڑلے کے ساتھ ان کے حساب سے اس گھر کو لات مار کر جا رہی تھی۔

''امی جان! لوگ بے غیرتی کے ساتھ ڈٹے بیٹھے ہیں یا دفعان ہو گئے؟''

بانو آپا جو بیٹی کی آواز سن کر گرتی پڑتی کمرے سے باہر آرہی تھیں۔ چمن سے آمنا سامنا ہونے پر اپنی جگہ ٹھٹک گئیں۔ اس اثناء میں افشاں بھی سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ اب دونوں چمن کی طرف خون آشام نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

''بہت عیش کر لیے...... بس عیش ہی کرنے آئی تھیں۔ نہ ہمارے کسی کام کی نہ ہمارے بیٹے کے...... جو حرام لقمے توڑ کر جا رہی ہو...... زندگی بھر یاد رکھنا...... ہم نے تو گھاٹے کا بیوپار کیا تھا۔ آٹھ دس لاکھ شادی پر خرچہ کیا۔ پندرہ بیس لاکھ میرے بچے نے ان پانچ سالوں میں برباد کیے ہوں گے۔''

''چھوڑیے امی جان! اب قصہ ختم ہوگیا۔ جان چھوٹ گئی ہماری۔''

افشاں نے اپنی دانست میں تھوڑی بہت انسانیت دکھانے کی کوشش کی۔ چمن نے اتنی بھرپور نشانہ بازی پر تلملا کر دونوں کی طرف دیکھا۔ چند لمحے کچھ سوچا پھر بیگ فرش پر رکھ کر اپنا شولڈر بیگ کھولا اور وہ پڑیا نکالی جو صفائی کے دوران بانو آپا کے کمرے سے ملی تھی اور جس میں اس کے کٹے ہوئے بال تھے۔

بانو آپا تو چمن کے ہاتھوں میں وہ پڑیا دیکھ کر ششدر رہ گئیں۔ چند لمحوں کے لیے اعصاب معطل ضرور ہوئے۔ مگر جھوٹے اور مکار انسان جنگ کے امکانات پر یقین رکھتے ہیں اور اپنے گھوڑے تیار رکھتے ہیں البتہ افشاں کی آنکھوں میں اُلجھن کے تاثرات تھے۔ مزید کیا کہنا تھا وہ بھول گئی تھی۔

چمن نے پڑیا کھول کر کٹے ہوئے بال دونوں کے سامنے کیے۔

''شکر ہے یہ میرے کٹے ہوئے بال کسی کافر مشرک کے اڈے پر نہیں پہنچے اور آپ لوگوں کے ایمان برباد ہونے سے بچ گئے۔ ورنہ آپ لوگ تو یہی سمجھتے کہ آپ کے عامل کامل بابا کے جادو میں اتنی طاقت ہے کہ کسی بھی بے گناہ کو دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ پھر بھی احتیاطاً آپ دونوں ماں بیٹی کسی دینی متقی پرہیزگار عالم کے ہاتھ میں دوبارہ اسلام قبول کر لیجیے۔'' دنیا کی نعمتیں یہیں رہ جائیں گی۔ ساتھ تو ایمان ہی جائے گا۔''

''ہائے میری ماں! اتنی چالاک، مکار لڑکی...... ارے افشاں مجھے سالو (سنبھالو) میرے تو پاؤں تلے زمین سرک رہی ہے۔ دیکھا تم نے پارلر میں بال کٹوا کر پڑیا میں باندھ لائی۔ ہمیں ذلیل کرنے کے لیے اب یہ جھوٹے الزام لگائے گی۔''

''امی جان صبر کریں...... آپ کے صبر کا پھل مل رہا ہے۔ گھر پاک ہو رہا ہے۔'' چمن نے پڑیا دوبارہ ربر بینڈ سے باندھی اور بیگ میں رکھ لی۔

''جھوٹ سچ تو انسان کے اپنے اندر ہوتا ہے۔ یہ تو آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میں کتنا جھوٹ بول رہی ہوں اور کتنا سچ...... لیکن جو بے چینی اور بے سکونی میں آپ کو دے کر جا رہی ہوں۔ یہی آپ کے غلط کاموں کی سزا ہے۔''

اب یہ کہہ کر وہ رُکی نہیں بیگ اُٹھا کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

''ارے...... اللہ والی ہمیں سزائیں سُنا کر چلی گئی۔ ناشکری، حرام خور۔ پانچ برس میرے بیٹے کی کمائی پر عیش کیے۔ اب بانجھ بنجر دنیا کو یہ پڑیا دکھا دکھا کر بتائے گی کہ بہت مظلوم ہے۔'' بانو آپا دھپ سے صوفے پر گر گئیں اور اپنا سر پکڑ لیا۔

افشاں بھی ماں کے برابر میں بیٹھ گئی اور بہت پیار سے ماں کو بازو کے گھیرے میں لے لیا۔

''امی جان! آپ کو بھی تو احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا۔ یہ پڑیا اُن کے ہاتھ کیسے لگ گئی۔ کیا کچن میں کہیں چھپا کر رکھی تھی۔'' افشاں بھی اب خاصی متفکر نظر آ رہی تھی۔ کیونکہ بہر حال طلاق تو نہیں ہوئی تھی۔ یہ کٹے ہوئے بال وہ کسی موقع پر ثمر کو بھی دکھا سکتی تھی اور ثمر ماں سے بدظن ہوسکتا تھا۔

''اتنی بھی نہیں سٹھیائی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میں نے اپنے کمرے میں جا کر تھیلی میں باندھے تھے۔ شاہ جی کے آستانے پر گئی تو پتا چلا بیگ میں پڑیا ہی نہیں ہے۔''

''اوہ...... اس کا مطلب ہے یہ محترمہ آپ کے کمرے کی تلاشی لیتی رہتی تھیں۔ جہاں کیش رکھتی ہیں وہ بھی چیک کر لیجیے۔ یہ جو معصوم شکلیں لیے پھرتے ہیں، یہ اندر سے بڑے علامہ ہوتے ہیں۔'' افشاں کی پریشانی سوا سے سوا تر ہوتی جا رہی تھی۔

''ائے ہاں!'' بانو آپا ہڑبڑا کر چونک پڑیں اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہونے کے لیے زور لگانے لگیں۔

''ارے پانچ لاکھ سے اوپر میری الماری میں پڑے ہیں۔ کمبخت کہیں ہاتھ نہ دکھا گئی ہو۔'' افشاں نے اپنا سر پیٹ لیا۔

''اف...... امی جان...... اتنا کیش گھر میں رکھنے کی کیا تک ہے۔ آپ کا تو بنک میں اکاؤنٹ ہے۔''

''ارے اکاؤنٹ تو ثمر کی نظر میں رہتا ہے۔ گھر کے مردوں پر اپنے راز نہیں کھولتے۔ پتا چل جائے تو لاپروا ہو جاتے ہیں کہ چلو گھر میں پیسے پڑے ہیں۔

اپنا گنوا کر منگتوں کی طرح ہاتھ پھیلا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ گھر تو عورت نے چلانا ہوتا ہے۔'' بانو آپا نے لگے ہاتھوں بیٹی کو TIP بھی دے دی۔

''امی جان جو آج کل کے حالات ہیں کون اتنا کیش گھر میں رکھتا ہے۔ آج کل تو کیش لینا مسئلہ ہی نہیں جگہ جگہ A.T.M ہیں۔''

افشاں کو شدید قسم کی پریشانی نے آلیا تھا۔ جو سکون چمن کے چلے جانے کے بعد 100% ملنے کا یقین تھا وہ محبوب کے اُس محبت نامے کی طرح ہوا میں اڑ رہا تھا جو چھپ کر کُنج میں پڑھتے پڑھتے اچانک آنے والے تیز جھونکے میں ہاتھ سے نکل گیا ہو۔ اور عالم سراسیمگی میں دوڑ دوڑ کر پکڑنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔

''نا بابا نا...... A.T.M تو کبھی نہ جاؤں۔ پیسے لے کر باہر نکلو تو پتا چلا کوئی پستول تانے کھڑا ہے۔ A.T.M سے تو کام چلانے کے لیے پانچ دس ہزار نکالتے ہیں۔ پانچ دس ہزار روڈوں پر پڑے مل رہے ہیں۔''

بانو آپا کو بیٹی کے مشورے شاق گزر رہے تھے۔ جو اُن کی جمع پونجی کے درپے ہوگئی تھی۔ اس گھڑی کو کوس رہی تھیں جب ان کے منہ سے یہ راز کی بات پھسل گئی تھی۔

''قصہ ختم کرو! اب یہ سوچو بھائی کو دوسری شادی کے لیے کیسے راضی کرنا ہے؟ وجیہہ کے گھر جا کر سُن گن لو۔ کہیں اس کا رشتہ تو پکا نہیں ہوگیا۔'' بانو آپا نے کمال ہوشیاری سے بیٹی کا ذہن دوسری طرف لگانے کی کوشش کی تا کہ ان کے پانچ لاکھ سے تو اس کا ذہن ہٹے۔

''اللہ نہ کرے! او جیہہ میں تو میری جان اٹکی ہوئی ہے۔ اللہ نے چاہا تو وہی میری بھابی بنے گی۔ بس ایک بار ثمر بھائی اسے دیکھ لیں۔ پھر دیکھیے گا۔ زندگی بھر کسی اور کی طرف نہیں دیکھیں گے۔''

''تمہارے منہ میں گھی شکر۔ سدا سہاگن رہو۔ سات بیٹوں کا منہ دھلاؤ۔ اللہ گرم ہوا سے بچائے۔ میری بیٹی کے دشمن نامراد ہوں۔''

بانو آپا نے افشاں کی پیشانی چوم کر دعاؤں کے پھول برسانا شروع کر دیے۔ حالانکہ دماغ میں سوئی اٹکی ہوئی تھی کہ پڑیا چمن کے ہاتھ کیسے لگی...... تشویش تو اپنی جمع پونجی چیک کرنے کی بھی لاحق ہو چکی تھی۔

مگر بیٹی کے سامنے 100 پچاس کے ہزاروں نوٹ گننا مناسب نہیں تھا۔ پچیس، تیس ہزار تو دس دس اور بیس بیس کے نوٹ بھی ہوں گے۔ اچھا خاصا کام تھا کمرہ بند کر کے تسلی سے کرنے والا۔

☆......☆......☆

ایمن خود کو بمشکل کھینچتی گیٹ تک آئی تھی۔

امی ہی آئی ہوں گی اور کون آسکتا ہے۔ وہ گیٹ کھولتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ مگر چمن کو سامنے دیکھ کر اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

بے زار کن تنہائی دوست جیسی بہن کی آمد حبس میں ایک خوشگوار جھونکے کی طرح تھی۔ اپنی بے پایاں خوشی کی کیفیت میں اس نے چمن کا چہرہ غور سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔

بے بسی کی کیفیت میں بہن کو سامنے پا کر یکدم ہلکی پھلکی ہو گئی۔

یہ انسان کی فطرت میں ہے کہ دکھ و پریشانی کی کیفیت میں سرگرانی سے دوچار ہو تو کسی بہت ہی اپنے و پیارے کو دیکھ کر دل کو بڑی ڈھارس اور تقویت ملتی ہے۔ اس نے بہت شش و پنج کے بعد ایمن کے پاس آنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ اس حالت میں میکے جانے کا سوچ کر ہی کانپ اٹھی تھی کہ دل کا مریض باپ معلوم نہیں یہ نئی افتاد سہہ بھی پائے گا یا نہیں...... بہنوئی کو وہ یقین دلا سکتی ہے کہ بہن کی حالت کے پیش نظر وہ کچھ دن کے لیے اس کے پاس آ گئی ہے۔ درحقیقت اس وقت ایمن کو اس کی حقیقی ضرورت بھی تھی۔ ماں باپ بھی یقیناً یہ سُن کر خوش ہوں گے کہ وہ بہن کی مدد کرنے پہنچ گئی ہے۔ حادثہ اگرچہ بڑا تھا مگر زندگی اس حادثے کے ہاتھوں میں رہن سہن رکھی جا سکتی تھی۔ جو پڑی تھی اسی میں جینے کی راہ تلاش کرنا تھی۔

اس نے بہت کوشش کی کہ زبردستی مسکرا مسکرا کر ایمن کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ خوش ہے مگر وہ سگی اور بڑی بہن تھی۔ اسے اچانک چمن کو اپنے گھر میں پا کر ایک کھٹک سی تو لگ گئی تھی۔ مگر ابھی وہ اس انتہا تک نہیں سوچ سکتی تھی۔ بات جس انتہا پر پہنچ چکی تھی۔

''طبیعت کیسی ہے آپا! ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں۔'' اس سے پیشتر کہ ایمن اس سے کچھ سوال جواب کرتی چمن نے اپنی طرف سے کارروائی کا آغاز کر دیا۔

''اللہ کا شکر ہے! ذہن کو سکون ہے تو طبیعت بھی بحال ہے۔ یاور کا رویہ ابھی کچھ اکھڑا اکھڑا سا ہے۔ مگر میں سمجھتی ہوں انہوں نے میری خاطر اتنا کچھ تو کیا ہی ہے ناں۔ اب مجھے بھی کچھ برداشت کرنا چاہیے۔'' ایمن کی بولتے بولتے سانس پھولنے لگی تو یکلخت خاموش ہو گئی اور ہانپنے لگی۔ چمن کو ایک طرح سے اس پر ترس آنے لگا۔

''اتنی مشقت اُٹھا کر اولاد کو جنم دیا۔ پھر بھی صرف دل دکھانے والے آوازے۔ بیٹیاں بیٹیاں...... کیا بیٹیاں اولاد نہیں ہوتیں...... جگر کے ٹکڑے نہیں ہوتیں۔ جیتی جاگتی انسان نہیں ہوتیں...... بیٹا اور بیٹی دونوں میں ایک ہی جیسی Labour ہوتی ہے۔ عورت تو تخلیق کے عمل سے ایک ہی انداز میں گزرتی ہے۔ اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ماں بننے کا شرف حاصل کرتی ہے۔

بیٹی کی خوش خبری کو بری خبر کی طرح سننے والا مرد اپنی ماں کی فرمائش پر مرد پیدا نہیں ہوتا۔

بیٹی کو جنم دینے ماں اپنے ہاتھوں سے بیٹی کا پُتلا نہیں تراشتی......

پھر اولاد کو بیٹے بیٹی کے الگ الگ خانوں میں کیوں تقسیم کیا جاتا ہے۔

طعنے دینے والی ساس آخر خود کیوں عورت کی شکل میں دنیا میں نمودار ہوئی۔

بیٹی سے بے زار مرد اپنی ماں سے کیوں نہیں کہتا کہ تم کیوں عورت ہو؟

اللہ و آخرت پر یقین نہ رکھنے والے لوگ رشتوں پر، زمین پر، بوجھ ہوتے ہیں۔ خواہ وہ کتنے خضوع و خشوع دینی ارکان بجالاتے نظر آئیں...... دین کا براہِ راست تعلق انسانیت سے ہے...... اگر انسانیت ہی ناپید ہو تو دین کیسا......؟

چمن ایک گہری سانس لے کر نظریں چراتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔

''اب میں یہاں ہوں۔ آپ کو کوئی کام کرنے کی ضرورت نہیں۔ مہ وش اور مہ پارہ کو بھی میں خود سنبھال لوں گی۔''

''بڑی ہمت کی تمہاری ساس نے...... بہن کی خدمت کرنے کی اجازت دے دی۔''

ایمن کو چمن کے انداز میں کچھ غیر معمولی پن محسوس تو ہو رہا تھا مگر وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ شاید کچھ واضح ہونے کے خیال سے اس نے یہ جملہ کہا تھا اور ساتھ ہی چمن کے تاثرات دیکھنے کی کوشش بھی کی تھی۔

''وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔ حالات بدلتے رہتے ہیں اور اسی کو زندگی کہتے ہیں۔ ویسے آپا آپ نے ماشاء اللہ گھر بہت اچھی طرح سیٹ کر لیا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر نظر آ رہی ہے۔'' چمن نے کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے خاص بات کو عام سا بنا دیا۔ اب ایمن کو قدرے تسلی ہوئی کیونکہ اسے یقین تھا کہ چمن اس سے کچھ نہیں چھپاتی۔

''ہاں ایک کام والی اتفاق سے بہت اچھی مل گئی ہے۔ امی نے ہی بھیجا ہے۔ گھر کی صفائی بھی کرتی ہے اور میرا ابھی بہت خیال کرتی ہے۔ سبزی لینے گئی ہوئی ہے آتی ہوگی۔'' ایمن کے دل و دماغ کو مدتوں بعد سکون ملا تھا۔ بہت مطمئن نظر آ رہی تھی اور بہت خوش بھی۔

''یہ تو بہت ہی اچھا ہوگیا۔ کھانا بھی بنا لیتی ہے؟'' چمن نے ایمن کی طرف دیکھا۔ ''میں خود ہی نہیں بنواتی۔ یاور کو میرے ہاتھ کے کھانے کی عادت ہے۔ وہ کبھی کبھی جنک فوڈ تو کھا لیتے ہیں مگر سالن روٹی بازار سے کبھی نہیں لاتے۔ پھر مسالے میں بھنی سبزیوں سے انہیں چڑ ہے۔ میں سبزیاں بغیر پانی کے دم پر بناتی ہوں۔ نمک مرچ بھی بہت ہلکا رکھنا ہوتا ہے۔''

''تب ہی تو وہ آپ کے پیچھے پیچھے چلے آئے۔ اتنے نخرے کون اٹھاتا ہے سوائے بیوی کے۔'' چمن نے ایمن کی بات پر زبردستی شگفتگی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔

''بیوی ہوتی کس لیے ہے۔ انسان گھر کے سکھ کے لیے ہی تو شادی کرتا ہے۔ یہاں تو وہ میرا اتنا خیال کررہے ہیں، تم دیکھو گی تو حیران رہ جاؤ گی۔ گھر آنے کے بعد مجھے کوئی کام نہیں کرنے دیتے۔ گھر پر ہوں تو میں اُٹھ کر پانی بھی نہیں پیتی۔''

ایمن بہت سرشار کیفیت میں بول رہی تھی اور چمن گم صم سی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے کہا تھا کہ وقت بدل جاتا ہے اور ایمن کا وقت واقعی بدل گیا تھا۔

اب جبکہ ڈلیوری کے دن قریب تھے اور ایمن خوش بھی تھی تو وہ کس طرح اسے بتاتی کہ اس کا وقت بھی بدل گیا ہے۔

''پہلے چاروں طرف اُجالے تھے...... اچانک سورج کو گہن لگ گیا ہے۔ دن میں رات ہوگئی ہے۔

''آپا! میں تھوڑا ریسٹ کروں گی۔ کام والی کام ختم کر کے چلی جائے تو آپ مجھے اٹھا دیجیے گا۔'' چمن کو جیسے کسی گوشہ عافیت میں چھپنے کی جلدی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ جلد کچھ آشکار ہو جائے۔ اس کا پروگرام یہ تھا کہ ایمن کے گھر میں خود کو تھوڑا سا سنبھال کر امی کے گھر جائے گی۔ ایمن پر تو اپنی پڑی ہوئی ہے...... مگر ماں کی نظر میں قدرت نے ایسے آلات فٹ کیے ہوتے ہیں کہ وہ دل و دماغ کو کسی ماہر میٹر ریڈر کی طرح ایک نظر میں پڑھ سکتی ہے۔ ماں سے کچھ چھپانے کے لیے بہت ریہرسل کی ضرورت ہوتی ہے۔

''ہاں...... تمہاری شکل سے بھی لگ رہا ہے۔ کہ تم بہت تھکی ہوئی ہو۔ کوفتے بنا کر رکھے ہوئے ہیں بس مسالا تیار کرنا ہے۔ اٹھو گی تو کھانا تیار ملے گا۔''

''اُف آپا! اس حال میں اتنے کوفت والے کام۔ رہنے دیں کوفتے دوفتے، جو آسانی سے بن جائے بنالیں۔ میں کوئی مہمان ہوں؟'' چمن نے روتے دل کو آنکھیں دکھا کر ہنسنے کی دردناک کوشش کی۔

''ارے کوفت کیسی...... اب تو میں بہت ریلیکس ہوں۔ فکر نہ کرو۔'' یہ کہہ کر ایمن نے بیڈ سے پاؤں نیچے اتارے، مامتا کے بوجھ نے پھول کی طرح ہلکا کیا ہوا تھا۔ چمن کو ایمن کی بھیگی آنکھوں کی جگہ خوشی و سُکھ کے دمکتے ستارے یوں لگ رہے تھے جیسے اس نے اپنے ہاتھوں سے ٹانکے ہیں۔ ایمن کے سکون نے اسے بھی وقتی طور پر سُکھ کا احساس تو بہرحال دیا ہی تھا۔

☆......☆......☆

ثمر بہت اُلجھا اُلجھا سا اپنے روٹین کے کام میں مصروف تھا۔ کام میں ربط پیدا نہیں ہو پا رہا تھا۔ بار بار ذہن گھر کی طرف پلٹ جاتا تھا۔

بڑی جنگ کے اثرات بہت پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ چاروں طرف کام ہی کام نظر آتا ہے۔ اور سرا پکڑنا بھی ایسے میں ایک کام ہوتا ہے۔

وہ فائل بند کر کے اپنی پیشانی انگلیوں سے دبانے لگا۔ آنکھیں بند تھیں اس لیے شیشے کے پار آتی ہوئی ندا کو دیکھ نہ سکا ورنہ اپنا ذہن بنانے اور خود کو کمپوز کرنے کی ابتدائی کوشش ضرور کرتا۔ اسی لیے ندا کی آواز پر بری طرح چونک پڑا۔ جو شیشے کا دروازہ نیم وا کر کے جھانک رہی تھی۔

''سر میں اندر آسکتی ہوں؟''

''یس!'' بادل نخواستہ ثمر کو کہنا پڑا۔ اور اشارے کی منتظر ندا جھٹ اندر آگئی۔

''سر...... وہ مجھے آپ سے ایک بہت ضروری ایڈوائز چاہیے۔'' وہ جہاں تک آ گئی تھی وہیں سے شروع ہوگئی۔

''پلیز آپ تھوڑی دیر بعد تشریف لائیں۔ اس وقت میں بہت بزی ہوں۔''

''سر...... پلیز کچھ بہت اہم Issues ہیں۔ کام رُک جائے گا۔''

ندا ہر طرف سے بے نیاز اپنے مسئلے میں اُلجھی کہہ رہی تھی۔

''سنا نہیں...... آپ سے کیا کہا ہے۔ جائیے اپنا کام کیجیے۔'' ثمر اب گویا برس پڑا تھا۔

ندا گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی جیسے اسے کسی کے حملہ آور ہونے کا خطرہ ہو۔ خوفزدہ ہرنی کی طرح چند ثانیے اس نے ثمر کی طرف دیکھا اور جو فائل آتے ہی کسی گداگر کے 'کاسے' کی طرح ثمر کے سامنے پھیلا دی تھی۔ جھٹ سینے سے لگالی۔ ثمر نے اب ایک نگاہ کا تکلف بھی نہیں کیا۔

جھکی نظریں ندا کی واپسی کے قدم دیکھ رہی تھیں۔

ندا مزید تاخیر کے بغیر پلٹ گئی تھی۔

کمرہ خالی ہونے کا یقین ہوتے ہی ثمر نے گھر فون ملایا تھا۔ Ring پاس ہونے لگی ساتھ دھڑکن بے ترتیب ہونے لگی۔

''دیکھیے کون اٹھاتا ہے۔ امی جان یا چمن! امی جان نے اٹینڈ کرلیا تو ٹھیک...... چمن نے ریسیور اٹھایا تو بند کردے گا۔

ایسی عورت سے بات کرنے کا کیا فائدہ جو ہر وقت عزت نفس چھین لینے کے درپہ ہو۔

Ring پاس ہوتی رہی بالآخر رابطہ منقطع ہوگیا...... اور حیرت بال پھیلا کر چاروں اور رقصاں ہوگئی۔

ایک مرتبہ...... دو مرتبہ...... تین مرتبہ عجیب سی وحشت نے دل کو مٹھی میں دبوچ لیا۔ تجسس کی طاقت کے سامنے گھٹنے ٹیک کر اس نے بانو آپا کا سیل نمبر ڈائل کیا۔

☆......☆......☆

بانو آپا نے مُندی آنکھوں سے Caller کا نام دیکھا پھر افشاں کی طرف......

''ثمر کا ہے...... میرے خیال میں اُس فون پر بھی اُسی کی کال آرہی تھی۔''

''سن لیجیے...... کیا کہہ رہے ہیں۔'' افشاں پھر اندیشوں میں کھیلنے لگی۔

'کہیں چمن سے پیچ اپ تو نہیں ہوگیا؟ اور اب امی جان سے اس کی سفارش کرنے کے لیے فون کیا ہو۔'

''ہیلو......؟'' بانو آپا کی آواز نے اسے چوکس کردیا۔ بے تابی سے اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ تولنے کے لیے زاویہ سیٹ کرنے لگی۔ جو کچھ ان کے منہ سے نکلنا تھا افشاں نے اس کا مول تول کرنا تھا۔

''خس کم جہاں پاک، اب تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آج سے ساری پریشانیاں ختم...... اللہ نے سُن لی۔ رحم کردیا ہم پر۔ دفعان ہوگئی۔''

''چلی گئی......؟'' ثمر کو اپنی ہی آواز بہت اجنبی لگی۔

''ارے بڑے غرور سے...... یوں سمجھو لات مار کر گئی ہے۔''

''کیا کہہ رہی تھی؟'' ثمر نے قطع کلامی کی۔ صبر کا یارا نہ تھا۔ کوئی پالتو کبوتر اُڑ جانے کی خبر سنائے تو کبوتر باز کے حلق سے نوالہ نیچے نہیں اترتا...... یہ تو پانچ سال کی رفاقت کا ماحاصل تھا۔

''یہی کہ ہم نے اس پر بہت ظلم کیا ہے۔ خاص طور پر میں نے...... اپنے نااہل بیٹے کے پلے باندھ دیا اس کو۔ خدانخواستہ بخشش نہیں ہوگی میری......''

''یہ کہہ رہی تھی؟'' ثمر کی شریانوں میں جوار بھاٹا اٹھنے لگا۔ افشاں ماں کی پرفارمنس کو نظروں ہی نظروں میں سراہ رہی تھی۔

''ارے کہا تو بہت کچھ...... مجھے تو منہ سے نکالتے بھی شرم آرہی ہے۔ بس اب مجھ سے کچھ اور نہ پوچھو......بس جو کچھ بھی بولی صاف لگا کہ وہ تو اس گھر سے جانے کا بہانہ ڈھونڈ رہی تھی۔'' بانو آپا بولتے بولتے مارے رقت کے خاموش ہوگئیں۔

افشاں کا بس نہ چلا کہ کوئی ٹرافی ماں کو پکڑا دیتی۔

''ٹھیک ہے امی جان! بعد میں فون کرتا ہوں۔ ابھی میٹنگ میں جارہا ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع ہوگیا۔ اعصاب وصبر دونوں جواب دے گئے تھے۔

بانو آپا نے سکھ کا سانس لیا۔ جب جھوٹ اور سچ ہم پلہ ہوں تو کانٹے کا مقابلہ ہوتا ہے۔ گھمسان کا رن پڑتا ہے۔ بولتے بولتے اُن کا حلق خشک ہوگیا تھا۔

''پرفیکٹ...... بہت اچھی طرح بات کی آپ نے۔ اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ غلطی سے بھی بھابی سے بات کریں۔'' افشاں کی طمانیت دیدنی تھی۔

''شکر ہے مالک...... جان چھوٹی ہماری۔'' بانو آپا نے شکرانہ پڑھا۔ افشاں کے چہرے پر بھی اعلیٰ درجہ کی طمانیت تھی۔

بالکل اس دلہن کے جیسی جس کی محبت کی شادی ظالم سماج کا زبردست مقابلہ کرنے کے بعد ہوتی ہے یا وہ لڑکی جو پہلی مرتبہ ماں بننے کے عمل سے گزرتی ہے اور صحت مند خوبصورت بیٹے کی پیدائش کی خبر سنتی ہے اور خوش خبری سنتے ہی سکون کا سانس لے کر آنکھیں موند لیتی ہے۔

☆......☆......☆

''یہ تو نہیں پوچھنا چاہیے کہ روتے کیوں ہو؟ اس سوال کا تو سیدھا سا اور Understood جواب ہوتا ہے کہ صورت ہی ایسی ہے۔''

عمیر نے میل ٹائپ کرتے کرتے ندا کی طرف دیکھا تو چونک پڑا۔ اس کے چہرے پر شدید قسم کی غم و غصے کی کیفیت تھی۔ بار بار سر جھٹک رہی تھی۔ دانتوں سے ناخن چبارہی تھی۔

''خاموش ہوجاؤ! ورنہ میں دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کردوں گی۔'' ندا نے انتہائی خوفناک قسم کی دھمکی دی۔ اس سے کچھ بعید بھی نہیں تھا کہ واقعی رو کر بھی دکھا دیتی......اور دھاڑیں مارنا بھی اس کے لیے مسئلہ نہیں تھا۔ ایک منٹ کے نوٹس پر فرمائش پوری کرسکتی تھی۔ عمیر نے جھٹ دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ چہرے پر زمانے بھر کی بے چارگی طاری کرکے بولا۔

''میرا دل بہت کمزور ہے ذرا ہاتھ ہلکا رکھو۔''

''تو پھر خاموشی سے اپنا کام کرو۔'' ندا پھاڑ کھانے کو دوڑی۔ ''خبردار جو مجھے چھیڑنے کی کوشش کی۔''

''لاحول ولاقوۃ...... میں تمہیں اپنی بہن سمجھتا ہوں۔ اتنا بے غیرت نہیں ہوں۔ تم کہو تو میں تمہیں اپنی کوئی سی بھی آنٹی بنانے کے لیے تیار ہوں۔''

''انکل چپ ہو جاؤ! وہ جو اندر ایک پراؤڈ انسان بیٹھا ہے۔ اُس نے ابھی کمرے سے نکالا ہے۔ ہوسکتا ہے تھوڑی دیر بعد نوکری سے بھی نکال دیں۔

''بہت برے حالات ہیں۔ Very VeryCritical Situation...... اس اُس کر کے بات ہو رہی ہے۔''

''تو کیا آداب بجالاؤں...... اتنی انسلٹ تو صرف کوئی مغرور اور بد دماغ انسان ہی کرسکتا ہے۔ لیکن لوگوں کو یہ نہیں معلوم کہ غرور کا سر نیچا ہوتا ہے۔'' ندا نے ایک فائل اٹھا کر زور سے پٹخی۔

''ویسے تو اللہ نہ کرے کہ ایسا وقت آئے مگر خدانخواستہ اس آفس کو خدا حافظ کہہ کر جانے لگو تو یہ قول ذریں باس کو ضرور سنا کر جانا۔''

''صرف یہی نہیں...... کھری کھری سنا کر جاؤں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے آنسو پینے کی کوشش کی مگر دو چار آنسوؤں کے قطروں نے من مانی کر ہی ڈالی۔

اب عمیر کو واقعی خاموش ہونا پڑا...... کیونکہ اب کوئی ایسا بلاسٹ ہوسکتا تھا کہ کنٹرول کرنا مشکل ہوسکتا تھا۔

ندا نے عمیر سے نظر بچا کر آنسو صاف کیے۔

☆......☆......☆

چمن ماں کے پاس جانے کے لیے خود کو تیار کر رہی تھی۔ کئی مرتبہ اس کا دل چاہا ایمن کے گلے لگ کر اتنے آنسو بہائے کہ آنکھیں برسنے سے توبہ کرلیں۔ مگر ایمن کی حالت کے پیش نظر اور مدتوں بعد اس کے چہرے پر سکون دیکھ کر اس کی ہمت جواب دے جاتی تھی۔ حالانکہ وہ یہ سوچ کر ایمن کے پاس آئی تھی کہ چند دن اس کی خدمت کرے گی اور اس نے ایمن سے کہہ بھی دیا تھا۔ مگر جیسے ہی شام کے سائے پھیلنا شروع ہوئے نت نئے خیالات کی یلغار شروع ہوگئی۔

وہ گھر آ گیا ہوگا...... اس کی نظروں نے چمن کو دیکھنا چاہا ہوگا...... مگر...... شاید اس سے پہلے ہی اسے بتا دیا گیا ہوگا کہ چمن جا چکی ہے۔

چمن کے بغیر گھر کیسا لگا ہوگا......

اس کی روزمرہ کی استعمال کی چیزوں کو چھو کر دیکھا ہوگا......؟

اس کی شادی کی بڑی سی فریم شدہ تصویر کو شاید کچھ لمحے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا ہو اور ماضی کے کچھ حسین مناظر نظروں کے سامنے آ گئے ہوں۔

شاید......

شاید......

شاید......

محبتوں کی بارش میں بہت سا بھیگنے کے بعد یہ شاید، اگر، مگر بہت تنگ کرتا ہے۔

امکانات کے روزن سے شاید اگر، مگر کی بلائیں دیدہ ٹکا کر جھانکتی ہیں۔ تو بار بار رواں کھڑا ہو جاتا ہے۔ ان بلاؤں کی نگاہوں سے دل شکن لہریں نکلتی ہیں۔ ان لہروں میں ایٹمی طاقت ہوتی ہے۔ پل پل، لمحہ لمحہ ایک ایک ثانیہ تاثرات واثرات سے بھرپور ہوتا ہے۔

شاید اس نے واش روم میں اس کا شاور کیپ بھی اٹھایا ہو جو وہ گرا چھوڑ آئی تھی۔ اُٹھا کر لٹکا یا نہیں ہوگا...... کچھ دیر ہاتھ میں لے کر دیکھا ہوگا۔ پھر کچھ سوچا بھی تو ہوگا۔

''کیا سوچا ہوگا......؟ بہت اچھی ہے۔ میں نے فضول میں غصہ کیا۔ پڑھی لکھی لڑکی نے پڑھے لکھے انسانوں کی طرح ایک بات کی تھی۔

اگر وہ کسی قابل نہ ہوتا تو وہ پانچ سالوں میں ہزاروں لاکھوں مرتبہ کھلکھلا کر کیوں ہنستی۔

سنگھار کے اہتمام کیوں کرتی

پھول توڑ کر کمرے میں سرہانے کیوں سجاتی؟

ملبوس پہن کر کیوں دکھاتی

سویرے سویرے پیار سے ناشتا بناتے ہوئے کیوں گنگناتی......

سویرے بستر چھوڑتے ہوئے اس کا ہاتھ کیوں دباتی......؟ بال کیوں بکھیرتی۔

یہ ساری ادائیں تو اس عورت میں ہوتی ہیں جو شادی کے بعد بھرپور زندگی گزارتی ہے۔ رشتوں اور تعلقات سے محظوظ ہوتی ہے۔

کانوں میں رس گھولنے والی سرگوشیاں تو وہ مرد کرتا ہے جسے اپنی مردانگی پر ناز ہوتا ہے۔

پھر......پھر......

شاید کے بعد 'پھر' نے آنکھوں میں سوئیاں گھونپ دیں۔ وہ یکدم گھبرا گئی۔ اِدھر اُدھر دیکھا کہیں ایمن تو اس پر نگاہ نہیں رکھے ہوئے۔ وہ اپنی حالات کی ماری بہن جس نے بڑے صبر کے بعد سُکھ کے دن دیکھے تھے کو کسی بھی صورت میں روحانی و ذہنی اذیت سے نہیں گزارنا چاہتی تھی۔

ہوسکتا ہے ثمر کا فون آئے۔

نہ آیا تو...... ایمن سے کچھ چھپانا پھر بہت مشکل ہو جائے گا۔ اسے یاور کے آتے ہی چلے جانا چاہیے۔ یہ کہہ کر کہ وہ صبح صبح آجائے گی۔ امی بہت یاد آرہی ہیں کئی دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔

بچیوں کو ہوم ورک کرا دیا تھا۔ سالن ایمن نے بنالیا تھا۔ اس نے جلدی جلدی چھ سات چپاتیاں بنا کر ہاٹ پاٹ میں رکھیں تھوڑا سا گرین سلاد بنا کر فرج میں رکھ دیا اور یاور کے گھر آتے ہی نکل کھڑی ہوئی۔

یاور بے چارہ مارے اخلاق کے روکتا ہی رہ گیا۔ یہاں تک کہا کہ وہ تھوڑی دیر بعد خود ڈراپ کر دے گا۔''

''آپ آل ریڈی تھک کر آئے ہیں۔ Saturday کو تو ویسے بھی بہت ٹریفک ہوتا ہے۔'' اس نے بس یہ جواب دیا اور ایمن کو حیران پریشان چھوڑ کر نکل کھڑی ہوئی۔

شام کے تعاقب میں آتی ہوئی رات بہت صبر آزما تھی۔ دن تو مصروفیت میں کٹ جاتا ہے۔

رات کو کیا کریں؟ کھڑکی سے جھانکیں، تکیوں میں منہ دے کر روئیں۔ کبھی یہ یاد کریں، کبھی وہ یاد کریں...... نماز پڑھیں...... دل کہیں، دماغ کہیں۔ نماز تو رابطے کا سلیقہ ہے۔ رابطہ نہیں تو نماز کیا...... نماز نہیں تو دعا کیا...... دعا نہیں تو اُمید کیا...... امید نہیں تو زندگی کیا۔

پھر مؤذن کی صدا

اف...... تم سو کر بھی اٹھ گئے...... ہم سونا ہی بھول گئے۔ پھر کمر کسی، پھر وضو کیا...... پانی سے کم آنسوؤں سے زیادہ......

پھر ڈائلنگ کی...... سگنل کا مسئلہ...... بار بار Error...... اللہ نے ضمیر کے ساؤنڈ بکس سے اپنی آواز سنائی۔

بند کرو مذاق...... اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ نہیں ڈالتا۔ شگفتگی سے شروع ہونے والی رات پھر ایک نئے امید بھرے دن پر ختم ہوئی۔ ہتھیار گنے، ٹھونکے، جھاڑ پونچھ کی......

نیا دن...... نیا معرکہ...... پرانے دشمن......

میکے کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اسے سمجھ آ گئی کہ اب زندگی کی ادائیں بدل گئی ہیں۔ وہ روش معطل ہوئی جس میں ابر کے فوراً بعد کھل کر بارش ہوتی تھی اور بادل چھٹ جاتے تھے۔ دن میں سورج رات کو چاند نکلتا تھا۔

ساس نند کے تیور اور فون کی خاموشی...... عقل مند کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔

☆......☆......☆

''ارے کچھ نہ پوچھو کیا نہیں کہا۔ جھوٹے جھوٹے الزام لگائے۔ بیوٹی پارلر سے بال کٹوا کر پڑیا میں باندھ کر لے آئی۔ دنیا کو دکھا رہی ہے کہ ساس بال کاٹ کر جادو ٹونے کرتی ہے۔ اللہ! یہ دن دیکھنے سے پہلے مجھے موت کیوں نہ آ گئی۔''

بانو آپا نے رانیں پیٹ کر رونے والی شکل بنائی مگر ایک آنسو نہ نکلا۔

''جادو ٹونے......؟'' ثمر کو جیسے بہت زور کا دھچکا لگا۔

''اور نہیں تو کیا...... تم پر شرمناک الزام لگا کر اُس کا کلیجہ ٹھنڈا تھوڑا ہی ہوا تھا۔ مجھے بھی ذلیل کر کے گئی ہے۔ یقین نہ آئے تو افشاں سے پوچھ لو۔ یہ سب کچھ اس نے افشاں کے سامنے کہا اور اس کو بالوں کو پڑیا دکھائی۔ خوب لہرا لہرا کر۔ ارے ہمیں کیا پڑی ہے جو جادو ٹونے کرتے پھریں۔ ارے جادو کے زور سے ہمیں پوتے مل جاتے تو ہم جادو کرنے والوں کے پاس چلے جاتے۔ اتنی ذلت...... ایسے غلیظ الزام...... خودکشی حرام نہ ہوتو ابھی کچھ کھا کے مرجاؤں۔'' بانو آپا نے دوپٹے سے آنکھیں رگڑ کر مگر مچھ کے آنسو پونچھے۔

''افشاں آئی تھی؟ چلی گئی؟'' ثمر کے دماغ میں ہنڈیا پکنے لگی۔

''میں کیا سمجھتا رہا اور وہ کیا نکلی...... میری جان چھڑکنے والی ماں پر اسے گھناؤنے الزام لگا کر گئی۔ میری دوسری شادی کی باتیں، میری ادھوری زندگی سے دکھی ہو کر کرتی تھیں۔ اسے اپنی پسند سے بہو بنا کر لائی تھیں۔ ہماری لو میرج تو نہیں تھی۔ ثمر نے اپنی غمزدہ سسکتی ہوئی ماں پر ایک نظر ڈالی۔

''اگر اس نے یہ سب کچھ کیا ہے تو اسے آپ سے معافی مانگنا پڑے گی۔'' اس نے ماں کی اشک شوئی کی کوشش کی اور ماں کے پہلو میں ڈھے گیا۔

بانو آپا ہونق ہو کر ثمر کی شکل دیکھنے لگیں۔

''مگر وہ تو یہاں سے چلی گئی۔'' وہ منمنائیں۔

''طلاق لے کر تو نہیں گئی۔ ابھی میرے نکاح میں ہے۔'' ثمر نے اپنی دکھتی پیشانی انگلیوں سے مسلتے ہوئے نڈھال لہجے میں جواب دیا۔

چاروں طرف خطرے کے الارم بجنے لگے۔

''ارے دیر کتنی لگتی ہے۔ چار حرف منہ سے نکالو...... فارغ کرو...... جو اتنے غرور سے گھر چھوڑ کر گئی ہے۔ اسے چل کر لینے جاؤ گے؟'' بانو آپا کی بیٹری Low ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے صبح سے استعمال ہو رہی تھی۔ تبدیلی کے لیے وقفہ درکار تھا۔

''میں کیوں جانے لگا۔ وہ خود آئے گی۔'' ثمر نے اسی طرح نڈھال لہجے میں کہا۔ بانو آپا کے سارے کل پرزے کڑکڑ کھڑکے۔

''نامراد نے کیا واقعی اُلو کا گوشت پکا کر کھلایا ہے۔ اور اس دن میں کہاں تھی؟ میں کیسے بچ گئی......'' ان کی روح دانت کچکچا رہی تھی اس لیے ثمر نہ دیکھ سکا۔

''اب نہیں آئے گی۔ میرے بیٹے کو دنیا کے سامنے ذلیل کرنے والی عورت اب نہیں آئے گی۔ میں تمہاری دوسری شادی کروں گی تم باپ بنو گے۔ دنیا دیکھے گی اور اس پر تھو تھو کرے گی۔ اللہ نے چاہا تو میرا بیٹا سرخ رو ہوگا۔ خبردار اب اس بانجھ بنجر کے اس گھر میں واپس آنے کی بات نہ کرنا...... ورنہ مجھے اٹیک پڑ جائے گا۔''

بانو آپا کے حواس معطل ہو رہے تھے۔ اتنی محبت کے بعد انہیں قوی امید تھی کہ ثمر فوراً سے پیشتر فون ملا کر تین طلاقیں بولے گا...... اور بہت جلد خوشی کے شادیانے بجیں گے۔

''مگر یہ کیا......؟''

ثمر کے دل میں تو ابھی بھی گنجائش تھی جو بانو آپا کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ انہوں نے ایک نظر ثمر پر ڈالی اور اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

''میں ذرا اپنی مٹھی بھر دوائیاں پھانک لوں۔ لگ رہا ہے جیسے میرا B.P ہائی ہو رہا ہے۔ ہائی B.P میں یا تو فالج ہوتا ہے یا اٹیک...... کیسی زبان چلا رہی تھی ابھی تک دماغ گھوم رہا ہے۔''

جاتے جاتے انہوں نے گرتی ہوئی دیوار کو ایک دھکا اور لگانے کی کوشش کی۔

☆......☆......☆

چمن نے بہت جبر و صبر سے اپنے آنسوؤں کو روکے رکھا تھا۔ اسے پتا تھا ایمن کے آنسو پونچھتے ماں نڈھال ہو چکی ہے اور پلٹائی ہوئی بیٹی کے آنسو تو ماں کی روح کے سارے رنگ پھیکے کر دیتے ہیں۔

ماں جو دن رات کی تگ و دو کے بعد بڑے پیار سے بیٹی کا گھر بساتی ہے۔ بیٹی سے زیادہ خواب ماں کی آنکھوں میں سجے ہوتے ہیں۔ یہ سوچ سوچ کر خوش ہوتی ہے۔ کلمہ تشکر ادا کرتی ہے کہ اس کی بیٹی بھی

فطرت کی تمام مہربانیوں سے سرشار ہوگی۔ اس کے ساتھ نواسے نواسیوں کا تصور تو اتنا خوش کن ہوتا ہے کہ اس کے سامنے دنیا کے خزانے ہیچ ہوتے ہیں۔

دنیا کی سب سے اُداس عورت...... ماں ہوتی ہے، جس طرح دنیا کی سب سے زیادہ خوش باش عورت بھی ماں ہوتی ہے۔

ماں بننے کے بعد اس کی ذات رہن رکھی ہوتی ہے۔ بچے خوش تو روح تقدیر کے مہاجن سے خود کو آزاد کرالیتی ہے۔ بچے اُداس تو ماں ہے اور عمر بھر کی مہاجن کی قید۔

''بیٹا! مرد تو غصے میں جانے کیا کچھ کہہ دیتے ہیں۔

ایک چپ سو کو ہراتی ہے۔ مرد کے غصے کے جواب میں خاموشی عورت کا سب سے طاقت ور ہتھیار ہوتا ہے۔ بعد میں مرد خود ہی نادم ہوتا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر گھر نہیں چھوڑتے۔'' عطیہ بیگم اس انداز میں سمجھا رہی تھیں کہ چمن کسی انتہائی فیصلے کی طرف نہ جانے پائے اور ٹھنڈے دماغ سے بگڑی بات بنانے کی کوشش کرے۔

''امی...... میں اسی لیے سامنے سے ہٹ گئی تھی تاکہ اُن کا غصہ اُتر جائے...... مگر...... ان کی ماں مجھے دھکے دے کر نکالنا چاہتی تھی۔ انہوں نے اپنی ہیلپ کے لیے بیٹی کو بھی بلوالیا تھا۔ امی...... اس گھر میں، بغیر کسی جرم کے مجھے سزا کاٹنا پڑ رہی تھی۔ میرے منہ پر ثمر کی دوسری شادی کی باتیں ہوتی ہیں۔ مجھے بانجھ بنجر کے طعنے دیے جاتے ہیں۔''

اب چمن کی آواز بھرانے لگی۔ وہ ابھی ماں نہیں بنی تھی۔ انسانیت و نرم دلی تو لاشمار عورتوں میں ہوتی ہے...... مگر ایک ماں کا کرب دوسری ماں ہی سمجھ سکتی ہے۔

چمن نے تو اپنی دلی کیفیت عیاں کردی۔ ظلم کی تصویر کشی کردی اور عطیہ بیگم پر جو گزری اس کا ٹھیک ٹھیک ادراک چمن نہیں کوئی دوسری ماں ہی کرسکتی تھی۔

عطیہ بیگم کے لیے بانجھ بنجر کے الفاظ نیزے کی انی سے کم نہ تھے جوان کے کلیجے میں تراز و ہورہی تھی۔ انہوں نے بے اختیار چمن کا سر اپنے سینے سے لگالیا۔

''دوسری شادی کی بات تمہاری ساس نند کرتی تھیں، ثمر نے تو تم سے کبھی نہیں کہا کہ وہ دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔'' عطیہ بیگم نے آس بھرے لہجے میں یوں کہا جیسے چاہتی ہوں کہ چمن جلدی سے کہے کہ جی...... ثمر نے ایسا کبھی نہیں کہا۔

''دن رات ماں کے منہ سے بانجھ بنجر کے الفاظ اور دوسری شادی کے تذکرے سن کر ہی تو یہ نوبت آئی ہے کہ انہوں نے مجھے گھر سے جانے کے لیے کہہ دیا۔ یہ سب ایک تھراپی کی طرح تو ہوا ہے۔ اسے Processing کہتے ہیں۔ ایک ہی بات وقفے وقفے سے سنتے رہیں تو اس کا اثر ایک دن ضرور ہوتا ہے۔''

چمن ثابت کررہی تھی کہ اس نے کسی جذباتی لمحے کے ہاتھوں شکست کھا کر اتنا بڑا قدم نہیں اٹھایا۔ عطیہ بیگم کے دل میں کچھ ہوا۔ سارے وجود میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔

''بہرحال...... وہ جو مرضی کریں...... ہم تو تمہیں بسانے کی بات کریں گے۔ فی الحال تم خاموشی سے

بیٹھی رہو۔ پھر میں خود ثمر سے بات کروں گی۔ ابھی اپنے ابو جان کے سامنے کوئی بات نہ کرنا۔ یہی ظاہر کرنا کہ ایمن کی دیکھ بھال کی وجہ سے تم کچھ دن کے لیے اپنا گھر چھوڑ کر آئی ہو۔''

''کب تک...... کتنے دن تک...... ایک دن تو ابو جان کو پتا چلنا ہی ہے ناں۔ امی آپ بھی خوش فہمی کو اپنے دل سے نکال دیں۔ جادو ٹونے، طعنے تشنے، کیا کچھ نہیں ہوا۔'' چمن نے اب بے صبری سے بات کاٹ دی تھی۔

اپنی تمام تر صلاحیتوں کے استعمال کے بعد بھی جب اپنی ہر بات بے اثر دیکھی تو عطیہ بیگم فکر مند نظر آنے لگیں۔ انہیں محسوس ہوا کہ معاملہ قابو سے باہر نظر آ رہا ہے۔ مگر اُمید ابھی ہمکتے بچے کی طرح ان کے سینے سے لگی ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

بانو آپا کو تو ایک طرح سے خفقان نے آ لیا تھا۔ دل سینے کی کوٹھری میں یوں پھڑ پھڑا رہا تھا جیسے پنجرے میں پرندہ......

وہ تو سوچ رہی تھیں ان کا پیارا بیٹا آفس سے آ کر ان کے پاس بیٹھے گا اور خوش خبری سنائے گا کہ اس نے بالآخر چمن کو طلاق دینے کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔

مگر ثمر تو بہت بکھرا بکھرا اداس نظر آیا...... امیدوں کے ہاتھوں میں کھیلتا ہوا...... جس سے وہ یہی سمجھ پائیں کہ اسے چمن کا انتظار ہے۔ اپنے غصے پر ندامت ہے۔ یہ احساس بہت ہی جان لیوا تھا۔ ساری محنت اکارت جاتی لگ رہی تھی۔

اب چمن واپس آئی تو ان کی کیا حیثیت ہوگی۔ پہلے سے زیادہ ٹھسے سے بات کرے گی۔ گھر پر حکومت کرے گی۔ انہیں دیکھ کر تمسخرانہ مسکرائے گی۔ اکڑ کر چلے گی۔ پائی پائی کا حساب رکھے گی۔ افشاں پر ہونے والی عنایتوں کا کھاتا لکھے گی۔ جو اپنی مظلوم شکل لے کر ہر دو مہینے بعد دس بیس ہزار ماں سے لے جاتی تھی کہ ساس کا کنٹرول ہونے کی وجہ سے اس کا شوہر پیسے سے تنگ رکھتا ہے۔

ثمر کو گھر میں اُلجھائے رکھنے اور چمن سے دور رکھنے کی یہی ترکیب سمجھ آئی کہ بازو میں درد، چکر اور دل کی گھبراہٹ کا شور مچا دیا۔ فون کر کے افشاں کو بھی بلوا لیا تاکہ پنڈال میں تالیوں کا شور اور نعروں کا زور کم نہ پڑنے پائے۔ ماں کے گھر آنے کی وجہ سے افشاں کو گھر کے کاموں سے نجات مل جاتی تھی۔

اسے تو بہانہ چاہیے تھا، آدھے گھنٹے میں ماں کے سرہانے کھڑی تھی۔ وہی ثمر کو اس کے کمرے سے کھینچ لائی تھی۔

بانو آپا ہائے ہائے چلا رہی تھیں۔ ثمر تو واقعی سب کچھ بھول بھال کر ماں کی خدمت میں جُت گیا۔

''ڈاکٹر کے پاس نہیں جاؤں گی۔ اپنے گھر میں مروں گی۔ بیٹا آج کل فیشن ہو گیا ہے۔ لوگ اپنا مُردہ ایدھی بھیج دیتے ہیں اور ایدھی والے ہی غسل، کفن دفن کا انتظام کر دیتے ہیں، جیسے بیوٹی پارلر والے دلہن تیار کر کے مانو لفافے میں ڈال کر ہاتھ میں تھما دیتے ہیں۔ میں تمہاری منت کرتی ہوں، میرا غسل، کفن دفن سب گھر میں کرنا۔ مرنے کے بعد در در کے دھکے نہ کھلانا۔ میرے بچے! اسے ماں کی وصیت سمجھو۔'' یہ کہہ کر پھر ہائے ہائے کراہنے لگیں۔

موت، میت، غسل، کفن، دفن، سُن کر تو ثمر کے حواس ساتھ چھوڑنے لگے۔

''امی جان ایسی باتیں نہ کریں ورنہ میں مرجاؤں گی۔ میں تو پہلے ہی یتیم ہوں۔ ماں کے سوا کون ہے میرا......'' افشاں نے پھوٹ پھوٹ کر رونے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

''خدانخواستہ امی جان! ڈاکٹر چیک اپ کرنے کے بعد دوا دیتا ہے۔ بیمار ہی دوا کھا کر صحت مند ہوتے ہیں۔ علاج تو کرانا ہوتا ہے...... ورنہ تکلیف بڑھ جاتی ہے۔''

اسی وقت ماحول میں فون کی گھنٹی نے تغیر برپا کیا۔

بانو آپا فون کی گھنٹی کی آواز سُن کر اپنی ہائے ہائے بھول گئیں۔

''ائے ہئے اس منحوس کا فون نہ آ گیا ہو۔'' ان کے دل کو پھر پنکھے لگے۔ افشاں کو اشارے سے دوڑ کر فون سننے کے لیے کہا...... مگر اس سے بیشتر کہ افشاں آگے بڑھتی ثمر نے روک دیا۔

''میں دیکھتا ہوں۔ تم امی کے پاس بیٹھو۔ میں دو منٹ میں آتا ہوں پھر ہاسپٹل چلتے ہیں۔ امی جان تو بچوں کی طرح ضد کرتی ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل کر لاؤنج کی طرف بڑھا۔

''اسی منحوس کا ہوگا...... جا کر سنو تو کیا کہنے کے لیے گھنٹیاں بجا رہی ہے۔'' ان کی مجبوری تھی کہ خود اُٹھ کر نہیں جا سکتی تھیں کیونکہ ان کو دل کی تکلیف نے بے حال کیا ہوا تھا۔ اس سے کم پر تو ثمر پر قابو پانا ہی مشکل تھا۔

ماں کا اشارہ پا کر افشاں بھی جلے پیر کی بلی بن کر بھائی کے تعاقب میں چلی۔

ثمر نے ریسیور اٹھا لیا تھا...... ماں بیٹی کی ساعتیں یوں منتظر تھیں جیسے بلیک آؤٹ کے بعد بم گرنے کا خوفناک انتظار ہوتا ہے۔

''السلام علیکم آنٹی...... جی میں ٹھیک ہوں۔''

افشاں کو تردد ہوا کہ وہ کس آنٹی سے بات کر رہا ہے۔

''آنٹی...... مرد کو غصہ آتا ہے تو کچھ نہ کچھ کہہ ہی دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ عورت گھر چھوڑ کر چلی جائے۔ غصہ آتا ہے تو اتر بھی جاتا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ دوسری طرف کی بات سننے لگا۔ افشاں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر دل تھام لیا...... غصہ اترنے کی بات جو ہو رہی تھی۔

''وہ خود گئی ہے...... میں نے دھکے دے کر نہیں نکالا...... جس طرح خود گئی ہے اسی طرح خود ہی واپس آ جائے۔''

''سوری میں اسے لینے نہیں آؤں گا۔ اگر آ جائے گی تو جانے کو نہیں کہوں گا۔ مگر کچھ بھی ہو جائے میں اسے لینے نہیں آؤں گا۔ جس طرح گئی ہے اسی طرح واپس آ جائے۔''

افشاں کو یوں لگا کسی نے اس کے پیروں تلے سے زمین کا تختہ کھینچ لیا ہو۔ چیخ مار کر امی جان کہنے کی تڑپ پیدا ہوئی مگر منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

(رشتوں کی نزاکت اور سفاکی دکھاتے اس سحر انگیز ناول کی اگلی قسط انشاءاللہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

افسانہ

روحیلہ خان

تھینک یُو اللہ میاں!

''ماہرہ تم فکر نہ کرو۔ میں کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔ میں یہ منگنی ختم ہونے نہیں دوں گا۔'' ''کیا کرلو گے تم۔ بڑی خالہ کے سامنے تم بے بس ہو۔ پہلے ہی انہوں نے دل سے اس منگنی کو قبول نہیں کیا تھا۔ لیکن یہ بڑے خالو مرحوم کی بھی خواہش تھی ورنہ......

بندے کو رب کی طرف موڑتا، ایک خوب صورت افسانہ

ٹرین نے آخری وسل بجائی اور پلیٹ فارم سے سرکنا شروع کردیا۔ اس نے تھک کے سیٹ سے سر ٹکایا باہر کے مناظر ایک فلم کی ریل کی مانند بدلتے جارہے تھے، کراچی سے لاہور تک کے سفر میں اب تک وہ کتنی بار یہ منظر دیکھ چکا تھا۔ اور اب اُس کے لیے یہ مناظر کسی پرانی گھسی پٹی فلم کی مانند بور ہو چکے تھے۔ صبح کی اذان میں ابھی کچھ دیر تھی۔ ڈبے میں ذرا دھیمی ہلچل اب بھی جاری تھی۔ آج پھر اُسے برتھ والی سیٹ نہ مل سکی تھی۔ پورا دن بیٹھ کر اسی کرسی پر کمر تختہ کرنا تھی۔ سامنے خواتین والی فیملی تھی۔ تب ہی ان لوگوں نے پردہ تان لیا تھا۔ نیند پوری نہ ہونے کے باعث آنکھیں متورم سی محسوس ہورہی تھیں۔ اس نے آنکھیں موندلیں ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ سامان رکھنے کی پُر شور آواز نے اُسے آنکھیں کھلنے پر مجبور کردیا۔ سفید سایہ سا آنکھوں پر لہرایا ساتھ ہی پسینے کی عطر ملی بدبو۔

''معذرت......شاید میں نے آپ کی نیند میں خلل ڈالا۔''

وہ نوجوان پچیس چھبیس برس کا نظر آتا تھا۔ لیکن چہرے پر ہلکی ہلکی سی خشخشی داڑھی نے اُسے خاصا معتبر بنادیا تھا۔ ملگجے سے سفید شلوار قمیض اور گردن پر دھاریوں والے صافے نے اس کی طبیعت میں ناگواری کی فضا پیدا کردی تھی۔ اس کا منہ بن گیا۔ جواب بھی دینا مناسب نہ سمجھا اور دوبارہ گردن جھکا کر آنکھیں موندلیں۔ سامان کی کھٹ پھٹ کی آواز ذرا دھیمی تھی لیکن جیسے اچانک ہی کسی نے ڈبے میں ہلا بول دیا ہو۔ خواتین اور بچوں کا ایک غول ساتھ ہی چنگھاڑتی آوازیں، مردوں کی ڈانٹیں، اس کو مجبوراً اٹھنا ہی پڑا، ٹرین نے بھی جیسے ایک طویل سانس لیا تھا۔ جھٹکے سے رک گئی۔ ایسا اکثر ہوتا تھا۔

''کبھی تو ایسا ہو کہ وسل بجے اور گاڑی اسٹیشن چھوڑ دے...... یہ سانس لے لے کر چلنے کی بیماری جانے کب ختم ہوگی۔''

''ابھی چل جائے گی بھائی! پر لوگوں کو بھی تو ٹائم کا خیال رکھنا چاہیے۔ اتنے سارے لوگ ٹائم دیکھے بغیر ہی گھر سے نکل پڑتے ہیں۔ پھر کراچی کے حالات ......کوئی ایک مسئلہ تھوڑی ہے۔'' وہ چہرے پر مسکراہٹ لیے بلاوجہ بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

'ہوں' اس نے جواباً سر ہلایا اور کھڑکی سے باہر یوں ہی دیکھنے لگا۔ گاڑی نے آخری وسل دی اور آہستگی سے اپنی رفتار پکڑ لی۔

''دیکھو امید! ابھی میں تمہاری شادی نہیں کر سکتی۔ دو تم سے بڑی دو چھوٹی...... کیسے بیاہ کر سکتی ہوں میں تمہارا۔'' اماں نے خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

''یہ اماں! اب خالہ جی کب تک انتظار میں صابرہ کو بٹھائے رکھے گی۔ چار برس سے زیادہ ہو گئے منگنی کو۔ اس وقت تو تم نے بڑی قسمیں کھائی تھیں......اب کیا ہوا۔''

''دیکھ میرا بیٹا! میں کر بھی دوں تیری شادی پر ساجدہ کے لیے بھی تو کوئی بَر ڈھونڈ۔''

اماں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''اماں یہ تو قدرت کی طرف سے ہے۔ ورنہ ساجدہ میں کس چیز کی کمی ہے۔ جب ہونا ہوگی اس کے نصیب میں تو ہو جائے گی اس کی بھی شادی۔'' وہ چڑ گیا تھا۔

''تو پھر اپنی اور ماہرہ کی شادی کو بھی قدرت کا فیصلہ سمجھو۔ ابھی وقت نہیں آیا تمہاری شادی کا۔'' اماں نے اٹل فیصلہ سنا ڈالا۔

''آپ پہلی بار لاہور جا رہے ہیں۔'' اس نے اس کے شانے پر آہستگی سے اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''نہیں۔''

''اچھا تو جاتے رہتے ہیں۔ میں بھی جاتا ہوں۔'' پھر خود ہی ہنستے ہوئے بولا۔ ''میں تو اُدھر ہی رہتا ہوں جی۔'' اس کے اس فضول مذاق پر اسے ہرگز ہنسی نہ آئی۔

''یہ ملتان کتنے بجے تک پہنچ جائے گی۔'' سامنے بیٹھے بزرگوار نے خالی تشویش سے اس سے پوچھا۔

''بابا جی! فکر نہ کریں۔ سویرے ہی پہنچ جائے گی۔ ویسے تو لاہور تک کا ٹائم صبح گیارہ بجے تک کا ہے۔ ملتان سے لاہور تک پانچ گھنٹے کا سفر ہے۔ اس لحاظ سے سات بجے تک ملتان پر ہونا چاہیے۔'' اس سے پہلے وہ کچھ بولتا اس نے جھٹ اپنی انفارمیشن سے آگاہ کیا۔

''گاڑی کا کچھ پتا نہیں ہوتا بڑے صاحب۔'' سامنے بیٹھے صاحب نے اپنی مونچھوں کو بل دیتے بڑی زور سے پان کی پیک کھڑکی سے روانہ کی۔ کچھ ٹھنڈی چھینٹیں اسے اپنے چہرے پر محسوس ہوئیں۔''

اوہ خدایا...... کراہیت سے اُس کا دل خراب ہونے لگا۔'' خدایا یہ طویل سفر کب ختم ہوگا۔ اس نے بیزاری سے اپنے اردگرد اور دل ہی دل میں خدا سے شکوہ کیا۔ ٹرین نے اسپیڈ پکڑ لی تھی۔

کہتی ہیں کہ اس سال اگر عید پر بڑی خالہ نے شادی کی بات نہ کی تو وہ منگنی ختم کر دیں گی۔''

برقعے کے نقاب میں چھپی نمناک آنکھوں کی نمی اسے اپنی آنکھوں تک سرائیت کرتی محسوس ہوئی۔

''ماہرہ تم فکر نہ کرو۔ میں کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔ میں یہ منگنی ختم ہونے نہیں دوں گا۔''

''کیا کر لو گے تم۔ بڑی خالہ کے سامنے تم بے بس ہو۔ پہلے ہی انہوں نے دل سے اس منگنی کو قبول نہیں کیا تھا۔ لیکن یہ بڑے خالو مرحوم کی بھی خواہش تھی ورنہ میرا اور تمہارا نام۔''

وہ کھل کر رونا چاہ رہی تھی۔ لیکن اس چائے کے چھوٹے سے کیفے میں ان کے علاوہ اور بھی لوگ بیٹھے تھے۔ جو اپنی اپنی خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ سب ہی خوش تھے سوائے ان دو مجبور محبت بھرے دلوں کے۔ اسے اپنی محرومی، اپنی کم مائیگی اور برے نصیبوں پہ اتنی اذیت محسوس ہوئی کہ دل چاہا کہ سامنے رکھا شیشے کا گلاس اپنے ہاتھ سے توڑ دے۔ اور اس کی کرچیوں سے خود کو لہولہان کر دے۔

''خدایا' میرے ساتھ ہی ایسا کیوں' میرے ساتھ ہی ایسا کیوں......'' درد کی ایک لہر وجود سے ابھری تھی۔

''میں شاد باغ کے پاس رہتا ہوں۔'' ذرا دھیمی آواز میں وہ مخاطب تھا۔

''شاد باغ کے ساتھ ہی بازار والی گلی میں۔ آپ اُدھر گئے ہیں کبھی۔''

''ہوں نہیں'' وہ جیسے اپنے ہی خیالات کے ہجوم سے گھسیٹ کر نکالا گیا ہو۔

''اچھا!'' اس کے چہرے پر سکون سا پھیل گیا۔ اچانک ہی ٹرین ایک جھٹکے سے رُک گئی۔

''کیا حیدر آباد آ گیا۔'' سامنے والے بابا جی نے کھڑکی کی اوٹ سے ادھر اُدھر دیکھتے پوچھا۔ سامنے دور اندھیرے میں سڑک پر چلتی گاڑیاں رنگ برنگی بتیوں کے جھرمٹ میں تاروں سی لگ رہی تھیں۔ مسافر ادھر اُدھر جھانک کر گاڑی رکنے کی وجہ جاننے ہی لگے تھے۔

''کراسنگ پر گیٹ نہیں بند ہوگا۔'' وہ بڑبڑایا۔

''ہاں شاید...... پر کوئی بڑا حادثہ بھی تو ہوسکتا ہے۔'' نوجوان کے چہرے پر فکر کا سایہ لہرایا۔ وہ اپنی جگہ سے پھرتی سے اٹھا اور غائب ہوگیا۔

''کیا ہوا بیٹا گاڑی کیوں رکی ہے؟'' بابا جی نے کھڑکی سے کسی کو مخاطب کیا تھا۔ دھیمی آواز میں انہیں جواب ملا تھا۔'' خدا خیر کرے......''

''کیا ہوا بڑے صاحب۔'' مونچھوں والا آدمی اب اٹھ کر ان کی جانب آیا اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔

''کوئی ٹرین کے نیچے آگیا...... پتا نہیں کون بھلا مانس ہوگا۔''

''ٹرین کے نیچے......'' اس کا دل پہلو میں خود بخود بڑی زور سے دھڑکا، ہاتھ پیر جیسے سُن ہوگئے ماتھے پر پسینے کی ٹھنڈی بوندیں جمع ہوگئیں، حالانکہ موسم میں خنکی کے ساتھ کچھ سردی بھی شامل تھی، ایک لمحہ ایک پل، سارے دکھ، ساری فکریں، سارے غم ختم بس ایک لمحہ...... اس کا ذہن تیزی سے چلنے لگا۔ زندگی اور موت کے بیچ رشتہ کتنا کچا ہے۔ بس ایک لمحہ، بس ایک پل میں ایک سانس باہر تو پھر کبھی اندر نہیں۔

''ابا جی...... ابا جی...... اماں...... اماں دیکھو ابا جی کو کیا ہوا۔''

وہ خوفزدہ ہوکر کچن کی جانب لپکا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو وہ ابا جی کو مال کی تفصیلات سے آگاہ کررہا تھا۔

حساب کتاب میں ایسا الجھا کہ پتا ہی نہ چلا کہ اس کے سامنے ہی بیٹھے وہیل چیئر پر ابا جی کو کیا ہوگیا۔ ابھی انیس کی گنتی تک تو انہوں نے یوں کہا تھا۔ جیسے سب کچھ سن رہے ہوں۔ پھر انیس سے بائیس تک اس کے نگاہ اٹھا کر یونہی ان کی جانب دیکھا تو ابا جی کی گردن ایک جانب ڈھلکی ہوئی تھی۔

''امجد کے ابا' امجد کے ابا کیا ہوا تمہیں۔''

اماں نے انہیں جھنجھوڑا تو ان کا بے جان وجود ان کے شانے پر ڈھیر ہوگیا۔ بس ایک لمحہ انیس سے بیس تک کا یا بیس سے اکیس تک کا۔ ایک لمحہ' بس ایک پل...... اس کی آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ نکلا۔ اس نے جلدی سے اپنی آستین سے صاف کیا۔

''جوان لڑکا تھا...... ہٹا کٹا۔ مضبوط جسم کا۔ لوگ کہتے ہیں خودکشی کرلی جان بوجھ کر گاڑی کے سامنے آیا۔'' وہ اب آچکا تھا، اس کا کھلا چہرہ اترا سا تھا مضمحل سا، تھکا تھکا سا۔

''خودکشی کرلی...... توبہ...... توبہ...... خودکشی تو حرام ہے بیٹا!'' سامنے والے بابا جی نے افسردگی سے کہا۔ نوجوان کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد گویا ہوا۔

''بابا جی! انسان بڑا چھوٹا ہے۔ اپنا ہی دشمن ہے...... کم ظرف ہے...... اس نیلی چھتری والے کو دیکھیں جی...... کتنا بڑا ہے۔ کیسا دوست ہے ہمارا۔ کیا ظرف ہے جی میرے رب کا۔''

''خودکشی کرلی۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''بس ایک ہی لمحے میں اپنے آپ ہی اپنی زندگی کا فیصلہ کرلیا۔'' وہ ابھی تک ایک ٹرانس میں تھا۔

''کہتے ہیں کہ محبت میں مرا ہے جی۔ کسی لڑکی سے پیار کرتا تھا، پر گھر والے راضی نہ ہوتے تھے سو جان دے دی۔ مٹ گیا۔''

''محبت میں جان دے دی۔'' وہ ابھی تک ٹرانس میں ہی تھا۔

''امجد! اگر بڑی خالہ نے اس بار ہاں نہ کی تو میں بھی کچھ کھا کر مر جاؤں گی۔'' وہ رو دینے کو تھی۔

''ایسا نہ کہو ماہرہ! کیا تم یہ سمجھتی ہو میں تمہارے بنا جی پاؤں گا۔ میں بھی مر جاؤں گا۔ ''اس کا دل تڑپ اٹھا تھا۔

ایمبولینس کے شور نے اس ویران، اندھیری جگہ ہی عجیب سی پر اسراریت بھر دی تھی۔ یوں آدھ گھنٹے میں گاڑی دوبارہ اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی، ماحول میں افسردگی کی چادر سی تن گئی تھی۔ ایک سناٹا تھا صرف ٹرین کے چلنے کی آواز اور بس......

☆......☆......☆

میں دس برس کا تھا۔ جب میرے ابا کا انتقال ہوا تھا۔ میری ماں بے چاری بہت مجبور عورت، بے چاری کے ساتھ پہلے ہی بڑے حادثے ہوئے میرا نانا بچپن میں ہی گزر گیا تو ماں کے چچاؤں کے در پر آ گئی۔

نانی بھی جلدی ہی دنیا سے چلی گئی اکیلی ماں، چھوٹی سی بچی اور اس کے لیے چچاؤں کا بڑا ٹبر۔ ابے کے ساتھ شادی ہوئی تو اُسے سکھ کا سانس ملا۔ پر گیارہ برس تک یہ سکھ رہا۔ ابے کے بعد تو بے چاری اکیلی پڑ گئی۔ پر میری ماں نے ہمت نہ ہاری۔ اس نے ہمیشہ خود بھی حوصلہ لیا اور مجھے بھی حوصلہ دیا۔''

''حوصلہ بازار میں نہیں ملتا میرے بھائی۔''
اس کی سادگی پر بے ساختہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔

''بازار میں نہیں ملتا بھائی جی! یہ ہی تو میرا بھی کہنا ہے۔ یہ تو مانگنے پر ملتا ہے۔''

''مانگنے پر۔'' وہ خود سے گویا ہوا تھا۔

''مانگیں تو ساری دنیا مل جاتی ہے بھائی جی! آپ مانگ کے تو دیکھیں اپنے رب سے۔'' اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اب اپنے چھوٹے بھائی سے بیگ کے اپنا ٹفن نکالا تھا۔ قیمے آلو کی انتہا انگیز خوشبو نے پیٹ میں احتجاج کے ابال ڈال دیے۔

''آیئے جی۔ بسم اللہ کریں۔'' اس نے گرما گرم بھاپ اڑاتی روٹیاں کپڑے سے برآمد گی وہ سب کو پیش کر رہا تھا۔

''نہیں شکریہ میں آگے اسٹیشن سے لے لوں گا۔ اس نے بھی اخلاقاً منع کیا۔

''میرا دل رکھنے کو ایک نوالہ ہی لے لو۔'' اس نے ضد کی تو اُس نے مجبوراً ایک لقمہ توڑا اور منہ میں ڈالا۔ واہ...... ذائقے دار آلو قیمہ تھا۔

''امجد بھائی...... ! ناراض اماں سے ہو کھانے سے تو نہیں۔ میں نے بھنی ہوئی تمہاری پسند کی مسور کی دال بنائی ہے سفر کے لیے تو اسے بھی سفر کے سامان میں رکھ لو۔''

سب سے چھوٹی حمیرا اس کی چہیتی تھی لیکن اس وقت وہ بھی اُسے زہر لگ رہی تھی۔ اماں کی بحث نے اس کا موڈ خراب کر دیا تھا۔ ساری بہنیں ہی اس کی شادی میں رکاوٹ تھیں۔ اس کا دل چاہا کہ حمیرا کو اس زور سے دھکا دے کہ دیوار سے جا کر اس کا سر ٹکرائے۔

''دفع ہو جاؤ! مجھے تم لوگوں سے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ بڑی زور سے دہاڑا۔ حمیرا معصوم لرز کر رہ گئی۔ اور جلدی سے کمرے سے نکل گئی۔

''ہاں ہاں اب تجھے ہماری ضرورت کہاں ہے...... وہ ہے ناں لگتی سکتی تیری پھاپھا کٹنی۔ ہائے ہائے میری سگی بہن نے میرے بیٹے کو باغی بنا دیا۔ اری زبیدہ ستیاناس ہو تیرا۔'' اماں تک اس کی دھاڑ پہنچ چکی تھی۔ ان کا غصہ بھی شوٹ کر گیا تھا۔

''میری ایک چھوٹی بہن بھی ہے۔ اتنی پیاری ہے کہ باؤ نہ پوچھو۔ میرے لیے ایسے کرارے پراٹھے بناتی ہے کہ ہوٹل والوں کو بھول جاؤ...... میری گڈو...... بہت سوہنی ہے بھائی جی۔''

وہ بھی اپنے خیالوں میں ہی کھو گیا تھا۔ اس کے حالات بھی تقریباً اس کے جیسے ملتے جلتے تھے۔ یقیناً اس کی بہن بھی اس کی شادی میں ......اسے دلچسپی پیدا ہوئی۔

''بہت چاہتے ہو بہن کو۔''

''اور کیا بھائی جی سکون ہے میرے دل کا۔ اس سے چھوٹا ایک اور بھائی ہے۔ پر اتنا شرارتی ہے کہ نہ پوچھو۔ گڈو کا مقابلہ نہیں ہے کسی سے۔ ہیرا ہے میری گڈو۔ پر ہیرے میں ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے۔ پر شکر ہے میرے رب کا...... ہیرا...... ہیرا ہی ہے باؤ۔''

''تمہاری شادی وہ گئی ہے کیا؟''

''نہیں گڈو پیچھے پڑی رہتی ہے پر میں نے بھی کہہ دیا جب تک تیرے لیے مصنوعی ٹانگ کا انتظام نہیں کرلیتا نے میں شادی وادی نہیں کرنی۔'' وہ کھانا ختم کر چکا تھا۔

''مصنوعی ٹانگ۔'' وہ ذرا چونکا۔

''بچپن ہی میں ایک حادثے میں اس کی ٹانگ کٹ گئی تھی۔ ماں نے بڑا علاج کرایا، پر اب ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس کی مصنوعی ٹانگ لگ سکتی ہے۔ وہ چل سکتی ہے۔ میری گڈو بیساکھی کے سہارے چل لیتی ہے۔ سارے گھر کا کام کرتی ہے۔''

اس کے چہرے پر نور سا پھیل گیا تھا۔ اتنی محبت اور عقیدت سے وہ اپنی گڈو سے کر رہا تھا۔ جیسے وہ اس کی بہن نہ ہو کوئی پہنچا ہوا بزرگ یا فقیر ہو۔

''حمیرا۔'' اس کے لبوں سے بے ساختہ ادا ہوا۔

''امجد بھائی اب کی بار لاہور سے میرے لیے کام والا سوٹ لے کر آنا۔'' حمیرا کتنی پیاری گڑیا سی تھی جیسے معصوم سا فرشتہ۔

''بہنیں بڑی پیاری ہوتی ہیں۔ ہم بہنوں کو بوجھ سمجھتے ہیں یہ بوجھ نہیں ہوتیں رب کا شکر ادا کرنے کا سہارا ہوتی ہیں۔''

''ہیں...... کیا کہا تم نے۔'' وہ چونک اٹھا۔

''بہنوں سے پیار محبت کرو گے، ان کا خیال رکھو گے تو رب کی رحمتیں رب سے تمہارے لیے دعا کریں گی۔ دعا نہ بھی کریں تو بھائی سے محبت کریں گی۔ بس یہ شکر ہو گیا ناں بھائی کہ رشتے کا۔ ماں کہتی ہے کہ شادی کرلے عبدالقدوس پر میں نے بھی کہہ دیا شادی ضرور کروں گا مگر گڈو کی شادی پہلے کروں گا۔ اتنی دیر بعد اس کا نام پتا چلا تھا۔ عبدالقدوس۔''

''اور اگر تمہیں کسی سے محبت ہوگئی پھر...... پھر کیا کرو گے تم۔''

''محبت......'' وہ ذرا ہنسا۔ ''میری منگ میری محبت ہے بھائی جی! بچپن ہی میں ماں نے میری بات پکی کردی تھی اپنے چچازاد کے گھر۔ وہ بڑی اچھی ہے۔ سات برس ہوگئے۔

ماما لطیف نے بھی اب ضد باندھ لی کہ اب چاہے اس کی کڑی بوڑھی ہو جائے پہلے گڈو کی شادی ہوگی۔ پھر میری...... میں نے بھی کہا کہ خیر ہے ماما جی! گڈو بھی ناراض ہوگئی۔ پر اب سوچتا ہوں شادی کرہی لوں۔ یوں اتنے دلوں کو ناراض کر کے کہیں اوپر والے کی نظروں سے ہی نہ گر جاؤں۔ پھر شادی کا وقت بھی تو اُس رب نے طے کر رکھا ہے۔ میں کون ہوں بھلا شرطیں رکھنے

والا۔‘‘

’’اماں میں کسی شرط کو نہیں مانتا۔‘‘

’’تم کو یاد نہیں کہ تم نے وعدہ کیا تھا منگنی سے پہلے کہ بڑی بہن کی شادی کے بعد تمہاری شادی ہوگی اب اس کے سسرال والے مکر گئے تو میں کیا کروں بول بیٹا۔‘‘

’’اماں میں کسی شرط کو نہیں مانتا...... سن لو اماں حمیرا کے سسرال والے مکر گئے، ساجدہ کا رشتہ نہیں آتا۔ اس میں میرا کیا قصور ہے۔

’’ساجدہ تم سے سال بڑی ہے۔ لوگ باتیں بنائیں گے بیٹا۔‘‘

’’ٹھیک ہے بناتے ہیں باتیں تو بنانے دو ناں۔‘‘

’’دیکھ لڑکے! اپنی خالہ کی باتوں پر اتنا نہ پھول۔ میں بیوہ عورت چار چار لڑکیوں کو کیسے بیاہوں گی۔ اب کہاں سے نئی موٹر سائیکل خرید کر دوں حمیدہ کے منگیتر کے لیے۔ میں کیا کروں۔ اتنے سے پیسوں میں کیسے خرچ پورے ہوتے ہیں خدا جانے۔ اور تم ہو کہ......‘‘

’’میں تو کہتا ہوں بھائی جی! اوپر والے کی طرف سے ہر بات کا وقت مقرر ہے۔ کہتے ہیں نا کہ برا وقت تو گزر ہی جاتا ہے۔ پر یہ آپ کا ظرف آزمانا ہوتا ہے پر بندہ بڑا کم ظرف ہے جی...... فوراً پھٹ پڑتا ہے۔

گلے شکوے کرتا ہے، رونا پیٹنا ڈالتا ہے۔ جو اوپر والے نے لکھ دیا وہ پکا ہے۔ چاہے کوئی کتنا ہی رولا ڈال دے۔ نہ تعویذ نہ گنڈا نہ فقیر۔ سب سے بڑا بس وہ رب ہے جو دیتا ہے، نوازتا ہے بخشتا ہے۔ سنبھالتا ہے سمجھاتا ہے۔

آپ مانگو رب سے حوصلہ، ہمت اس کا شکر ادا کرو...... پھر دیکھو...... یہ سارے کمال اسی رب کے ہیں بھئی دیکھو۔ میں نے سامنے بابا کو کہا کہ بابا جی کھائیے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں شکریہ بیٹا! شکریہ کہا ناں...... پہ ہم نہیں کرتے۔ سر سے لے کر پیر تک...... آسمان سے لے کر زمین تک ایسی ایسی نعمتیں، نوازشیں بکھری ہیں پھر بھی ہم شکریہ نہیں ادا کرتے...... وہ انگریزی میں کہتے ہیں ناں...... تھینک یو...... وہ......‘‘

رات خاصی گزر چکی تھی۔ ٹرین میں تقریباً سارے مسافر سو چکے تھے۔ عبدالقدوس بھی اپنی برتھ پر سمٹا پڑا سو رہا تھا۔ اور وہ سب سے اوپر والی برتھ پر لیٹا ٹرین کی چھت کو گھور رہا تھا۔

’’تھینک یو......‘‘ اس کے ذہن پر یہ لفظ بار بار ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ وہ باقاعدگی سے نماز پڑھنے کا عادی تو نہ تھا۔ جمعے کے خطبے میں اکثر مولوی صاحب شکر ادا کرنے اور دوسری بہت سی باتوں پر وعظ کر چکے تھے۔ وہ ہمیشہ بے دلی سے سنتا رہا۔

لیکن اس عام سے نوجوان نے ایسا کیا کہہ دیا تھا کہ اس کے دماغ پر ’’تھینک یو! اللہ میاں‘‘ جیسے چپک گیا تھا۔ بچپن سے لے کر آج تک اس نے پروردگار کی کتنی نعمتیں استعمال کی تھیں۔ اپنے ارد گرد کتنے پیار بھرے رشتوں سے محبت وصول کی تھی۔ کتنی بار محبت، ہمدردی، رحم اور صلہ رحمی کے جذبات بھرے تھے۔ میں برا تو نہیں ہوں لیکن میں نے کبھی رب العزت کا شکر دل سے ادا نہ کیا۔ ’تھینک یو میاں جی......

اس کی آنکھیں خود بخود بہنے لگی تھیں۔ پھر آنسو دھیمی ہچکیوں میں تبدیل ہو گئے۔ اس کا دل خود بخود زور زور سے رونے کو چاہنے لگا۔ تھینک یو یہ اس رب کا ہی کرم تھا کہ جس نے ایک عام سے نوجوان کے منہ سے نکلی بات سے

دل پر کیسا اثر ڈالا۔ کتنا مہربان ہے میرا رب...... تھینک یو......

☆......☆......☆

رات اندھیروں سے سرک کر صبح کے پاکیزہ اجالے سے شرما کر دوسری جانب رُخ کر رہی تھی۔ ملتان پر گاڑی رکی تھی۔ بابا جی اپنا سامان سمیٹ رہے تھے۔ انہیں ملتان پر ہی اترنا تھا۔ اس نے جلدی سے ان کا سامان اتارنے میں مدد کی۔ اکیلی جان پر سامان چھ سات لوگوں کا لے کر چلے تھے۔ اس کی نظر پر وہ بہت مشکور نظر آرہے تھے۔

''شکریہ بیٹا خدا تمہیں خوش رکھے۔''

''شکریہ کیسا بابا جی! یہ تو میرا فرض تھا۔'' ایک نئے شکر گزار امجد نے انہیں جواب دیا تھا۔

اسٹیشن پر ہی نمازیوں نے جلدی جلدی قطار باندھ لی تھی۔ اس نے جلدی سے نماز فجر ادا کی اچانک حمیرا کی بڑی یاد آئی۔ بے چاری کتنا روئی ہوگی۔ اس نے جلدی سے اپنا موبائل نکالا اور نمبر ڈائل کیا۔ ٹرین نے وسل بجائی۔

''بھائی! آپ......'' وہ ابھی جیسے نیند سے جاگی تھی۔

''کیسی ہے میری گڑیا!'' اس کا دل گڑیا کہتے بھر آیا تھا۔

''بھائی میرے اچھے بھائی خوش رہو۔ آئی لو یو بھائی...... تم جانتے نہیں ہو میں کتنا خوش ہوں اس وقت......'' حمیرا جیسے شگوفے سا کھل رہی تھی، صبح ہی صبح رب کی نعمتوں کو وصول کرنا کتنا خوبصورت لگ رہا تھا۔

''میں نے تمہارا دل دکھایا تھا ناں...... مجھے معاف کردو میری گڑیا۔'' اس نے اپنے اوپر قابو پایا۔

''توبہ کرو بھائی! اچھا اچھا بولو ناں، تمہیں پتا ہے رات حمیدہ باجی کے سسرال والے آئے تھے۔ خالو جی بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ لوگ بڑے شرمندہ تھے۔ اپنی اسکوٹر والی بات پر، انہوں نے حمیدہ باجی کے ساتھ ساتھ اب ساجدہ باجی کے لیے بھی اپنے چھوٹے بیٹے کا رشتہ مانگ لیا...... خالو کو وہ لوگ خود راضی کروا کر لائے تھے۔''

''کیا!'' وہ حیران تھا یا بے حد خوش...... سمجھ ہی نہ پایا۔

''اماں نے تو فوراً ہاں کردی۔ اماں تو تمہاری اور حمیدہ باجی، ساجدہ باجی کے ساتھ ہی شادی کرنا چاہتی ہیں۔ پر خالو نے کہا کہ اتنی بے صبری اچھی نہیں۔ پہلے دونوں بچیوں کو بیاہ دو پھر امجد اور ماہرہ کی شادی ہوگی۔''

حمیرا بولے چلے جارہی تھی اس کے سامنے کھڑکی سے ہرے بھرے کھیت دور تک وسیع آسمان، چہچہاتی چڑیاں جیسے تصویر کی مانند ایستادہ تھے۔ یہ سب کچھ کتنا ہی خوبصورت لگ رہا تھا۔ ایسا پیارا تو یہ منظر پہلے کبھی تھا ہی نہیں۔ ''تھینک یو میاں'' اس نے فون آف کیا۔

عبدالقدوس ابھی بھی سویا پڑا تھا۔ وہ بابا جی کی خالی سیٹ پر بیٹھا اس کی جانب گھورتا رہا۔ برا وقت تو گزر ہی جاتا ہے! یہ تو آپ کے ظرف کو آزمانا ہوتا ہے......''

زندگی کے ان تین برسوں میں وہ جو بات جان ہی نہ سکا تھا عبدالقدوس نے اُسے محض چند گھنٹوں میں سارا راز بتا دیا۔ اس نے اپنی آنکھیں موندلیں۔ اس کا دل اب بھی رب کا شکر ادا کر رہا تھا۔ ہر پل...... ہر ساعت۔

☆☆......☆☆

افسانہ

شمیم فضل خالق

بلندی... پستی

''آپ زیادتی کر رہے ہیں بابا۔لڑکیوں کی شادی کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے،اگر اُسے پڑھنے کا شوق ہے تو وہ شادی کے بعد بھی پورا ہوسکتا ہے۔لیکن اس کی شادی کردیں۔ آصف بہت اچھا لڑکا ہے۔ وہ اس کا شوق شادی کے بعد بھی پورا کرے گا۔اور.....

تربیت کی عظمت کو بلند کرتا ایک فسانہ خاص

مراد آج بری طرح سے تھکا ہوا تھا۔اس کی پیٹھ میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔اور اُسے بے حد بھوک لگی تھی۔گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنی بیوی رفیقہ کو آوازیں دینا شروع کردیں۔رفیقہ کی بجائے اس کی بیٹی صبا کمرے سے باہر آئی۔

''کیا بات ہے بابا......''اس نے حیرت سے باپ کو دیکھا۔

''بھوک لگی ہے بیٹا۔ بہت سخت بھوک لگی ہے۔'' وہ چارپائی پر اپنا تھکا ہوا وجود گراتے ہوئے بے بسی سے بولا۔

''میں کھانا لاتی ہوں۔اماں پڑوس میں گئی ہیں۔'' وہ پلیٹ کر اپنے چھوٹے سے کچن کی طرف جانے لگی تو مراد نے پوچھا۔

''کیا پکایا ہے آج؟''

''بھنڈی پکائی ہے بابا۔''اس نے وہیں سے آواز دی اور مصروف انداز میں کچن میں گھس گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ چھوٹی سی ٹرے میں روٹی اور پلیٹ میں سالن لے کر آگئی۔ اور باپ کے سامنے رکھ دی۔ بڑے بڑے نوالے لیتا ہوا وہ صبا سے کہنے لگا۔

''سبز مرچیں ہوں تو چٹنی بنا کر لے آنا بیٹے۔پھیکا سا لگ رہا ہے آج کھانا۔''

''جی بابا لاتی ہوں ابھی۔''

پل بھر میں وہ مرچوں کی چٹنی بنا کر لے آئی۔ اور باپ کے سامنے رکھ دی۔ اسی دوران رفیقہ بھی آگئی۔مراد کو دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔

''آج تم جلدی آگئے۔'' وہ برقعہ الگنی پر ٹانگتے ہوئے بولی۔

''مزدوروں کے آنے کا کوئی فکس ٹائم نہیں ہوتا۔ہاں تم کہاں گئی تھیں۔'' وہ پانی کا گلاس منہ سے لگاتے ہوئے بولا۔

''صدیقہ بہن کا پوتا کب سے پیدا ہوا تھا۔ اس کی بہو نے چھلہ بھی نہالیا۔ مجھے موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ آج موقع ملا تو مبارکباد دینے چلی گئی۔''

''بابا! چائے بناؤں۔'' اس وقت صبا نے باپ کے پاس آکر کہا تو رفیقہ جلدی سے بولی۔

''نہیں ...... تم رہنے دو، تم جا کر پڑھو۔ تمہارے امتحان قریب آرہے ہیں، چائے میں بنا لوں گی۔'' ماں کی ہدایت پر صبا اندر کمرے میں چلی گئی۔ تو مراد نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''عدنان کہاں ہے؟''

''ایک دوست سے کتاب لینے گیا ہے۔'' رفیقہ نے کھانے کے برتن سمیٹتے ہوئے کہا۔

''بچوں کا خیال رکھا کرو رفیقہ۔ وقت اتنا نازک ہے لڑکوں کا خیال بھی لڑکیوں کی طرح رکھنا پڑتا ہے۔ اور پھر مجھے دیکھو۔ میں ان بچوں کے لیے کولہو کا بیل بنا ہوا ہوں۔ آج مزدوری زیادہ ملی لیکن جسم درد سے پھٹا پڑ رہا ہے۔ بس یہ دونوں پڑھ لکھ جائیں اور ان کے نصیب میں ہماری طرح کوئی مشکل زندگی نہ ہو۔ یہی دعا ہے اپنے رب سے۔''

رفیقہ نے بھی دل ہی دل میں یہی دعا کی اور کچن میں چائے بنانے چل دی۔

☆......☆......☆

مراد دیہاڑی دار مزدور تھا۔ کبھی دیہاڑی زیادہ مل جاتی، کبھی کم۔ اس کے دو بچے تھے۔ صبا اور عدنان۔ عدنان بڑا تھا اور صبا چھوٹی۔ عدنان ایف اے میں پڑھ رہا تھا۔ اور صبا میٹرک میں تھی۔ مراد اور رفیقہ کی شدید خواہش تھی کہ ان کے دونوں بچے پڑھ لکھ جائیں۔ اس کے لیے دونوں اپنی طرف سے پوری پوری کوشش کر رہے تھے کہ چاہے انہیں پیٹ بھر کر کھانا نہ ملے لیکن بچوں کے لیے کتابیں اور کاپیاں آجائیں۔ دونوں بچے سرکاری اداروں میں پڑھ رہے تھے۔ رفیقہ محلے والوں کے کپڑے سی کر چند پیسے کما لیتی۔ مراد اپنی قوت سے زیادہ محنت مزدوری کرتا۔ بچوں کو بھی ماں باپ کی خواہش اور کوششوں کا علم تھا۔ اس کے لیے وہ بھی دل لگا کر پڑھ رہے تھے۔ یہ محلّہ

غریب لوگوں کا تھا۔ دو دو مرلے کے مکانات تھے۔ کسی امیر شخص کی جائیداد تھی یہ۔ وہ ان غریبوں سے برائے نام کرایہ وصول کرتا تھا۔ ان کوارٹرز میں ایک کمرہ، ایک باتھ روم اور ایک کچن تھا لیکن یہ سب اتنے چھوٹے تھے کہ کچن میں بیک وقت دو بندے کھڑے نہیں ہو سکتے تھے۔ چھوٹا سا برآمدہ اور کونے میں چھوٹا سا اسٹور تھا۔ جسے رفیقہ نے صاف ستھرا رکھا تھا۔ اور اس میں ایک دری بچھا رکھی تھی ۔ یہ عدنان کا کمرہ تھا۔ جہاں وہ پڑھائی کرتا تھا۔ کمرہ نسبتاً تھوڑا بڑا تھا۔ اس میں کھینچ تان کر تین چارپائیاں تھیں ۔ جن میں مراد اور رفیقہ کے ساتھ صبا بھی سوتی تھی۔ موسم تھوڑا خوشگوار ہو جاتا تو مراد اور رفیقہ باہر برآمدے میں اٹھ آتے۔

یہاں سارے غریب لوگ رہتے تھے۔ جس میں کوئی دہی بھلوں کا ٹھیلا لگاتا تھا، کوئی مٹی کے برتن بنا کر بیچتا تھا۔ ان میں کوئی صاحب ثروت بندہ نہیں تھا۔ اس لیے سب کے دکھ سکھ بھی سانجھے تھے۔

کھانا کھا کر مراد نے تکیے سے ٹیک لگائی چاہی تو اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ قمیض کی تر پائی کرتے ہوئے رفیقہ نے چونک کر اس سے پوچھا۔

''کیا ہوا......؟''

''آج مزدوری زیادہ مل گئی ہے نا۔ تو کمر کا بھی حشر نشر ہو گیا۔''

''تو خیال رکھا کرو نا۔ اس طرح زیادہ مزدوری کا لالچ کرو گے، تو جسم میں کوئی بڑا نقص پیدا ہو گا۔''

''ہاں یہ تو ہے...... پر مہینے کی پہلی تاریخیں ہیں۔ میں نے سوچا اب بجلی اور گیس کا بل آئے گا تو اس کی وقت پر ادائیگی ہو۔ خواہ مخواہ میں پھر سر چارج دینا پڑتا ہے۔''

''ہاں......'' ایک لمبی سانس رفیقہ نے لی۔ ''خدا عدنان کا بھلا کرے۔ صبا کی طرف سے اس نے بے فکر سا کر دیا ہے۔''

''لیکن عدنان خود ابھی پڑھ رہا ہے۔ ابھی سے پڑھانے میں لگ جائے گا، تو خود کیسے پڑھے گا۔ مراد تشویش سے بولا۔ دراصل باپ کی سخت محنت کو دیکھتے ہوئے ابھی دو چار ماہ قبل عدنان نے ایک دو ٹیوشنز شروع کی تھیں۔ جس سے جتنے پیسے ملتے اور انہیں اپنی اور صبا کی تعلیمی اخراجات پر خرچ کر دیتا۔ مراد اس صورت حال سے خوش نہیں تھا لیکن عدنان نے ماں باپ کو یقین دلایا تھا کہ اس سے اس کی پڑھائی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ مراد چپ کر گیا کہ اس کی مزدوری والے پیسوں پر تو بمشکل گھر کا خرچہ چل رہا تھا تو اکڑتا کس بات پر۔

☆......☆......☆

رفیقہ نے گھر کی صفائی کی، برتن دھوئے، مشین میں ایک سوٹ آدھا سلا رکھا تھا وہ سیا۔ پھر تھال میں اُروی لے کر بیٹھ گئی۔ صبا کو اُروی بہت پسند تھی۔ سو وہ ہفتے میں ایک دو بار یہ سبزی ضرور پکاتی تھی۔ ویسے بھی تو گوشت قیمہ پکانے کی تو جیب اجازت ہی نہیں دیتی تھی۔ تو سبزیاں اور دال بدل بدل کر پکایا کرتی تھیں۔ بچے بہت شریف اور تابعدار تھے، گھر میں جو چیز پکتی وہ کھا لیتے۔ ابھی وہ اپنے خیالات میں اچھی سبزی بنانے میں مصروف تھی کہ ماسی نصیب آ گئی۔

ماسی نصیب کا گھر محلے کے سرے پر واقع تھا۔ وہ لوگوں کے رشتے کروایا کرتی تھی۔ اور اس سلسلے میں شہر کے پوش علاقوں میں جایا کرتی تھی۔ اس محلے میں تو ظاہر ہے اس کا کام نہیں چلتا تھا لیکن وہ سارے محلے والوں سے میل جول رکھتی

تھی۔ رفیقہ نے ماسی نصیب کو دیکھا تو سلام دعا کے بعد اُسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''صبا کہاں ہے؟''

اسکول گئی ہے ماسی! بس اس وقت تو میں اکیلی ہوتی ہوں۔ بچے اسکول چلے جاتے ہیں اور مراد مزدوری پر چلے جاتے ہیں۔''

ماسی نصیب نے ہنکارا بھر کر اسے دیکھا اور بولی۔

''رفیقہ! کیا کرے گی بیٹی کو پڑھا کر، بس اب اس کی شادی کی فکر کر۔''

''کیا......'' رفیقہ کا دل دھک سے رہ گیا۔

''کیا کہہ رہی ہو ماسی! وہ تو ابھی بچی ہے۔''

''اب ایسی بھی بچی نہیں۔'' ماسی نصیب نے منہ بنا کر کہا۔ ''عمر تو شادی والی ہوگئی ہے۔ اور پھر تجھے اس کی اٹھان نظر نہیں آرہی۔ اپنی عمر سے بڑی لگتی ہے۔'' پھر وہ رازداری سے اس کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔

''میری نظر میں ایک دو اچھے رشتے ہیں۔ تُو کہے تو بات چلاؤں اس کے لیے۔''

''نن...... نہیں...... ماسی!'' وہ گھبرا کر بولی۔ ہم اتنی جلدی شادی نہیں کرنا چاہتے۔ ہم اُسے پڑھانا چاہتے ہیں۔''

''لو اور سنو!'' وہ ناگواری سے بولی۔ ''پڑھ لکھ کر افسرنی بنے گی کیا تیری بیٹی۔ ارے وہی مزدور کی بیٹی رہے گی۔ بانس پر نہیں چڑھ جائے گی تیری بیٹی۔ سوچ لو۔''

وہ پیروں میں چپل اڑس کر بولی۔ اور تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے گھر سے باہر چلی گئی۔ رفیقہ کا دل ایک دم ہر چیز سے اچاٹ ہوگیا۔ اسے ایسے لگا جیسے اس میں ہلنے جلنے کی سکت بھی نہ باقی رہی ہو۔ کتنی ہی دیر وہ غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے ساکت بیٹھی رہی۔ پھر جیسے بادل نخواستہ وہاں سے اٹھ کر ہانڈی بنانے چل دی۔

☆......☆......☆

آج وہ سارا دن بجھی بجھی رہی۔ صبح بچے اسکول کالج چلے گئے، مراد کو بخار تھا، وہ گولی کھا کر بخار اترنے کا انتظار کر رہا تھا کہ بخار اترے اور وہ مزدوری پر چلا جائے۔ رفیقہ اس کے قریب آکر بولی۔

''کل ماسی نصیب آئی تھی۔''

''اچھا!'' مراد چونک کر بولا۔ ''یہاں وچولن کا کیا کام تھا۔ کیا لینے آئی تھی۔'' کچھ دیر خاموش رہنے سے وہ بولی۔

''صبا کے رشتے کے بارے میں بات کر رہی تھی۔''

''کیا......؟ اس کی آواز چیخ سے مشابہ تھی۔ ''تم نے دھکے مار کر اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ منحوس عورت! بچی کی عمر نہیں دیکھتی اور منہ اٹھائے چلی آتی ہے۔ تو نے اسے خوب برا بھلا کہہ دینا تھا کہ آئندہ کبھی اس مقصد کے لیے نہ آئے۔'' رفیقہ اس کے غصے سے گھبرا گئی۔ اور مصالحت بھرے لہجے میں بولی۔

''میں نے اسے بجھا دیا۔ اس کا کام ہی یہی ہے۔ اپنے کام سے در در کی خاک چھانتی ہے۔ تم تو ایسے بھڑک اٹھے جیسے اس نے کہا اور ہم نے مان لیا۔ لوگوں کے منہ تو بند نہیں کیے جاسکتے۔ ہم تو وہی کریں گے جو ہم ہماری اولاد کے لیے بہتر سمجھیں گے۔''

اس کی باتوں سے مراد کا غصہ تھوڑا کم ہوا۔ بخار بھی کم ہوگیا تھا۔ سو وہ چادر کندھے پر ڈال کر مزدوری کے لیے چلا گیا۔

☆......☆......☆

اس دن رفیقہ کام ختم کر کے مشین کے آگے

بیٹھی سلائی میں مصروف تھی کہ اچانک کھلے دروازے سے دو خواتین اندر داخل ہوئیں۔ سلام کر کے ان میں ایک خاتون قدرے شرمندگی سے کہنے لگی۔

''معاف کرنا بہن ہم اجازت لیے بنا اندر گھس آئے۔''

''نہیں...... نہیں ...... کوئی بات نہیں۔'' وہ جلدی سے کپڑے سمیٹتے ہوئے بولی۔

''آیئے ...... بیٹھیے۔'' اس نے ان دونوں کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی۔

رفیقہ کے لیے یہ خواتین بالکل اجنبی تھیں۔ دونوں خواتین اپنے لباس اور رکھ رکھاؤ سے کسی اچھے گھر کی معلوم ہو رہی تھیں۔

''میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔'' کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔

اس لیے کہ یہ ہماری پہلی ملاقات ہے۔'' ان میں سے ایک نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ کے بچے نظر نہیں آرہے گھر میں۔'' انوں نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''دونوں خیر سے پڑھنے گئے ہیں۔'' اس کی آواز میں فخر سمٹ آیا۔

''کن کلاسوں میں پڑھتے ہیں؟'' ایک خاتون نے پوچھا۔

''لڑکی ماشاءاللہ کالج میں پڑھتی ہے۔ ایف اے میں پڑھ رہی ہے۔ لڑکا ایم بی اے کر رہا ہے۔'' اس نے فخریہ بتایا۔

''ماشاءاللہ...... ماشاءاللہ!'' دونوں خواتین بیک وقت بولیں۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

''آپ بیٹھیں میں شربت لاتی ہوں۔''

''نہیں...... نہیں۔'' دونوں خواتین بولیں۔ آپ بیٹھیے ہم آپ سے ایک بات کرنا چاہتے ہیں۔''

وہ اٹھتے اٹھتے پھر سے بیٹھ گئی اور حیرت سے انہیں دیکھنے لگی کہ یہ اجنبی خواتین اس سے کیا بات کرنا چاہتی ہیں۔

''دراصل ہم آپ کی بیٹی کے رشتے کے لیے آئے ہیں۔ اپنے بھائی کے لیے۔''

رفیقہ گھبرا کر ان کے چہرے دیکھنے لگی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ایک خاتون جو دوسری سے بڑی دکھتی تھی نے بات کو بڑھاوا دیتے ہوئے کہا۔

''ہمارا چھوٹا بھائی ہے۔ جس کا ہم گھر بسانا چاہتے ہیں۔ گھر میں ایک صرف ہماری بوڑھی ماں ہے۔ ہم دونوں بہنوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ ہم اولاد والیاں ہیں تو میکے کو زیادہ ٹائم نہیں دے سکتے۔ اس لیے اپنے بھائی کا گھر آباد کرنا چاہتے ہیں۔ اکلوتا بھائی ہے ہمارا۔''

وہ گم صم سی بیٹھی رہی۔ اس خاتون نے پہلو بدل کر کچھ دیر اس کے بولنے کا انتظار کیا۔ جب وہ نہ بولی تو پھر سے کہنے لگی۔

''جب تک بھائی کی جاب نہیں لگی تھی ہم اس کی شادی نہیں کرنا چاہتے تھے، لیکن اب وہ بڑی اچھی جاب پر لگے ہیں۔ گھر بھی اپنا ہے۔ شاداب کالونی میں تیسرے نمبر کا ہمارا مکان ہے۔ آپ ہمارا گھر دیکھنے آجائیں۔ بھائی کو دیکھ لیں۔'' جو معلومات کرنا چاہتی ہیں کروالیں۔ گھر میں صرف ماں ہے، باپ ہمارا فوت ہو چکا ہے۔'' دوسری بہن نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''آپ کی بیٹی ہمارے گھر کے سامنے سے گزر کر اپنے کالج جاتی ہے۔ ہم نے اُسے دیکھا ہے۔ ماشاءاللہ بڑی پیاری بچی ہے۔ آپ بھی ہمیں بہت اچھی لگی ہیں۔'' پھر وہ ایک کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''اس پر ہمارے گھر کا ایڈریس لکھا ہے۔ بھائی کا نام آصف ہے۔ اچھا اب ہمیں اجازت دیجیے۔ ہمیں آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔''

وہ دونوں خواتین چلی گئیں اور اسے سوچوں کے دلدل میں دھکیل گئیں۔

جب سے صبا کالج میں گئی تھی اس کے لیے آنے والے رشتوں میں اضافہ ہوگیا تھا۔ لیکن زیادہ تر رشتے اس محلے کے ہی ہوتے جو ہرگز قابل قبول نہ ہوتے۔ اکثر رشتوں کے بارے میں تو وہ مراد کو بھی نہیں بتاتی تھی۔ خود ہی انکار کر کے انہیں ٹرخا دیا کرتی تھی۔ لیکن یہ خواتین اُسے پسند آئی تھیں۔ معزز اور سوبر سی۔ نرم لہجے میں بات کرنے والی۔ لیکن اس کے باوجود اس کا دل بیٹی کو اتنی جلدی بیاہنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس کے متعلق دیکھے گئے خواب ابھی کہاں پورے ہوئے تھے؟ ابھی تو اُسے مزید پڑھنا تھا اور تب وہ کالج میں لیکچرار بنتی۔ اور جانے کتنے سارے خواب ان دونوں نے اپنی بیٹی کے بارے میں اپنی آنکھوں میں بن رکھے تھے۔ پھر بھی شام کو اس نے مراد کے سامنے بات چھیڑ دی۔

عدنان بھی باپ کے پاس بیٹھا تھا۔ صبا اپنی کسی دوست کی سالگرہ میں گئی تھی اور عدنان اسے ابھی چھوڑ کر آیا تھا۔ رفیقہ نے بات کی ابتداء کرتے ہوئے کہا۔

''آج صبا کے رشتے کے لیے دو عورتیں آئی تھیں۔''

اب یہ روٹین کی بات ہوگئی تھی۔ مراد جس طرح پہلی بار ماسی نصیب کی بات پر بگڑا تھا۔ اب وہ اس طرح آگ بگولا نہیں ہوتا تھا۔ اکثر تو اس کی ایسی باتوں کو اگنور کر دیتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اس کی بات سنی ان سنی کر گیا۔ عدنان پوچھنے لگا۔

''کون عورتیں! ماں...... ! کہاں سے آئی تھیں۔''

''کوئی شاداب کالونی ہے، وہاں سے آئی تھیں۔ بھائی کے لیے صبا کا رشتہ مانگ رہی تھیں۔ بھائی کا نام آصف ہے اور حال ہی میں نوکری پر لگا ہے۔''

''اتنی تفصیل کیوں بتا رہی ہو۔'' مراد نے اُسے گھورتے ہوئے کڑوے پن سے کہا۔ ''انکار کر دینا تھا۔''

''ارے...... آصف کو تو میں جانتا ہوں۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔ شاداب کالونی میں ان کا سات مرلے کا پکا مکان ہے۔ آصف کی ابھی ابھی نوکری لگی ہے۔ بہت سلجھا ہوا لڑکا ہے۔ شکل وصورت بھی بہت اچھی ہے۔ اور اخلاق کا بھی بہت اچھا لڑکا ہے۔'' عدنان نے اس کی خاصی تعریف کر دی۔

''ہم نے کیا کرنا ہے اس کی اچھائی کو۔ ہم نے تو بیٹی کی شادی ہی نہیں کرنی، بات ختم۔'' مراد کہنے لگا تو رفیقہ تو چپکی ہو رہی لیکن عدنان بولا۔

''آپ اماں کو کیوں چپ کرانا چاہتے ہیں۔ کیا آپ صبا کی شادی کبھی بھی نہیں کریں گے۔''

''کریں گے بیٹا۔ کیوں نہیں کریں گے۔'' میز سے پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے مراد بولا۔ ''لیکن ابھی اس نے پڑھنا ہے۔ بہت سارا پڑھنا ہے پھر وہ لیکچرار بنے گی۔ شادی کا نمبر ابھی بہت دور ہے۔''

''آپ زیادتی کر رہے ہیں بابا۔ لڑکیوں کی شادی کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے، اگر اُسے پڑھنے کا شوق ہے تو وہ شادی کے بعد بھی پورا ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کی شادی کر دیں۔ آصف بہت اچھا لڑکا ہے۔ وہ اس کا شوق شادی کے بعد بھی پورا کرے گا۔ اور ویسے بھی آصف جیسا لڑکا آپ کو دوبارہ نہیں ملے گا صبا کے لیے۔'' عدنان

باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔
عدنان پڑھ لکھ کر بااعتماد ہوگیا تھا۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ ہوشیار ہوگیا تھا۔ وہ اکثر باتوں پر ماں باپ کومشورہ دیا کرتا تھا اور مراد اس کی باتوں سے متاثر بھی ہو جایا کرتا تھا۔
''دیکھو بیٹا! شادی کے لیے بہت رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ ابھی ہمارے پلے کیا ہے جو بیٹی کی شادی کرنے کا سوچیں۔'' عدنان جلدی سے بولا۔
''بابا! پیسوں کی فکر نہ کریں ۔اللہ تعالیٰ غریب کے لیے اپنی غیب سے آسانیاں پیدا کردیتا ہے۔ میں ٹیوشنز بڑھا دوں گا۔ بس آپ دونوں آپ اور اماں اپنے ذہنوں کو صبا کی شادی کے لیے آمادہ کرلیں۔''

☆......☆......☆

اس کے بعد بھی گھر میں اس سلسلے میں بحث مباحثے ہوتے رہے۔ آصف کے گھر والے بھی دو بار آئے۔ رفیقہ نے ان کا گھر بار دیکھا۔ ان کے لحاظ سے سب اچھا بلکہ بہت اچھا ثابت ہوا۔ مراد لڑکے سے ملا تو اس کا انکار خود بخود دم توڑ گیا۔ ان لوگوں کا کردار بھی زبردست تھا۔ انہوں نے جہیز کے نام پر ایک سوئی تک لینے سے انکار کر دیا۔ بلکہ وہ جب بھی آتے ایک کپ چائے تک نہ پیتے کہ ان لوگوں پر بوجھ نہ آن پڑے۔
تعلیم کے لیے آصف نے وعدہ کرلیا کہ صبا اس کے گھر آکر بھی اسی طرح پڑھے گی جس طرح وہ اب تک پڑھتی آئی ہے۔ غرض چند دنوں میں صبا کی شادی ہوگئی۔

☆......☆......☆

وقت کچھ اور آگے سرکا صبا اپنے گھر میں خوش اور مطمئن تھی۔ اب وہ بی اے میں پہنچ چکی تھی۔

آصف نے اپنا وعدہ خوب نبھایا اور اس کی تعلیم کی راہ میں کبھی روڑے نہیں اٹکائے۔ عدنان نے ایم بی اے مکمل کر لیا۔ اسے ایک N.G.O میں نوکری بھی مل گئی۔
اور پھر عدنان نے دو کمروں کا ایک صاف ستھرا فلیٹ کرائے پر لے لیا اور اس محلے کو خیرباد کہہ دیا۔ اس نے اپنے باپ سے مزدوری کا کام چھڑوا دیا اور ماں سے سلائی کا کام ختم کروا دیا۔
زندگی اب ایک نئے ڈگر پر چلنے لگی رفیقہ اور مراد کے دل میں اب عدنان کا گھر بسانے کی خواہش جنم لینے لگی۔ جب یہ خواہش بہت زور پکڑ گئی تو رفیقہ نے عدنان سے بات کرلی۔ عدنان ماں کی بات سن کر ہنس پڑا۔
''کیا آپ دل سے چاہتی ہیں کہ آپ کی بہو اس گھر میں آئے۔''
''ہاں بیٹا! میرے اور تمہارے بابا کی تو اب بس یہی خواہش ہے۔ باقی ساری خواہشات تو ہمارے رب نے پوری کردی ہیں۔ میں اس پاک ذات کی بہت احسان مند ہوں جس نے مجھ غریب لاچار پر اپنا کرم کیا۔ اور میری تمام خواہشات کی تکمیل کردی۔ بس اب تمہارا گھر بس جائے تو میں بےفکر ہو جاؤں گی۔''
''تو سمجھ لیجیے آپ کی یہ خواہش بھی بہت جلد پوری ہو جائے گی۔'' وہ ماں کو خود سے لگاتے ہوئے ہنس کر بولا اور تو رفیقہ چونک گئی۔
''تُو نے کسی کو پسند کیا ہے کیا؟''
''ہاں ماں!'' اس نے اپنا سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا۔''میرے ساتھ جاب کرتی ہے چندا۔ اچھے مالدار گھر سے تعلق ہے اس کا۔ آپ اُسے دیکھ لیں، اگر آپ کو پسند آجائے تو ٹھیک ہے اگر نہ پسند آئے تو چندا آنسو بہا کر چپ ہو

جاؤں گا پر ہوگا وہی جو آپ اور بابا چاہیں گے۔'' پھر اس کا لہجہ شرارتی ہو گیا۔

''چل ہٹ پگلے!'' رفیقہ نے اسے گلے سے لگا کر خوشی سے کپکپاتی آواز میں کہا۔

''میں کہاں تیرے لیے در در پھرتی لڑکیاں ڈھونڈنے کے لیے۔ زندگی تو نے گزارنی ہے۔ اچھا ہے تو نے خود ہی اپنی پسند بتا دی۔''

''آپ اُسے جا کر دیکھیں تو سہی۔'' عدنان نے ماں پر زور دیا۔

''چلی جاؤں گی کسی دن۔'' وہ خوشی خوشی مراد کو یہ بات بتانے چل دی۔

☆......☆......☆

رفیقہ چندا کے گھر آ گئی۔ اُسے نازک سی چندا بہت پسند آئی۔ اس کی ماں بھی اچھی عورت تھی۔ رفیقہ نے باقاعدہ چندا کا رشتہ مانگا۔ چندا کی ماں کہا کہ وہ چندا کے باپ سے بات کر کے فائنل جواب دے گی۔''

ان لوگوں کے رویے سے رفیقہ نے اخذ کر لیا کہ اگرچہ اس رشتے کے لیے وہ پہلے سے تیار تھے بس رسم کے مطابق وقت مانگا ہے۔ وہ خوشی خوشی گھر لوٹ آئی۔

صبا بھی آئی ہوئی تھی مراد بھی گھر پر تھا۔ عدنان بھی موجود تھا۔ سب نے آپس میں یہ خوشی شیئر کی۔ بازار سے کچھ چیزیں منگوا کر اور کچھ گھر میں بنا کر سب نے ہنسی خوشی لنچ کیا۔ اب ان کو فائنل جواب کا انتظار تھا۔

☆......☆......☆

شام کے سائے ڈھل رہے تھے۔ عدنان گھر میں تھا۔ وہ اپنے کمرے میں آفس کی فائلوں کو ترتیب سے ٹھیک کر رہا تھا۔ رفیقہ رات کے کھانے کے لیے چاول صاف کر رہی تھی۔ مراد بھی اس کے پاس بیٹھا ادھر اُدھر کی باتیں کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ مراد ڈھیلے ڈھالے انداز میں اٹھ کر دروازہ کھولنے گیا۔

رفیقہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ مراد کے ساتھ ایک سوٹڈ بوٹڈ شخص آ رہا ہے۔ مراد اس کو سیدھا اس کمرے میں لے گیا، جہاں صوفے وغیرہ رکھ کر انہوں نے ڈرائنگ روم کی شکل دی تھی۔ ابھی رفیقہ اس شخص کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ عموماً مردوں کو گھر کے اندر نہیں لایا جاتا تھا...... پھر ابھی اس کی سوچ کی سوئی یہیں اٹکی ہوئی تھی کہ مراد نے کمرے سے رفیقہ کو آواز دی۔

رفیقہ کو پھر حیرت کا جھٹکا لگا کیونکہ وہ مردوں کے سامنے نہیں آتی تھی پھر مراد نے اُسے کیوں آواز دی۔ چاولوں کا تھال وہیں چھوڑ کر وہ دوپٹہ ٹھیک کرتی ہوئی کمرے کی طرف چل دی۔

کمرے میں وہ آدمی چہرے پر 'نو لفٹ' کا بورڈ لگائے صوفے پر بیٹھا تھا۔ مراد نے اُسے دیکھا تو بولے۔

''آؤ رفیقہ...... ان سے ملو۔ یہ ہماری بیٹی چندا کے والد بزرگوار ہیں۔'' رفیقہ اب سمجھ گئی کہ مراد کی اس قدر پذیرائی کا مطلب کیا ہے۔ اس نے سلام کیا جبکہ اس اکھڑ شخص نے بدبدا کر منہ ہی منہ میں اس کا جواب دیا۔ وہ شخص سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ جبکہ مراد رفیقہ سے کہہ رہا تھا کہ وہ کھانے پینے کا بندوبست کرے۔''

''نہیں!'' اس شخص نے ہاتھ اٹھا کر اُسے روکتے ہوئے کہا۔ ''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں دراصل یہ کہنے کے لیے آیا تھا کہ عدنان اور چندا کی شادی نہیں ہو سکتی۔ میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔''

''کیا......؟'' مراد اور رفیقہ دونوں بھونچکے رہ

گئے۔ رفیقہ کو لگا جیسے اس کے جسم سے جان نکل رہی ہو۔ دوسرے کمرے میں عدنان ساری باتیں سن رہا تھا۔ وہ چندا کے والد کا سن کر پذیرائی کے لیے آنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی بات سن کر ٹھٹک کر رُک گیا۔ مراد دھیمی آواز میں اس سے پوچھ رہا تھا۔

''جناب! ہم جان سکتے ہیں کہ آپ نے یہ فیصلہ کیوں کیا۔ جبکہ عدنان اور چندا ایک ساتھ کام کرتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ جب بچے آپس میں یہ رشتہ نبھانا چاہتے ہیں تو ہم بڑے کیوں ان کی راہ کی دیوار بنیں۔''

''بس!'' وہ ایک اکھڑ پن کے ساتھ بولا۔ ''میں نے کہہ دیا نا کہ میں یہ رشتہ نہیں کرنا چاہتا۔''

''لیکن بھائی صاحب! آپ تفصیل تو بتایئے کہ کس بنیاد پر آپ نے یہ فیصلہ کیا۔'' اب کہ رفیقہ نے ملتجی آواز میں اس سے پوچھا۔

''تفصیل میں نہ جاؤ تو بہتر ہوگا۔ کیونکہ مجھے بولتے ہوئے شرم نہیں آئے گی۔ لیکن تم لوگوں کو سنتے ہوئے شرم آئے گی۔'' اس کی آواز حد درجے کڑوی تھی۔

''ایسی کیا بات ہے جناب! جس کے سننے میں ہمیں شرم آئے گی۔'' مراد قدرے حیرت سے بولا۔

''سننا چاہتے ہو تو سنو! میں ایک مزدور کے بیٹے سے اپنی بیٹی کی شادی کبھی نہیں کروں گا۔ قیامت تک نہیں...... اگر تم اپنی پرانی حیثیت بھول گئے ہو تو میں یاد کرواؤں۔ وہ ایک کمرے کا خستہ مکان اور......''

دروازہ ایک دھاڑ کے ساتھ کھلا اور عدنان کمرے سے باہر آ گیا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر چندا کے باپ کو بولنے سے روکا اور تیز آواز میں بولا۔

''بس...... آگے ایک بات بھی نہ کریں۔ مجھے اپنے ماں باپ پر فخر ہے جنہوں نے محنت مزدوری کی اور ہمیں پڑھایا لکھایا اور باعزت زندگی دی۔ مجھے فخر ہے کہ میرا باپ مزدور ہے۔ اور میں ہزاروں چندا ان پر وار کر سکتا ہوں۔''

وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

''آپ مجھے کیا ٹھکرائیں گے، جایئے اپنی بیٹی کو بتا دیجیے کہ اُسے میں نے ٹھکرا دیا۔ وہ اگر سونے کی بھی بن کر آئے تو میں اُسے اپنی شریک زندگی نہیں بناؤں گا کہ جس لڑکی کا باپ اتنی چھوٹی سوچ رکھتا ہو۔ وہ لڑکی کیا کسی کا گھر بسائے گی۔''

چندا کا باپ حیرت سے آگ بگولہ ہوتا اُس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی اتنی بے عزتی ہو سکتی ہے۔ شاید وہ توقع کر رہا تھا کہ یہ لوگ اس کی منت سماجت کریں گے لیکن یہاں سب کچھ الٹا ہو گیا تھا۔

''آپ تشریف لے جائیں اور دوبارہ ایک مزدور کے گھر میں آنے کی ہمت نہ کریں۔'' عدنان کا لہجہ شدتِ جذبات سے بھیگنے لگا تھا۔ چندا کا باپ تو اب سب کو تیز نظروں سے گھورتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا جبکہ عدنان نے ماں باپ دونوں کو اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا اور سرشاری سے کہنے لگا۔

''میرے لیے میرے ماں باپ عظمت کے وہ مینار ہیں جن کی بلندی تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔''

رفیقہ تو شدتِ جذبات سے زار و قطار رونے لگی جبکہ مراد کو لگ رہا تھا، جیسے اچانک اس کا قد و قامت بہت بڑھ گیا ہو، جیسے اس کے بیٹے نے اُسے زمین سے آسمان پر پہنچا دیا ہو۔

نیک اولاد واقعی خدا کی رحمت ہوتی ہے۔ آج عدنان نے اس کا سر فخر سے اونچا کر دیا تھا۔

☆☆......☆☆☆

رحمٰن، رحیم، سدا سائیں

''آپ کی بھابی بیگم کو یہ خوف لاحق ہوگیا ہے کہ اس بج دھج کو دیکھتے ازل سے گھائل عبداللہ محترم پوری طرح گھائل نہ ہو جائیں اور منگنی سے نکاح پر اڑنے والے حضرت رخصتی کا شوشا چھوڑ دیں تو مانی تو انہی کی جاتی ہے۔ سو یہ آڑ پر پردہ کھڑا کر دیا۔'' اس کی شوخی......

زندگی کے ساتھ سفر کرتے کرداروں کی فسوں گری، ایمان افروز ناول کا اٹھارھواں حصہ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بیک وقت حال و ماضی کے دریچوں سے جھانکنے والی یہ کہانی دیا سے شروع ہوتی ہے۔ جسے مرتد ہونے کا پچھتاوا، ملال، رنج، دکھ اور کرب کا احساس دل و دماغ کو شل کرتا محسوس ہوتا ہے۔ جو رب کو ناراض کر کے وحشتوں میں مبتلا ہے۔ گندگی اور پلیدگی کا احساس اتنا شدید ہے کہ وہ رب کے حضور سجدہ ریز ہونے میں مانع رکھتا ہے۔ مایوسی اس کی اتنی گہری ہے کہ رب جو رحمٰن ورحیم ہے، جس کا پہلا تعارف ہی یہی ہے۔ اسے یہی بنیادی بات بھلائے ہوئے ہے۔ دیا جو درحقیقت علیزے ہے اور اسلام آباد چاچا کے ہاں میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے مکین ہے۔ یوسف کرسچن نوجوان جو اپنی خوبروئی کی بدولت بہت سی لڑکیوں کو استعمال کر چکا ہے۔ علیزے پر بھی جال پھینکتا ہے۔ علیزے جو دیا بن کر اس سے ملتی ہے اور پہلی ملاقات سے ہی یوسف سے متاثر ہو چکی ہے۔

یہ ملاقاتیں چونکہ غلط انداز میں ہو رہی ہیں۔ جبھی غلط نتائج مرتب کرتی ہیں۔ یوسف ہر ملاقات میں ہر حد پار کرتا ہے علیزے اسے روک نہیں پاتی مگر یہ انکشاف اس پر بجلی بن کر گرتا ہے کہ یوسف مسلمان نہیں ہے۔ دنیا میں آنے والے اپنے ناجائز بچے کو باپ کا نام اور شناخت دینے کو علیزے یوسف کے مجبور کرنے پر اپنا مذہب نا چاہتے ہوئے بھی چھوڑ کر عیسائیت اختیار کرتی ہے مگر ضمیر کی بے چینی اسے زیادہ دیر اس پر قائم نہیں رہنے دیتی۔ وہ عیسائیت اور یوسف دونوں کو چھوڑ کر رب کی ناراضگی کے احساس سمیت نیم دیوانی ہوتی سرگرداں ہے۔ سالہا سال گزرنے پر اس کا پھر سے بریرہ سے ٹکراؤ ہوتا ہے جو خیالات کی چکی میں پس کر خود بھی سراپا تغیر کی زد میں ہے۔ علیزے کی واپسی کی خواہاں ہے اور علیزے کی مایوسی اور اس کی بے اعتباری کو اُمید میں بدلنا چاہتی ہے۔ مگر یہ اتنا آسان نہیں۔

علیزے اور بریرہ جن کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے ہے۔ بریرہ علیزے کی بڑی بہن مذہب کے معاملے میں بہت شدت پسندانہ رویہ رکھتی تھی۔ اتنا شدت پسندانہ کہ اس کے اس رویے سے اکثر اس سے وابستہ رشتوں کو تکلیف سے دوچار ہونا پڑا۔ خاص کر علیزے...... جس پر علیزے کی بڑی بہن ہونے کے ناتے پوری اجارہ داری ہے۔ عبدالغنی ان کا بڑا بھائی ہے۔ بریرہ سے بالکل متضاد صرف پرہیزگار نہیں عاجزی وانکساری جس کے ہر انداز سے جھلکتی ہے اور اسیر کرتی ہے۔ درپردہ بریرہ اپنے بھائی سے بھی خائف ہے۔ وہ صحیح معنوں میں پرہیزگاری و نیکی میں خود سے آگے کسی کو دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ ہارون اسرار شوبز کی دنیا میں بے حد حسین اور معروف شخصیت کے طور پر جانا جاتا ہے۔ گھر کی دینی محفل میں وہ بریرہ کی پہلے آواز اور پھر حسن کا اسیر ہو کر
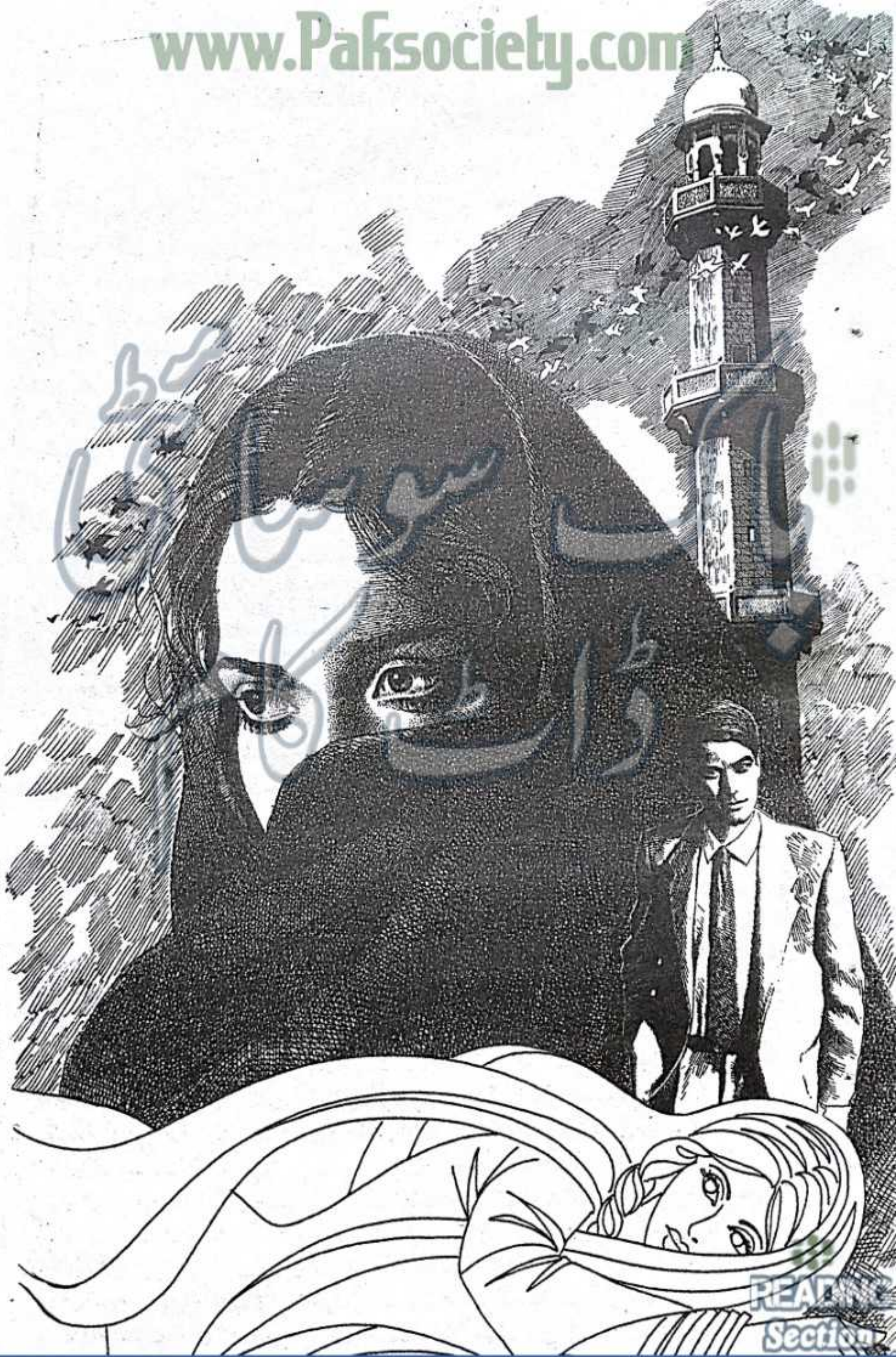
اس سے شادی کا خواہاں ہے۔ مگر بریرہ ایک گمراہ انسان سے شادی پر ہرگز آمادہ نہیں۔ ہارون اس کے انکار پر اس سے بات کرنے خود ان کے ہاں آتا ہے اور شوبز تک چھوڑنے پر آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے اسے رضا مند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہیں اس موقع پر اس کی پہلی ملاقات عبدالغنی سے ہوتی ہے۔ ہارون اسرار کسی بھی صورت عبدالغنی کو اس رشتہ پر رضامندی پر التجا کرتا ہے۔ عبدالغنی سے تعاون کا یقین پا کر وہ مطمئن ہے۔ اسے عبدالغنی کی باوقار اور شاندار شخصیت بہت بھاتی ہے۔ محلے کا اوباش لڑکا علیزے میں دلچسپی ظاہر کرتا ہے۔ جس کا علم بریرہ کو ہونے پر بریرہ علیزے کی کردار کشی کرتی ہے۔ علیزے اس الزام پر سوائے دل برداشتہ ہونے کے اور کوئی صفائی پیش کرنے سے لاچار ہے۔

اسامہ ہارون اسرار کا چھوٹا بھائی حادثے میں اپنی ٹانگیں گنوا چکا ہے۔ ہارون کی می اپنی یتیم بھتیجی سارہ سے زبردستی اس کا نکاح کراتی ہیں۔ جس کے لیے اسامہ ہرگز راضی نہیں اور نہ ہی سارہ کو اس کے حقوق دینے پر آمادہ ہے۔ لیکن دھیرے دھیرے سارہ کی اچھائی کی وجہ سے وہ اس کا اسیر ہونے لگتا ہے اور بالآخر اس کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ لاریب ہارون کی چھوٹی بہن جو بہت لاابالی نظر آتی ہے۔ ہارون کے ہمراہ کالج واپسی پر پہلی بار عبدالغنی کو دیکھ کر اس کی شخصیت کے سحر میں خود کو جکڑا محسوس کرنے لگتی ہے۔ لاریب کی دلچسپی عبدالغنی کی ذات میں بڑھتی ہے۔ جسے بریرہ اپنی منگنی کی تقریب میں خصوصاً محسوس کر جاتی ہے۔ لاریب محبت کی راہوں کی تنہا مسافر ہے۔ عبدالغنی انجان بھی ہے اور لاتعلق بھی۔ لاریب کے لیے یہ بات بہت تکلیف کا باعث ہے کہ وہ کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرے گا۔ علیزے لاریب کی ہم عمر ہے۔ دونوں میں دوستی بھی بہت ہو چکی ہے۔ وہ لاریب کی اپنے بھائی میں دلچسپی کی بھی گواہ ہے مگر وہ لاریب کی طرح ہرگز مایوس نہیں ہے۔

شادی کے موقع پر بریرہ کا رویہ ہارون کے ساتھ بھی بہت لیا دیا اور سردمہری نہیں حاکمیت آمیز بھی ہے۔

اسے ہارون کے ہر اقدام پر اعتراض ہے۔ وہ اس پر ہر قسم کی پابندیاں عائد کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھتی ہے اور اس کی ساتھی اداکارہ سوہا کی ہارون سے بے تکلفی اسے سخت گراں گزرتی ہے۔ می کو اپنی بیٹی کا عبدالغنی جیسے نوجوان میں دلچسپی لینا ایک آنکھ نہیں بھاتا جبھی ایک معمولی بات پر وہ لاریب کے سامنے عبدالغنی کی بے حد تحقیر کرتی ہیں۔ اس سے پہلے وہ لاریب کو بھی جتلا چکی ہوتی ہیں کہ وہ ایسے خواب دیکھنا چھوڑ دے۔ لاریب کو عبدالغنی سے روا رکھا جانے والا می کا رویہ بغاوت پر ابھارتا ہے۔ وہ تمام لحاظ بھلائے جواب تک اس کے قدموں کو اس راہ پر آگے بڑھنے سے روکے تھے۔ اپنا گھر چھوڑ کر عبدالغنی کے پاس آ کر عبدالغنی سے خود کو اپنانے کی گزارش کرتی ہے۔ عبدالغنی اس کی جذباتی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اسے بہلا، سمجھا کر واپس بھیجتا ہے۔ مگر لاریب اس مصالحانہ عمل کو سمجھے بغیر اسے اپنی ریجیکشن اور تذلیل سمجھتے ہوئے شدید ہیجان میں جتلا ایکسیڈنٹ کروا بیٹھتی ہے۔ می اس کی حالت پر حراساں جبکہ لاریب اسی ہسٹریائی کیفیت میں جتلا عبدالغنی کے حوالے سے اپنی ہر شدت اور شدت پسندانہ بے بسی ان کے سامنے عیاں کر جاتی ہے۔ می جو بریرہ کے حاکمانہ رویے اور ناشکرانہ انداز کی بدولت سخت دل برداشتہ ہیں اور اپنی بیٹی کو اس کے بھائی کے حوالے کرنے میں شامل ہیں۔ لاریب کی خوشی کی خاطر اس شادی پر بالآخر آمادہ ہونے پر ایک بار پھر مجبور ہو جاتی ہیں۔ لاریب کی دائمی مسکراہٹ کی چاہ انہیں عبدالغنی کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کرتی ہے۔

بریرہ لاریب کو ناپسند کرتی ہے۔ جبھی اسے یہ اقدام ہرگز پسند نہیں آتا مگر وہ شادی کو روکنے سے قاصر ہے۔ لاریب عبدالغنی جیسے منکسر المزاج بندے کی قربتوں میں جتنا سنور لی ہے۔ ہارون بریرہ کے حوالے سے اسی قدر اذیتوں کا شکار ہے۔ لیکن اس وقت تنہا ہوتی ہے۔ جب وہ علیزے کے حوالے سے اس پر الزام عائد کرتی ہے۔ صرف ہارون نہیں...... اس سطحی حرکت کے بعد علیزے بھی بریرہ سے نفرت پہ مجبور ہو جاتی ہے۔ وقت کچھ اور آگے سرکتا ہے۔ بریرہ کے دل شکن رویے کے باوجود ہارون اس کی توجہ کا منتظر بار بار اس کی طرف پیش رفت کرتا ہے۔ اس خواہش کے ساتھ کہ وہ بھی لاریب کی طرح سدھار کا متمنی ہے۔ مگر بریرہ جو علیزے کی بے راہ روی کا باعث خود کو گردانتی ہے اور احساسِ جرم میں جتلا رب کو منانے ہر صورت علیزے کی واپسی کی ملتمس ہے۔ ہارون کے ہر احساس سے گویا بے نیاز ہو چکی ہے۔ ہارون اس بے نیازی کو لاتعلقی اور بے گانگی سے تعبیر کرتے ہوئے مایوسی کی انتہا۔ وہ گہرائیوں میں اترتا نا صرف شوبز کی دنیا میں دوبارہ داخل ہوتا ہے بلکہ ضد میں آ کر بریرہ کو جھنجوڑنے کی خاطر سوہا سے شادی بھی کر لیتا ہے۔ علیزے کے حوالے سے بالآخر بریرہ کی دُعائیں مستجاب ہوتی ہیں۔ لیکن تب تک ہارون کے حوالے سے گہرا نقصان اس کی جھولی میں آن گرا ہوتا ہے۔

علیزے کی واپسی کے بعد عبدالغنی سمیت اس کے والدین بھی علیزے کے رشتے کے لیے پریشان ہیں۔ علیزے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد خود بھی یہ علم بانٹ رہی ہے۔ عبدالہادی اپنے روحانی استاد کے زیرِ تربیت ایک کامل مومن کی شکل میں ان کے سامنے ہے۔ وہ اسے نور کی روشنی پھیلانے کو ہجرت کا حکم دیتے ہیں۔

عبیر ایک بدفطرت عورت کے بطن سے جنم لینے والی باکردار اور باحیا لڑکی ہے۔ جسے اپنی ماں بہن کا طرزِ زندگی بالکل پسند نہیں۔ وہ اپنی ناموس کی حفاظت کرنا چاہتی ہے۔ مگر حالات کے تارِ عنکبوت نے اسے اپنے منحوس پنجوں میں جکڑ لیا ہے۔ کامیاب علاج کے بعد اسامہ پھر سے اپنے پیروں پر چلنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ اسامہ چونکہ فطرتاً کاملیت پسند ہے۔ کسی بھی چیز کا ادھورا پن اسے ہرگز گوارا نہیں مگر اس کے بیٹے میں بتدریج پیدا ہونے والی معذوری کا انکشاف اسے سارہ کے لیے ایک سخت گیر شوہر، متکبر انسان کے طور پر متعارف کراتا ہے۔ وہ ہرگز اس کمی کے ساتھ بچے کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ عبیر کو حالات اس نہج پر پہنچا دیتے ہیں کہ وہ ایک مسجد میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اُس کی شرافت دیکھ کر مؤذن صاحب اُسے اپنی پُرشفقت پناہ میں لے کر اُس کی ذمے داری قبول کر لیتے ہیں۔ اُم جان اور بابا جان حج کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ عبدالغنی سے مؤذن صاحب بہت متاثر تھے۔ وہ اُس سے اپنی اِس پریشانی کا ذکر کرتے ہیں اور اُسے قابلِ بھروسہ جان کر عبیر کو عقد میں لینے پر زور دیتے ہیں۔ عبدالغنی انتہائی مجبوری کی حالت میں اُن کا یہ فیصلہ قبول کر کے عبیر سے نکاح کر لیتا ہے۔ یہ سب کچھ اتنی اچانک ہوتا ہے کہ وہ لاریب سے اِس بارے میں کوئی ذکر تو کجا مشورہ بھی نہیں کر پاتا۔ عبیر کو لے کر عبدالغنی گھر آ جاتا ہے۔ لاریب کے لیے یہ سب کچھ سہنا آسان نہیں ہوتا، وہ اُسی وقت گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ چونکہ گھر میں کوئی بڑا نہیں ہوتا، اِس لیے لاریب کو سمجھانا عبدالغنی کے بس سے باہر تھا۔ علیزے، عبدالہادی کے ساتھ اُس کی مام سے ملنے اُن کے آبائی گھر چلی جاتی ہے۔ جب عبدالہادی علیزے کو اپنی ماں سے ملوانے کے لیے کہتا ہے تو وہ ایک غیر مسلم عورت سے ملنے کے لیے فوری طور پر انکار کر دیتی ہے۔ عبدالہادی کے لیے یہ ایک بہت بڑا جھٹکا تھا۔ کیونکہ اُس کی ماں بیٹے کی محبت میں اسلام قبول کر چکی تھیں۔ علیزے بدگمان تھی مختلف مواقع پر عبدالہادی کو پرکھنے کے بعد بالآخر اپنا دل صاف کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔ ہارون اسرار کا رویہ بریرہ سے بہت برا ہو جاتا ہے اور وہ اُسے اپنے ساتھ اسلام آباد اپنی دوسری بیوی کے ساتھ چلنے کے لیے کہتا ہے۔ بریرہ اسے بھی اپنا امتحان مان کر راضی ہو جاتی ہے۔ ہارون اسرار کی دوسری بیوی، پہلی بیوی کو برداشت نہیں کر پاتی اور اُس سے اپنے نام لکھی گئی جائیداد اور روپے پیسے لے کر طلاق لے لیتی ہے۔ بریرہ اور ہارون پھر سے محبت کے بندھن کو جوڑنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ عبدالغنی کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ لاریب اور عبیر میں اس حادثے کے بعد دوستی ہو جاتی ہے۔

(اب آپ آگے پڑھیے)

''یہ کیا بات ہوئی؟ اتنی اچھی لگ رہی ہو۔ اتنی ساری تیاری کا فائدہ اتباع! پھر اب تو نکاح بھی ہو گیا ہے۔ ساتھ بیٹھنے اور رسم کرنے میں کوئی حرج ہے بھلا......؟''

قدر کو یہ سن کر بے حد اختلاف لاحق ہو گیا تھا کہ اتباع رسم کے لیے عبداللہ کے ساتھ بیٹھنے میں انکاری ہے۔

''بس مجھے نہیں بیٹھنا۔ مجھے سخت شرم آ رہی ہے قدر! بابا جان اور بھائی جان بھی وہاں ہوں گے۔ پھر عبداللہ کا بھی پتا ہے تمہیں۔'' اس کے چہرے پر حیا کا، گریز کا سنگم تھا۔ جو اسے مزید حسین بنا کر دکھلا رہا تھا۔ اس پہ اس کا روپ سروپ، ڈل گولڈن لہنگے میں وہ خود بھی گولڈن پری لگ رہی تھی۔ اتنی حسین، اتنی نازک، اس قدر پیاری کہ نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔

''یہ کھلا ظلم ہے۔ عبداللہ بھائی کے ساتھ، اچھے خاصے ظالم ہو تم دونوں بہن بھائی۔'' وہ ناک چڑھا کر تجزیہ پیش کر رہی تھی۔ اتباع نے مسکراہٹ دبا کر اُسے دیکھا۔

''تم بتاؤ...... عبداللہ کی فکر چھوڑ دو۔ میں نے سنا ہے تم پوری تیاری کر چکی تھیں۔ بھائی نے کیا کہا ایسا کہ یہ مقدس سا روپ اپنا لیا۔''

اتباع کی نگاہوں میں اس کے لیے ستائش تھی۔ جو اس وقت پیروں کو چھوتی فراک میں ملبوس تھی۔ دوپٹہ بہت سلیقے سے اوڑھا ہوا تھا۔ باقاعدہ پنوں کی مدد سے سیٹ کر کے، یہ خالصتاً مشرقی روپ اس کی نزاکت اور دلکشی کو ایک انوکھا تاثر دے کر اسے کتنا پیارا دکھلا رہا تھا۔ وہ اتنی جاذب نظر، اس قدر حسین تھی کہ ہر لباس اس کے تن پر سج کر خود پر نازاں ہو جایا کرتا۔ یوں جیسے بنا ہی اس

کے لیے ہو۔ اتباع کے اس سوال پر اس نے محض آہ بھری تھی۔ پھر اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے مدھم آواز میں گویا ہوئی تھی۔

ابھی تو کھال ادھڑنی ہے اس تماشے میں
ابھی دھمال میں جوگی نے سانس ہارا ہے

''اور مزید یہ کہ......''

عشق کے علاقے میں
حکمِ یار چلتا ہے

''تو میری جان! قصہ مختصر یہ کہ چکور یہ بھی جانتا ہے کہ چاند کی تمنا لاحاصل ہے۔ پھر بھی اس کی نہ جستجو ختم ہوتی ہے۔ نہ تمنا جاتی ہے۔ وہ اپنے کام پہ لگے رہیں۔ میں اپنا کام کرتی رہوں گی۔ یعنی محبت کا کام...... کبھی تو پتھر پگھلے گا۔'' اس کے لہجے و انداز میں ایسی بے بسی تھی کہ اتباع بھی کسی حد تک گھائل ہو کر رہ گئی۔ اس نے بے اختیار اسے گلے سے لگا لیا تھا۔ بہت محبت سے نرمی سے اس کا گال سہلایا۔

''اپنے آپ کو کسی غیر کی نگاہ سے دیکھنا اور سنوارنا چھوڑ دو قدر! اور اللہ کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دو۔ تم دیکھو گی، جانو گی کہ ہر چیز کا رنگ تبدیل ہو گیا ہے۔ پھر دنیا کانٹے چبھوئے یا پھول پیش کرے۔ انسان ہر حال میں مسکراتا رہتا ہے۔'' قدر نے اس کی بات سنی تھی۔ سمجھی تھی اور یاسیت سے مسکرانے لگی۔

''میں بہت غیر مناسب ہوں اتباع! کسی بھی محبت کے انتخاب کے لیے۔ مجھے تو اک عام سے انسان سے محبت کرنی نہیں آ رہی۔ اللہ کا مقام تو اتنا بلند ہے کہ میں خود کو بے حد حقیر پاتی ہوں۔''

اس کی آواز میں نمی گھلنے لگی۔ اتباع اس سے قبل کہ کچھ کہتی دروازہ کھلا اور بریرہ کے ساتھ امن اور سارہ چلی آئیں۔ سارہ اور اسامہ دو دن پہلے ہی فیملی کے ساتھ پہنچے تھے اور جیسے خوشی دوبالا ہو گئی تھی ہارون اسرار کی فیملی کی۔ لاریب بھی مطمئن تھی۔ عرصے بعد وہ سب بہن بھائی اکٹھے ہوئے تھے بچوں سمیت۔

''ماشاء اللہ! چاند سورج کی جوڑی ہے ہمارے بچوں کی۔'' بریرہ کے بعد سارہ نے بھی اسی والہانہ انداز میں اتباع کو گلے لگا کر پیار کیا تو اتباع جھینپ گئی تھی۔

''مگر چاند سورج کبھی ایک نہیں ہوتے ہیں آنٹی۔ اس لیے ہمیں یہ مثال نہیں دینی چاہیے۔'' قدر نے شرارت سے کہا تو سبھی ہنس پڑی تھیں۔

''مگر فی الحال تو انہیں چاند سورج کی جوڑی ہی کہنا چاہیے۔ کیونکہ آپ کا چاند ہمارے سورج کو نزدیک نہیں آنے دے رہا۔'' امن کی شرارت بھری برجستگی سے محفل میں ہنسی کی جھنکار بکھر گئی تھی۔ سب سے بلند قہقہہ قدر کا ہی تھا۔

''پھر تو سورج خاصا گرم ہو گا۔ ہے ناں؟'' اس نے ہنسی کے دوران کہا تھا۔ اتباع کے چہرے کی شرمیلی مسکان اسے مزید شرارت پہ اکسا رہی تھی۔

''ایسا ویسا! سمجھ لیں سوا نیزے پر ہے۔ جو بھی پاس آیا جلا کر بھسم کر دے گا۔'' امن نے حظ لیتے ہوئے ٹکڑا لگایا۔ قدر کی ہنسی مزید بڑھی۔ وہ لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ جبکہ سارہ اور بریرہ اسے بہت پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ اس نے گہرا سانس کھینچا پھر تائیدی انداز میں بریرہ کو دیکھنے لگی۔

''ویسے خالہ خانی یہ ہے تو زیادتی ناں......؟ میں سمجھا رہی ہوں مگر اثر نہیں ہو رہا ہے اس پر۔'' وہ بسوری تھی۔ بریرہ نرمی سے مسکرا دیں۔

''ہمیں اپنی بیٹی کی مرضی بہت عزیز ہے۔ یہ بہت شائی ہے۔ عبداللہ کو بھی اندازہ ہے۔'' ان کا

جواب قدر کو بدمزا کر گیا تھا۔
"بیٹی کا احساس ہے بیٹے کا نہیں۔ اتنی خوبصورت لگ رہی ہے۔ سب سے زیادہ حق ہی ان کا تھا کہ وہ دیکھتے۔" اس نے ناک چڑھائی تھی۔ سب ایک بار پھر ہنس دیں۔
"چلو تمہاری بار ہم یہ زیادتی نہیں ہونے دیں گے۔ تمہیں لازماً ساتھ بٹھا دیں گے۔" سارہ نے اس کو چھیڑا گویا غم غلط کرنا چاہا۔ وہ اس طرح بلش ہوئی کہ قوس وقزح کے سارے رنگ اس کے حسین چہرے کو گلنار کر گئے تھے۔ پلکیں مزید عارضوں پر گر گئیں۔ سارہ تو جیسے فدا ہو گئی تھیں اس پر۔
"چشم بددور! کتنی پیاری بچی ہے۔" بے اختیاری کیفیت میں جھک کر اس کی پیشانی چومتے ان کے لہجے میں محبت کے ساتھ ساتھ عجیب سی کسک اور دکھ بھی اتر آیا تھا۔ ارسل احمد ان کا بیٹا! ان کا لخت جگر اولادوں میں سب سے بڑا۔ سب سے حسین خوبرو مگر ساری خوشیوں سے دور تھا۔ خاندان کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ مگر ابھی تلک اس کی شادی تو کیا منگنی بھی نہیں ہو سکی تھی۔ حالانکہ وہ ٹھیک تھا۔ نارمل تھا۔ کتنا سمجھدار تھا۔ کس درجہ فرمانبردار...... مگر اس مقام پر آ کر انہیں ہرا جاتا تھا۔ شادی کے نام پر بدکتا تھا، نام سننا بھی نہیں چاہتا تھا۔ چاہے وہ کتنا ہی تڑپتی تھیں۔ مجال ہے جو اس پر اثر ہو جائے۔ بریرہ ان کے دکھ کو سمجھتی تھیں۔ جبھی اس وقت بھی بہت نرمی سے ان کے کاندھے پر ڈھارس کے انداز میں ہاتھ رکھ دیا۔ سارہ نم آنکھیں جھپکتی ہوئیں ذرا سا سیدھی ہو کر خود کو سنبھالنے لگیں۔
"ہرگز پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں خود کروں گی بات ارسل سے۔ کان کھینچوں گی اس کے، کیسے نہیں مانے گا۔" انہوں نے سرگوشی میں تسلی دی تو سارہ کے لبوں پر جیسے بھولی بھٹکی دل گزیدہ مسکان اتری تھی۔
"ہم نے سوچا محترمہ بھابی بیگم نے تو باہر قدم رنجہ نہیں فرمانا۔ کیوں نہ ہم خود دیدار کر آئیں۔" امن جو ماں اور چچی کی کیفیت کو سمجھتی تھیں۔ ہلکے پھلکے انداز میں کہتی گویا ماحول پر چھا جانے والی افسردگی کا تاثر کم کرنے کی کوشش میں مصروف ہوئیں۔
"آپ کی بھابی بیگم کو یہ خوف لاحق ہو گیا ہے کہ اس سج دھج کو دیکھتے ازل سے گھائل عبداللہ محترم پوری طرح گھائل نہ ہو جائیں اور منگنی سے نکاح پر اڑنے والے حضرت رخصتی کا شوشا چھوڑ دیں تو مانی تو انہی کی جانی ہے۔ سو یہ آڑ پر پردہ کھڑا کر دیا۔"
اس کی شوخی نقطہ عروج پر تھی۔ سب سے زیادہ محظوظ اس بات پر امن ہوئی تھی۔ جبھی کھلکھلا کر زور سے ہنس پڑی۔ اتباع اتنا جھینپی کہ اسے ایک جھانپڑ بھی رسید کر دیا تھا۔
"حد ہوتی ہے بدتمیزی کی بھی قدر...... بڑوں کا بھی لحاظ نہیں۔" وہ اسے گھور رہی تھی مگر اس پر کہاں اثر تھا۔
"ظلم کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ سن لو میں عبداللہ بھائی کے ساتھ ہوں۔" اس نے ناک چڑھائی۔ اتباع نے گہرا سانس بھر لیا۔
"جاؤ اگر ان کے ساتھ ہو تو پھر انہی کو تسلی بھی دو۔ یہاں تمہارا کیا کام ہے۔" اتباع کو اس کی یہ طوطا چشمی ذرا جو بھائی ہو۔ جبھی خود بھی بے لحاظ ہو گئی۔ قدر ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔
"ٹھیک ہے جا رہی ہوں۔" اتباع کی گڑبڑاہٹ دیکھنے والی ہوگئی۔ بوکھلا کر اس کا ہاتھ پکڑا۔
"کیا ہو گیا ہے قدر! مذاق کر رہی تھی ناں میں۔"
"مگر میں مذاق نہیں کر رہی۔ میں جا رہی ہوں باہر۔ ذرا دیکھوں تو کیسے لگ رہے ہیں

عبداللہ بھائی! سننے میں آیا ہے مقابلہ تھا تم دونوں میں..... کہ کون زیادہ حسین نظر آتا ہے۔ مگر فیصلہ تو جبھی ہوگا اگر جو حریف آمنے سامنے ہوں۔'' اس کے انداز میں شرارت مچل رہی تھی۔ امن پھر ہنسنے لگی۔

''بھائی تو بالکل پرنس لگ رہے ہیں۔ قسم سے کچھ نہ کر کے ہی محض خوشی کی بدولت ان کی چھب نرالی ہے۔ میں تو یہی کہوں گی میرے بھائی ونر ہیں۔''

''اگر مقابلہ خوشی کا ہے تو پھر بلاشک وشبہ ونر عبداللہ بھائی ہی ہیں۔ مگر حسن کے معاملے میں تو دونوں حریفوں کو آمنے سامنے لانا پڑے گا۔'' قدر اپنی بات پر ڈٹی رہی۔

''کون سے حریفوں کو..... تمہیں اور بھائی جان کو؟'' اتباع نے پھر اپنا کمزور سا دفاع کرنا چاہا مگر آج قدر اسے جیتنے نہیں دے سکتی تھی۔

''بات کو پلٹو نہیں۔ ابھی ہمارا وقت نہیں آیا۔ جب آئے گا تو میں خود انہیں ونر قرار دے دوں گی۔'' وہ بھلا کسی سے کم تھی۔ اتنے اعتماد سے بولی تو ایک بار پھر سبھی ہنس پڑے۔

''ہاں تم سے یہی توقع کی جا سکتی ہے۔'' اتباع نے سرد آہ بھری۔

''میں ان کے مقابل کیوں آؤں.....؟ بھئی اچھی زندگی گزارنے کے لیے یہ ضروری ہے۔'' وہ مسکراہٹ دبا کر شوخی سے آنکھیں نچا رہی تھی۔ اتباع بھی جھینپ کر ہنس پڑی۔

''میں ذرا عبداللہ بھائی سے مل آؤں۔ دیکھوں ذرا کتنی صداقت ہے آپ کے بیانات میں۔'' وہ اب براہِ راست امن سے مخاطب ہوئی تھی۔ امن کی آنکھوں میں شرارت اترنے لگی۔

''ہمیں کیا پتا آپ کس سے ملنے جا رہی ہیں۔ ہمارے بھائی سے یا اتباع کے بھائی سے۔'' وہ ہنس رہی تھی۔ قدر نے قدرے دھیان سے اسے دیکھا۔

''اگر ایسا ہو بھی تو اعتراض کا حق کس کو ہے بھلا؟'' اس کا لہجہ و انداز ترش بھی ہوا، تیکھا بھی جسے سمجھا بنا امن نرمی سے مسکرا دی تھی۔

''بالکل بجا فرمایا، ہم ہرگز اعتراض کرنے والے نہیں۔ آپ تشریف لے جا سکتی ہیں۔''

قدر نے سر جھٹکا تھا اور پلٹ کر باہر نکل گئی۔ امن پھر سے اتباع سے باتوں میں مشغول ہو چکی تھی۔

☆......☆......☆

''بہت خوشی ہوئی عرصہ بعد آپ سے ملاقات کر کے ارسل احمد! کیسے مزاج ہیں؟'' عبدالعلی کے لہجے میں اس کے الفاظ کی سچائی رقم تھی۔ چہرے پر اندر کی صداقت کا عکس ایسے جھلملایا تھا کہ ارسل احمد کو یقین میں عار نہ رہا۔ جواباً بہت عرصہ بعد وہ محض دل رکھنے کو نہیں مسکرایا تھا۔ یہ مسکراہٹ خالص تھی۔ جو اس کے چہرے کو اُجالنے کا باعث بنی تھی۔

''تم بتاؤ عبدالعلی میں کیسا ہوں؟'' اور عبدالعلی آہستہ سے ہنس دیا تھا۔ کچھ دیر اسے متاثر کن نظروں سے دیکھتا رہا پھر بھرپور تجزیہ مختصراً الفاظ میں پیش کر دیا تھا۔

''الحمدللہ! ارسل احمد ہمیشہ کی طرح پرکشش، متاثر کن اور بے حد شاندار......'' اور ارسل احمد نے جس طرح اضطراب کی کیفیت میں ہونٹ بھینچ کر سر جھکایا وہ عبدالعلی کو گہرا سانس بھرنے پر مجبور کر گیا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ارسل کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''اپنے شروع سے اب تک نگاہ دوڑاؤ ارسل! پھر دیکھو کتنی عنایتیں ہوئی ہیں تمہارے اوپر رب کی، اور جانتے ہو ایسا کیوں ہوا ہے؟ صرف آنٹی کی دعاؤں کی بدولت، ان کی گڑگڑاہٹوں اور سجدوں میں گریہ وزاری کی اماں گواہ ہیں۔ وہ ہمیں بتاتی رہی ہیں انہوں نے تمہیں کیسے اللہ سے

بار بار مانگا ہے۔" ارسل تب بھی خاموش رہا تھا۔ عبدالعلی اسے دیکھ کر پھر مسکرانے لگا۔

"یہاں کیوں آنا نہیں چاہ رہے تھے؟" ارسل نے جواباً اسے شاکی نظروں سے دیکھا تھا اور متاسفانہ سانس بھری۔

"مجھ میں لوگوں کی ترحمانہ نگاہوں کو سہنے کا یارانہ نہیں ہے۔"

"ایسی باتوں کو ذہن سے نکالو گے ارسل احمد تو ہی زندگی کو جی سکو گے۔ ورنہ زندگی گھٹے گی۔ اور گھٹنے میں کتنی اذیت ہے۔ اس کا اندازہ تو تمہیں ہوگیا ہوگا بخوبی۔" ارسل خاموش رہا تو عبدالعلی اسے قائل کرنے کو مزید گویا ہوا تھا۔

"بولو ارسل احمد! عبادت اللہ کی ہوتی ہے اور خدمت اُس کی مخلوق کی...... اگرچہ یہ دونوں کام اللہ کے لیے ہوتے ہیں۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ خدمت رائیگاں نہیں جاتی۔ عبادت کا معیار اس قدر بلند ہوتا ہے کہ کوئی بھی اس معیار تک نہیں پہنچ سکتا۔ پھر بھی عبادت خواہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو...... ضائع ہوسکتی ہے مگر خدمت خواہ کتنی ہی معمولی اور حقیر کیوں نہ ہو۔ مقبول ہوتی ہے اور رد نہیں کی جاتی۔

محبت کا درجہ اس سے بھی کہیں افضل ہے۔ اس میں پیمانہ نہیں دیکھا جاتا۔ بس نیت دیکھی جاتی ہے۔ اخلاص دیکھا جاتا ہے۔ کہنے کا مقصد یہی ہے ارسل احمد...... آنٹی نے انہی دو خاص اور اہم کنجیوں کو بروقت استعمال کیا تھا۔ انکل کی خدمت سے اللہ کو منایا۔ اور تمہاری محبت میں ڈوب کر رب کو پکارا تھا۔ پھر دعا کیسے رد ہوتی۔ انہیں منانے کے ڈھنگ جو آتے تھے۔ تم ایسی ہستی کے دل کو توڑو گے؟ ایسا نہ کرو یار! نقصان اٹھاؤ گے ورنہ۔"

اور کچھ فاصلے پر موجود اس کی گفتگو کا ایک ایک لفظ تولتی دل میں اتارتی قدر کی آنکھیں اسے دیکھتے بھیگنے لگی تھیں۔ اس کے نزدیک تو اس سے بڑھ کر اور کوئی دغا باز نہیں تھا۔ وہ اس کی جائز ملکیت تھی۔ جسے دیکھنا نگاہ پہ گناہ کا بوجھ بھی نہیں دھرتا تھا۔ مگر وہ کتنی خوبصورتی سے اسے نظر انداز کیے جا رہا تھا۔ حالانکہ آج تو کم از کم ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس ستم گر کی خاطر اس نے اپنی ہر پسند سے اجتناب برت لیا تھا۔ اس کے رنگ میں رنگی گئی تھی۔ اور حاصل وصول کیا تھا؟ کچھ بھی نہیں۔ اک نظر التفات تو کیا، تشکرانہ بھی نہیں۔ وہ تو مشکور تک نہ تھا کہ اس نے...... اس جیسی ضدی، اکھڑ لڑکی نے اس کی بات مانی تھی۔ اس کی پسند کو اپنی پسند پہ، اپنی مرضی پر ترجیح دی تھی۔ کتنا غافل تھا وہ اس سے...... ہمیشہ کی طرح۔ اس کا دل خون ہونے لگا۔ لبوں پہ کبھی کی پڑھی ایک نظم کے مصرعے خود بخود مچلنے لگے۔

سنو لفظوں کے جادوگر!
محبت تو تمہیں ہر رنگ میں محسوس ہوتی ہے
کبھی وہ رنگ بھی لکھو
جو تم کو سوچ کر میری نگاہوں میں اترتے ہیں
وہ الفاظ جو دل سے زباں تک آ تو جاتے ہیں
ادا لیکن نہیں ہوتے
کبھی اس بے بسی کے رنگ کو تصویر کر دو ناں
میری خاطر اک ایسی نظم بھی تحریر کر دو ناں
جسے تم کو سناؤں تو تمہیں معلوم ہو جائے
میں کیوں خاموش رہتی ہوں

وہ چونکی تھی۔ عبداللہ کچھ فاصلے پر موجود اسے پکار رہا تھا۔ بلیک ٹو پیس سوٹ میں اس کی واقعی چھب نرالی تھی۔ حالانکہ اتنا تیار تو وہ ہمیشہ ہی رہتا تھا۔ آج صرف فتح کا، پالینے کا احساس تھا جو اس کے چہرے کو جگمگاہٹ عطا کر رہا تھا۔ وہ گہرا سانس

بھرتی اُٹھ کر اس کی جانب آ گئی۔
''جی حکم!'' وہ دانستہ مسکرائی تھی۔ عبداللہ اسے گھورنے لگا۔
''کوئی فائدہ ہے مجھے تمہارا...... اک ذرا سا کام نہ ہوسکا تم سے۔'' اس کے انداز میں بے بسی بے چارگی تھی۔
''یہ لڑکی مجھے واقعی ساری عمر تڑپائے گی، صاف لگ رہا ہے۔'' وہ بے حد عاجز ہوا تھا۔ قدر ہنسنے لگی۔ نگاہ بے اختیار عبدالعلی کی جانب اٹھ گئی۔
''ہاں میں بھی ایسا ہی سمجھتی ہوں۔ بہت کٹھور ہیں۔'' اس کا انداز آہ بھرنے والا تھا۔
''یہ طے ہے قدر کہ میں اتباع سے ملے بغیر، اسے دیکھے بغیر نہیں جاؤں گا۔ یہ تو صحیح معنوں میں توہین ہے میری۔
اب تو نکاح بھی ہو چکا۔ پھر اسے کیا اعتراض ہے۔'' وہ بے حد چڑ چکا تھا۔ قدر کچھ نہیں بولی۔
''تم ہیلپ کرو گی میری؟'' عبداللہ کے سوال پر اس نے گھبرا کر اسے دیکھا۔
''اللہ کا نام لیں بھائی صاحب! اس کے ہٹلر بھائی جان کا پتا ہے نا آپ کو۔ اگر بھنک بھی پڑ گئی نا تو بخشے گا نہیں مجھے۔''
''کچھ نہیں ہوگا پرامس! بس تم اتنا کرنا کہ اتباع کے کمرے سے سب کو نکال دینا۔ راہداری بھی ذرا صاف شفاف کر دینا۔ باقی میرا کام ہے۔ ابھی کچھ دیر میں کھانا لگ جائے گا۔ سب مصروف ہوں گے۔ ہرگز پرابلم نہیں ہوگی۔ اتباع تو اپنے کمرے میں ہی ہے۔''
چٹکی بجا کر کہتا وہ اسے واقعی بدحواس کر چکا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ عبداللہ نے ہاتھ اُٹھا کر اسے ٹوک دیا۔
''بس کچھ نہیں۔ قدر تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ عبدالعلی پر نظر رکھنا۔ وہ اِدھر نہ آئے۔'' اسے مزید کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر وہ وہاں سے ہٹ گیا تھا۔ پھر واقعی وہی کیا تھا اس نے جو وہ چاہتا تھا اور قدر کی جان پر بن گئی تھی۔ ویسے اسے ہمیشہ شکوہ رہتا تھا۔ عبدالعلی کبھی اس کی جانب متوجہ کیوں نہ ہوا۔ اور اب سب سے بڑا دھڑکا یہی تھا کہیں وہ اسے نہ دیکھ لے۔ اور دھڑکا کہتے ہیں آ گے، آ کر کر دیتا ہے۔ سو یہاں بھی وہی ہوا۔
عبدالعلی نے اسے دیکھا تو نہیں البتہ اپنے کسی کام سے اندرونی حصے کی جانب آیا تھا۔ اِدھر قدر برآمدے میں پنڈولم کی مانند جھولتی تھی۔ اِدھر سے اُدھر...... اِدھر سے اُدھر اور جب وہ اپنے دھیان میں مڑی اسی پل عبدالعلی بھی برآمدے کا موڑ مڑ کر اچانک سامنے آ گیا۔ دونوں ہی کو اس سامنے کا گمان نہیں تھا۔ دونوں ہی اپنے اپنے دھیان میں تھے۔ جبھی یہ تصادم بہت اچانک ہوا تھا۔ معنی خیزی تو کیا در آتی ان کے بیچ عبدالعلی اگر جھلایا تو قدر کی مارے تشویش کے حلق سے چیخ نکل گئی تھی۔ منہ پر ہاتھ رکھے وہ بے اختیار بے جان ہوتی ٹانگوں کے ساتھ نیچے بیٹھ گئی۔ رنگ جیسے پیلا پڑا تھا یہ بات ہی عبدالعلی کے لیے بے تحاشا تشویش کا باعث ٹھہری تھی۔ وہ سب کچھ بھلائے پریشان سا پنجوں کے بل اس کے سامنے جھک گیا۔
''کچھ غلط ہوا ہے! ہوا کیا ہے آپ کو؟''
قدر نے دل کی خوف سے سرسراتی دھک دھک میں اس کی گھمبیر آواز سنی تھی۔ اور نم پلکیں اُٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ کتنا قریب تھا۔ کتنا حسین تھا۔ مگر اتنا ہی کٹھور بھی پر اب متوجہ تھا تو یہ توجہ کتنی بھلی لگ رہی تھی۔ اسے اس کے سوا سب کچھ بھولنے لگا۔
''کچھ پوچھا ہے آپ سے...... سب کچھ چھوڑ

کر یہاں کیا کررہی تھیں؟'' وہ اس کی نظروں کا اٹھنا اور پھر ٹھہر جانا محسوس کرتا برہم ہونے لگا۔ اک فسوں اس کی آنکھوں کا بھی تھا۔ جس میں قید ہونا ناگوارا نہ تھا اسے جبھی بلا دریغ ڈانٹ ڈالا۔

''میرا پیر کتنی بے دردی سے کچلا ہے آپ نے۔ آپ کو کیوں احساس ہوگا۔ اب چلا نہیں جارہا ہے مجھ سے۔'' اس نے اپنا پیر ہاتھ میں دبوچ لیا تھا۔ عبدالعلی زور سے چونکا اور قدرے خفیف بھی۔

''معذرت...... مجھے پتا نہیں چلا کہ...... اور غلطی آپ کی بھی ہے کہ......''

''علی......! میری غلطیاں قصور نہ گنوائیں۔ جانتی ہوں لسٹ بہت لمبی ہے۔ بہتر ہے مٹی ڈال کر اس قصے پر، کسی کو بلا لائیں۔ سہارے کے بغیر مجھ سے چلا نہیں جائے گا اب۔'' اس کی بات قطع کر کے وہ درشتی سے بولی تھی۔ عبدالعلی نے بے پایاں حیرت کا شکار ہوتے اسے دیکھا۔ پھر جیسے مشکوک بھی ہوا تھا۔

''دیکھا نہیں ذرا...... کتنی چوٹ لگ گئی آخر کہ چلنا بھی دشوار ہوگیا۔ نازک مزاجی کی حد ہے۔ ہڈی تو نہیں ٹوٹ گئی ہوگی۔'' وہ جھلایا تھا جی بھر کے جبھی زبردستی اس کا ہاتھ ہٹا کر پیر کا معائنہ کرنا چاہتا تھا کہ قدر نے بے اختیار اس کا ہاتھ زور سے جھٹک دیا۔

''ٹوٹی اگر نہیں بھی ہے تو چیخ ضرور گئی ہے۔ اپنی تکلیف کا مجھے بہتر پتا ہے۔ بس کسی کو جا کر بھیج دیں۔'' اس کے انداز میں خفگی کا عنصر نمایاں تھا۔ عبدالعلی نے بغور اسے دیکھا پھر گہرا سانس بھرتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔

''اٹھو...... کھڑی ہو جاؤ۔'' انداز ایسا تھا کہ اِدھر وہ کھڑی ہوگی اِدھر اس نے سہارا دیا نہیں۔ قدر کے اس کے تیور بھانپ کر ہی چھکے چھوٹنے لگے۔

''میں نہیں ہورہی آپ سے جو کہا ہے وہ کردیں۔ نہیں تو جائیں۔'' نظریں چرا کر سرخ چہرے سمیت کہتی وہ عبدالعلی کو بہت دلچسپ، بہت انوکھی لگی۔

''کیوں کانشس ہورہی ہیں۔ اس میں رومینس کا کوئی بھی عمل دخل نہیں ہے۔ سو پریشان نہیں ہوں۔ نہ مجھے یہ خرافات پسند ہیں۔''

عبدالعلی کا پرتپش لہجہ چبھتا ہوا بھی محسوس کر کے قدر کی آنکھیں بہت تیزی سے بھیگیں۔ اس نے زخمی نظروں سے کچھ دیر اس کے پرکشش مگر مغرور چہرے کو دیکھا تھا۔

''آپ چلے جائیں یہاں سے عبدالعلی!'' چہرے کا رُخ پھیر کر وہ بھیگی آواز میں بولی تھی۔ عبدالعلی نے کاندھے جھٹکے اور ہلکا سا جھک کر اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ کر اپنے مقابل کھڑا کرلیا۔ وہ جتنا حیران ہوئی پھر جتنی شدت سے مچلی۔ عبدالعلی اسی قدر پُرسکون رہ کر کہہ گیا تھا۔

''انا اچھی چیز ہے۔ مگر جہاں نقصان کا باعث بنے وہاں اس سے دستبردار ہونا بہتر ہوتا ہے۔'' وہ اس کے شانے پر بازو دراز کر کے سہارا دینا چاہتا تھا۔ قدر تڑپ کر فاصلہ بڑھا گئی۔

''میرے نزدیک محبت محبت ہے اور ہمدردی بھیک اور خیرات کے علاوہ کچھ نہیں عبدالعلی صاحب......! مجھے آپ سے ہمدردی نہیں لینی۔''

اس کا انداز اتنا شدید تھا، اتنا پُرزور احتجاج رکھتا تھا کہ عبدالعلی لب بھینچتا ہوا پیچھے ہٹا اور کوئی لفظ مزید کہے بنا لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔ قدر کے لیے اپنی سسکیاں روکنا بے حد دشوار امر تھا۔ یہاں اس مقام پر اگر وہ چاہتا تو اپنی محبت کا ایقان بخش سکتا تھا اسے۔ مگر وہ ایسا کیوں کرتا اسے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے اس سے محبت ہی نہیں تھی۔

اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔ اسے صبر نہیں آ رہا تھا۔

☆......☆......☆

وہ واقعی بہت تھک گئی تھی۔ اتنے بھاری زیورات اور لباس...... وہ تو چوڑیاں اور ہلکے پھلکے ٹاپس تک پہننے کی عادی نہیں تھی۔ کجا ایک دم سے اتنا کچھ لادنا پڑ گیا تھا۔ الجھن سی الجھن تھی۔ کتنی مشکل سے اس نے لاریب کو قائل کیا تھا کہ وہ لباس تبدیل کرے۔

''بیٹے! ابھی مہمان موجود ہیں۔ جاتے ہوئے بھابی پھر ملنے آئیں گی آپ سے، بھائی جان بھی...... اچھا نہیں لگتا کہ آپ اتنے سادہ حلیے میں ہوں۔'' وہ ہچکچا رہی تھیں۔ جواباً اتباع نے ان کے گلے میں بازو حمائل کر دیے۔

''اماں پلیز! ماموں اور بہو ہرگز برا نہیں مانیں گے، میں جانتی ہوں۔ غیر تھوڑی ہیں وہ لوگ۔ ہمارے اپنے ہیں۔ پھر دیکھیں میری نماز کتنی لیٹ ہو گئی ہے۔ بارہ بج رہے ہیں۔ اور میں اتنی دیر تک کبھی نہیں جاگی اب حال برا ہو رہا ہے نیند سے۔''

''اچھا ٹھیک ہے، پڑھ لو پھر تم نماز۔'' لاریب نے اجازت دے دی تھی اور خود کمرے سے یہ کہہ کر چلی گئیں کہ اس کے لیے قدر کے پاس کھانا بھیجتی ہیں اس کا۔ اس نے گہرے اطمینان کا شکار ہوتے سب سے پہلے دوپٹے کی پنیں نکالنی شروع کی تھیں۔ بال تک دکھنے لگے تھے اس کے اس کھنچاؤ سے مسلسل۔ پندرہ منٹ اسی کام میں لگ گئے۔ اس نے پہلے احتیاط سے دوپٹا اُتار کر رکھا۔ پھر بالوں کی چوٹی سے لپٹی موتیے کی لڑی کو الگ کیا۔ سر کو قدرے سکون ملا تھا۔ پھر ٹٹول کر بندیا کو جکڑے ہوئے پنیں بالوں سے نکالیں اور انہیں بھی سائیڈ پر دھر دیا۔ اس کے بعد نیکلس کی باری آئی تھی۔ ہک ڈھیلی کر کے اس نے نیکلس گلے سے نکالنا چاہا مگر اس کا ڈیزائن کہیں بالوں میں اٹک گیا۔ وہ کراہ کر رہ گئی تھی۔

''اووف!'' اس کی آنکھوں میں نمی لہرا گئی۔ مگر کوشش کے باوجود نیکلس کو بالوں سے نہیں چھڑا سکی تو اس مشکل اور اُلجھن پہ عجیب سی کوفت کا شکار ہونے لگی تھی۔ تبھی دروازے پر آہٹ ہوئی اور کوئی اندر آ گیا۔ یہ عبداللہ تھا۔ جسے وہ دیکھنے سے قاصر رہی تھی۔ جبکہ عبداللہ اس کا بجلیاں گراتا ہوا یہ جلوہ دیکھتا صحیح معنوں میں گھائل ہو کر رہ گیا۔

''قدر......! پلیز ہیلپ می، دیکھو یہ نیکلس اٹک گیا ہے۔ نکال دو۔'' اس کی آواز میں بھی بے بسی تھی، جھنجلاہٹ تھی۔ عبداللہ چونکا تھا اور میکانکی انداز میں آگے بڑھ کر چند لمحوں کی تگ و دو سے اس کی پریشانی کو دور کر دیا۔ اتباع گہرا سانس بھرتی جیسے ہی سیدھی ہوئی قدر کی بجائے اسے روبرو پا کے دھک سے رہ گئی۔ پہلے اس کا رنگ فق ہوا تھا۔ پھر اسی قدر سرخ اور دھڑکنوں کا شور تو ایسا تھا کہ کانوں کے پردے پھٹنے لگے تھے۔

حسن کی ادا بہت قاتل ہے آج
دل والوں کی خدا خیر کرے

اس کا ہاتھ جس بے ساختگی میں دل پر گیا تھا۔ اور پھر جتنی بے تابی اور حجاب آمیز کیفیت میں اس نے لپک کر دوپٹا اٹھانا چاہا تھا۔ عبداللہ نے اس سے کہیں سرعت سے اس کا راستہ روک کر اسے شانوں سے تھامتے اپنے مقابل کر لیا تھا۔

''واقعی بہت ظالم ہو اتباع!'' وہ شکوہ بھی ایسے کر رہا تھا جیسے لاڈ اٹھا رہا ہو۔ اتباع کا تو جیسے شرم سے کٹ مرنے والا حال ہوا تھا۔ رنگت تمتماتی ہوئی، آنکھوں میں ہراس بھی حجاب بھی...... چہرے سے بھاپ نکل رہی تھی۔ اس پر اس کی بے

بسی لاچاری۔ وہ جیسے گنگ ہو چلی تھی۔

''پلیز!'' وہ جیسے سسکی، جسے کراہی، مگر دوسری جانب اثر کہاں تھا۔ وہ تو جیسے پیاسا صحرا تھا۔ اس کی نظریں سیرابی کی متمنی تھیں۔ وہ اس قدر فدا ہونے لگا۔

''ہاں ہاں...... بولیں۔ ارشاد کریں۔ حکم کریں۔'' وہ چہکنے لگا۔ پھر مزید شرارت پر اترا۔

تیرا حرف حرف آخریں
ذرا لب کشا تو ہو دلنشیں
مجھے رکھ گرفتِ فریب میں
تیرا جھوٹ بھی مجھے راس ہے

اتباع کی رنگت بالکل دہک گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپا تھا اور پیچھے ہٹانا چاہا۔ مگر آج عبداللہ کی چلنی تھی شاید۔

''جانتی ہیں کتنا تڑپایا ہے مجھے قدم قدم پہ، اس پر یہ آج کا ظلم...... اتباع بہت سزا دینے کو جی چاہ رہا ہے۔'' اس کا لہجہ مدھم تھا بوجھل تھا۔ اور بہت گستاخ بھی۔ اتباع کی جان سوکھنے لگی۔ دل تھمنے لگا۔

''پلیز چلے جائیں۔ کوئی بھی آسکتا ہے۔'' وہ جیسے گڑگڑائی۔ عبداللہ نے کاندھے جھٹک دیے۔

''آجائے ہرگز پروا نہیں۔ آج تو بس حساب ہوگا۔''

وہ کھل کر ہنسا۔ شاید اس کی حالت کا حظ لیا تھا۔ اتباع نے بے بسی سے لاچاری سے اسے دیکھا تھا۔ اور ہونٹ کاٹنے لگی۔ جبکہ وہ اتنی ہی دلچسپی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی بے چینی اتنی ہی سوا تر تھی۔

''عبداللہ! چلے جائیں۔ کوئی دیکھ لے گا تو میں مرجاؤں گی نظروں سے گر کر......'' وہ اب کے جیسے روہانسی ہوگئی۔ عبداللہ نے متاسفانہ سانس بھری اور ایک قدم اس کی جانب بڑھ کر اچانک بالکل غیر متوقع اسے بازوؤں کے حلقے میں کس لیا۔

غرور حسن میں شاہی جلال ہوتا ہے
پری رخوں کا سبھی کچھ کمال ہوتا ہے
بدن بھی حشر بپا دھڑکنوں میں کرتا ہے
پھر اس پہ چلنا قیامت کی چال ہوتا ہے
پناہ بادلوں میں ڈھونڈتا ہے ماہِ تمام
جو بے حجاب وہ زہرہ جمال ہوتا ہے
خدا ہی جانے اسے چوم لیں تو پھر کیا ہو......

اس کی مزاحمت، ہراس اور بوکھلاہٹ سے حظ اٹھاتے وہ اس کی سماعتوں میں سلگتے بھڑکتے جذبات ان الفاظ کی صورت انڈیل رہا تھا۔ جو اللہ جانے وہ ٹھیک سے سن بھی رہی تھی یا نہیں کہ اس کی سراسیمگی کا عالم ہی ایسا تھا جب عبداللہ نے ذرا سا توقف کر کے اس کے چہرے پر جھکتے شرارت سے کہا اور پھر اپنا استحقاق استعمال کیا تھا اور اس کا دہکتا ہوا رخسار چوم کر کھلکھلایا۔

جو گال نام سے بوسے کے لال ہوتا ہے
اگر وہ لب نظر آئیں تو زلف بھی دیکھو
ہر ایک دانے پہ موجود جال ہوتا ہے

وہ جتنا بھی سرشار تھا۔ مگر یہ بھی حقیقت تھی اتباع کے حواس مختل ہو چکے تھے۔ کوئی پیش نہیں چلی تو بے بسی کی انتہا پہ جاتے اس کے آنسو بہہ نکلے تھے۔ عبداللہ اس بن بادل برسات پر ہی پہلی بار گڑبڑایا۔

''اتباع!''

''پلیز چلے جائیں۔'' وہ سسکاری سی بھر کے بولی۔ اور اب کی مرتبہ دوپٹا اُٹھا کر اپنے گرد لپیٹ لیا۔ عبداللہ نے گہرا طویل سانس بھرا۔ انداز میں واضح شکست تھی۔

''چلا جاتا ہوں۔ مگر اک بات ماننی ہوگی

تمہیں اتباع! پلیز حکم نہیں التجا سمجھ لینا۔ بی کوز میں اب اس کا حق رکھتا ہوں۔'' وہ ملتجی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اتباع رخ پھیرے کھڑی رہی۔ البتہ خاموش گواہ تھی کہ وہ اس کی بات نہ صرف سن رہی ہے۔ بلکہ منتظر بھی ہے وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

''میں کال کروں گا۔ آپ بات کیا کریں گی مجھ سے۔'' اتباع نے گہرا سانس بھرلیا۔

''منگنی کی بجائے نکاح اسی لیے کیا تھا آپ نے؟'' وہ سخت شاکی ہوئی اور عبداللہ اس قدر زور سے ہنس پڑا تھا۔

''سمجھدار ہو، اس میں کیا شک...... میں اس سرکش اور ضدی لڑکی کو مکمل کنٹرول میں رکھنا چاہتا تھا۔'' اتباع کی پلکیں جھک گئیں۔ اس نے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔

''چلتا ہوں...... اس سے قبل کہ آپ کا خدشہ درست ثابت ہوجائے۔ یعنی کوئی آجائے۔'' وہ مسکرایا۔ اتباع کے تاثرات میں اضطراب بھی پایا جانے لگا۔

یوں جیسے بس نہ چلتا ہو اسے کمرے سے دھکیل دے۔ عبداللہ نے اسے الوداعی مگر بھرپور نظروں سے دیکھا اور واپس پلٹا۔ اتباع ڈھنگ سے ریلیکس بھی نہ ہو پائی تھی کہ وہ پھر دروازہ کھولتے کھولتے تھم کر اس سے مخاطب ہوگیا تھا۔

''اک بات اور......'' اتباع نے سٹپٹا کر اسے دیکھا وہ شریر انداز متبسم تھا۔

''ہر گستاخی معاف...... ایکچو لی......''

رُکا ہوا تھا میرا سانس میرے سینے میں
تجھے گلے نہ لگاتا تو گھٹ کر مرجاتا

''اور یقیناً اب ایسا تو نہیں چاہتی ہوں گی آپ بھی......'' وہ پھر پٹڑی چھوڑ کر ہنس رہا تھا۔ جبکہ اتباع اتنا جھینپی تھی کہ بے اختیار رُخ پھیر گئی۔

عبداللہ نے مخمور انداز میں گہرا سانس بھرا اور کھلے دروازے سے نکل گیا۔ اتباع ابھی تلک ہولے ہولے لرز رہی تھی۔ اسے خود پر حیرت بھی تھی۔ جس قسم کا تصور بھی محال تھا۔ وہ اس قسم کی صورت حال سے گزر کر بھی صحیح سالم کھڑی تھی۔ اس نے ہونٹ کاٹے اور آگے بڑھ کر کمرے کے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔ حالانکہ اب اس احتیاط کا فائدہ نہیں تھا۔ وہ پلٹ کر آنے والا نہیں تھا۔ مگر وہ ضرور اتنی خائف ہوگئی تھی۔ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ خود سے نظریں چراتی ہوئی۔ آئینے نے بتایا تھا، گواہی دی تھی۔ اس کا یہ روپ پہلے روپ سے کہیں بڑھ کر دلکش ہے۔ مگر وہ کہاں یقین کرسکتی تھی۔ ہر لحظہ اضطراب میں گھرتی جارہی تھی۔

☆......☆......☆

''پاپا جانی! واپس کب چل رہے ہیں ہم۔'' وہ عبدالہادی کے زانو پہ سر رکھے لیٹی تھی۔ بسور کر بولی تو عبدالہادی نے جھک کر اس کی صبیح پیشانی چوم لی۔

''میری جان! میری پیاری بیٹی! اُداس ہوگئی ہے کیا؟'' ان کی مشفقانہ نگاہوں میں ہلکی سی تشویش بھی ابھری۔

''ہاں، ہوگئی ہوں اُداس، ویسے بھی...... یہاں دل لگانے کو ایسا ہے کیا......'' اندر داخل ہوتے عبدالعلی کو نشانہ بناتے ہوئے اس نے بالخصوص جتلایا۔ انداز بے زار کن تھا۔ عبدالعلی نے علیزے کو دیکھ کر گہرا سانس بھرا اور عبدالہادی کو سلام کرتا کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔ ہاتھ میں موجود فائل علیزے کی جانب بڑھا دی تھی۔

''یہ آپ کا کام ہوگیا ہے بوجانی......''

''بہت شکریہ بیٹے!'' علیزے نے بے اختیار سکھ کا سانس بھرتے فائل پکڑ کر اسی وقت کھول لی۔

ورق گردانی کے دوران جیسے یہ اطمینان گہرا ہوا تھا۔ عبدالعلی عبدالہادی سے باتوں میں مشغول ہو چکا تھا کہ ایکدم اس نے قدر کی جانب رُخ پھیرا۔ وہ جو بہت مگن ہو کر اسے دیکھ رہی تھی کہ اس کے متوجہ ہونے پر اتنا کھسیائی۔ اس درجہ خفت زدہ ہوئی کہ نہ صرف چہرے کو پھیرا بلکہ اُٹھ کر بھی جانے کو کھڑی ہوگئی۔

''پاؤں کیسا ہے اب آپ کا......؟ چیک کرایا تھا، ہڈی فریکچر تو نہیں ہوگئی تھی۔'' قدر نے اچنبھے میں گھر کر ٹھٹکتے ہوئے اسے دیکھا۔ یوں جیسے یقین نہ آتا ہو وہ اسی سے مخاطب ہوا ہے۔ اس کے لبوں کے گوشوں میں مچلتی مسکان اس کی روح تک جھلسا کے رکھ گئی۔ قدر نے ہونٹ بھینچ لیے۔ جبکہ عبدالہادی اور علیزے چونکتے ہوئے متوجہ ہو چکے تھے۔

''کیا مطلب......کب چوٹ آئی تھی اور کیسے......؟'' سوال علیزے نے کیا تھا۔ عبدالہادی بھی تشویشناک نظروں سے قدر کو دیکھ رہے تھے۔ نگاہوں میں سوال بھی تھا۔ قدر کو دانت کچکچانے پڑ گئے۔ اسے صاف محسوس ہوا۔ عبدالعلی نے جان بوجھ کر یہ شوشا چھوڑا ہے۔

''کچھ نہیں ہوا تھا مما! پیر ذرا سا مڑ گیا تھا۔'' اس نے دانت بھینچ کر جواب دیا پھر عبدالعلی کو جتلانے کو بولی تھی۔

''آپ کو اب یاد آئی خیریت پوچھنے کی؟ چوبیس گھنٹوں بعد......؟'' انداز ملامتی تھا۔ وہ دھیمے سروں میں ہنس دیا۔ پھر براہِ راست اسے دیکھتے ہوئے جیسے وضاحتی انداز میں گویا ہوا تھا۔

''آپ تو اس کے بعد جیسے کہیں چھپ گئی تھیں۔ خیریت پوچھتا بھی تو کیسے......؟'' قدر نے اب کی بار ٹھٹک کر اسے دیکھا تھا۔ یہ اس کے انداز و اطوار نہیں تھے۔ پھر وہ بھلا ایسے کیونکر کر رہا تھا۔ معاً وہ جیسے کسی نتیجے پر پہنچی اور جلتی آنکھوں سمیت اُٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ دل ایک دم جیسے ہر شے سے بے زار ہو چلا تھا۔ اسے اپنا مستقبل خاصا تاریک نظر آ رہا تھا۔ سب کی نظروں میں بہت اچھا نظر آنے والا عبدالعلی کتنا منافق تھا۔ یہ تو بس وہ جانتی تھی۔ ساری عمر ایسے ہی گزرنی تھی طے ہوا۔ وہ سچی محبتوں کو ترستی رہے گی اور یہ شخص اپنے رشتوں کو دھوکہ دیتا رہے گا۔ اس کا دل چاہا تھا بہت سارا روئے مگر اس نے خود کو اس کی اجازت نہیں دی۔ معاً عبدالعلی کی کھنکار پہ بے ساختہ گردن موڑی۔ وہ اس سے اوپری زینے پر کھڑا تھا۔ جس پر وہ بیٹھی تھی۔ قدر نے بے ساختہ نگاہ پھیرلی۔ بلیک شلوار سوٹ میں اس کی غضب کی دراز قامت کچھ اور بھی نمایاں ہو رہی تھی۔

''راستے سے ہٹیں، مجھے جانا ہے۔'' وہ قدر سنجیدہ تھا۔ قدر کو عجیب سی اہانت کا احساس ہوا تھا۔

''آپ کے راستے کھلے ہوتے ہیں مسٹر علی! میں آپ کے راستوں میں کہیں نہیں ہوں۔'' ایک جھٹکے سے اٹھتے وہ تڑخ کر کہہ چکی تھی۔ عبدالعلی کھنکارا اور اس کے مقابل آ گیا۔

''کیا مطلب ہے اس بات کا......؟'' وہ سوالیہ تھا۔ مستعجب تھا۔ قدر نے ہونٹ بھینچے رکھے۔

''اتنے غصے میں کیوں رہتی ہو ہر وقت...... اپنے رشتوں کا بھی خیال نہیں رہتا تمہیں۔'' وہ پھر اسے جھاڑنے کا ارادہ باندھ رہا تھا کہ وہ انگلی اُٹھا کر آنکھیں نکالتے غرائی۔

''میرا منہ نہ کھلوائیں علی! دوسرے لفظوں میں یہ سن لیں۔ آپ کی طرح منافقت نہیں آتی مجھے۔'' عبدالعلی کا چہرا بے تحاشا سرخ پڑ گیا۔ اس نے یوں ہونٹ بھینچے گویا خود پر ضبط کرنا چاہتا ہو۔''

''تمہارے نزدیک جو منافقت ہے ہمارے یہاں اسے لحاظ و مروت کا نام دیا جاتا ہے۔ پھر ویسے بھی محبت کا سب سے پہلا قرینہ ادب و احترام ہے۔ آپ کسی سے محبت کا دعویٰ کرتے رہیں اور اسے عزت نہ دے سکیں۔ اس کا احترام نہ کرتے ہوں۔ وہ محبت کدھر سے ہوگئی......'' عبدالعلی کا لہجہ پُرسان دھیما اور ٹھہرا ہوا تھا۔ اعتدال میں تھا۔ اس کے باوجود قدر کو آگ لگتی جارہی تھی۔

''معذرت کے ساتھ مسٹر عبدالعلی! اگر آپ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ میں آپ سے محبت......''

''میں احمق نہیں ہوں۔ اس قسم کی خوش فہمیاں نہیں پالتا۔ یہ مثال میں نے بوجانی اور انکل کے لیے آپ کے حوالے سے دی ہے۔ یاد رکھیے غور بھی کیجیے گا۔ کیا آپ اس دنیا میں ان کا سرمایۂ حیات نہیں......؟ ان کے لیے صدقۂ جاریہ صرف آپ قرار پاتی ہیں۔ معذرت کے ساتھ......مگر آپ انہیں ہر لحاظ سے مایوس کررہی ہیں۔'' وہ تلخ تر لہجے میں صور پھونک کر خود چلا گیا۔

قدر سنسناتی سماعتوں کے ساتھ وہیں کھڑی رہ گئی پھر جو ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی تو اسے یہ بھی خیال نہیں رہا تھا۔ اگر کسی نے دیکھ لیا، اگر کسی نے پوچھ لیا تو وضاحت کیا دے گی۔

☆......☆......☆

''یہ کیا بات ہوئی بھلا......؟'' اِدھر قدر اڑی بیٹھی ہے کہ نہیں جائے گی۔ اِدھر تمہاری بھی یہی ضد...... بیٹے کیا ہوگیا ہے۔ بھابی کو کتنا دکھ ہوگا۔ اندازہ کرلیں۔ پھر عبداللہ! وہ تو باقاعدہ خفا ہوجائے گا۔'' لاریب جھنجلا رہی تھیں۔ خفا خفا سی بول رہی تھیں۔ اتباع نے گہرا سانس بھرا۔

''قدر کیوں نہیں جانا چاہتی......؟'' لاریب اس سوال پر یکدم ہی سرد آہ بھر کے رہ گئیں۔

''شاید......عبدالعلی سے کوئی اختلاف چل رہا ہے۔''

''اوہ......'' اتباع بس یہی کہہ سکی۔

''ان کی شادی کردیں اماں! بھائی جان کبھی بھی ایسے قدر کی تشفی نہیں کراسکتے۔ ان کا مزاج ہی اس قسم کا ہے۔ یعنی بہت لیا دیا ہوا۔ وہ کسی پر بھی اتنی آسانی سے نہیں کھلتے۔ جبکہ قدر کو بہت تفصیلی اقرار و اظہار کی طلب ہے۔ بھائی جان کبھی بھی اس ادھورے رشتے میں یہ اظہار نہیں کریں گے۔'' اتباع اپنی دھن میں کہہ گئی تھی۔ لاریب اتنی حیران ہوئی تھیں کہ پوری آنکھیں وا کیے اسے تکے گئی تھیں۔ اتباع کو احساس ہوا تو بے ساختہ جھینپ گئی۔

''کیا ہوا اماں......! ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں؟'' اسے اپنی بے حجابی کا احساس جاگا تھا۔ جبھی خفت سے سرخ پڑنے لگی۔ لاریب نے اس کی کیفیت کو محسوس کیا تو قریب آکر اسے گلے لگا کر پیار کیا تھا۔ پھر محبت آمیز مسکان سمیت اس کا گلابی پڑتا چہرہ دیکھتے ہوئے نرمی سے بولی تھیں۔

''مجھے تمہاری نظر کی گہرائی و گیرائی نے متاثر کیا ہے بیٹے! بالکل صحیح تجزیہ کیا ہے تم نے۔ الحمدللہ میرے سب بچے ہی بہت نیک اور شریف فطرت کے مالک ہیں۔ تم لوگ اپنے بابا جان کے عکس ہو۔ وہ بھی ایسے ہی تھے۔ سمجھ لو بہت تڑپایا ہے انہوں نے مجھے۔ قدم قدم پر ہرٹ کرتے تھے شادی سے پہلے......اور پھر بعد میں......اتنی محبت دی، اتنا مان دیا کہ سارے شکوے گلے ہی جاتے رہے۔ کبھی شکایت ہوئی ہی نہیں۔'' وہ جیسے ماضی میں گم ہورہی تھیں۔ اتباع شرمیلی ہنسی ہنسنے لگی تو لاریب چونکی

تھیں۔

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔ شادی کر دیں بھائی جان کی۔ خود ہی سنبھال لیں گے پھر قدر کو۔'' اس نے شرارت بھرے انداز میں مشورہ دیا۔ تو لاریب بھی مسکرا دی تھیں۔

''اچھا اب تیار ہو جاؤ۔ اور ذرا اچھے سے ہونا۔ شکوے صرف قدر کو ہی نہیں ہیں۔ عبداللہ کو بھی آپ سے ہیں۔ مگر وہ جیتنے کے فن جانتا ہے۔ جبھی آپ کے اعتراضات کو کند کر دیا نکاح کر کے...... بیٹے! اب تو آپ کو بھی مطمئن رہنا چاہیے۔ پھر آپ کی طرف سے بھی بہت فکر مند ہیں۔ انہیں خوف ہے۔ عبداللہ کی کسی بات کو مائنڈ نہ کر جائیں۔''

اتباع کے چہرے پر پھیلی گھمبیرتا کو محسوس کرتیں وہ دھیمے نرم انداز میں سمجھا رہی تھیں۔ اتباع خاموش رہی۔ واقعی اعتراض کا جواز ختم ہوتا تھا۔ مگر وہ لاریب کو کیسے بتاتی...... عبداللہ کی بے تابیاں اور التفات واستحقاق کیسے کیسے اس کی جان پر بنا جاتے تھے۔ اس شب اس کی جسارت کے متعلق سوچ کر وہ ابھی تک لرز جاتی۔

''کپڑے تمہارے بھابی نے خود بھیجے ہیں۔ پنک بہت خوبصورت ڈریس ہے۔ بالکل شہزادی لگے گی میری بیٹی اس میں۔ ہاں چوڑیاں میچنگ کی نہیں۔ تم تیاری کرو۔ میں ابھی عبدالعلی کو بھیج کر منگوا دیتی ہوں۔'' لاریب وہی شاپر کھولے بیٹھی تھیں جس میں اتباع کا جوڑا اور میچنگ جوتے وغیرہ تھے۔ جیولری سیٹ سمیت۔

''آپ منع کر دیتیں بو جانی کو اماں! اتنے نئے کپڑے تھے تو میرے جو پہنے بھی نہیں۔ انہی میں سے......''

''نہ بیٹے! عبداللہ خود اتنے شوق سے لائے ہیں آپ کے لیے۔ یہ ان کی زندگی کا اہم دن ہے۔ میں کیسے بھلا اس خوشی کو کافور کر سکتی تھی۔ بچے کا دل ٹوٹ جاتا۔ پھر اب تو وہ حق بھی رکھتا ہے۔''

لاریب نے اس کی بات پوری سنے بغیر ہی قطع کر دی۔ جبکہ اتباع یہ جان کر کہ یہ عبداللہ کا کارنامہ ہے۔ کچھ اور جزبز ہو گئی تھی۔ اس کی نگاہ لباس پر اٹھی جو واقعی بہت خوبصورت اور خیرہ کن تھا۔ نگاہوں کے لیے۔ پنک پہ شاکنگ کام دمک رہا تھا۔ وہ ناچاہتے ہوئے بھی اس کے اعلیٰ ذوق کی قائل ہوئی اور مسکراہٹ دباتے لباس اٹھا کر اپنے ساتھ لگا کر دیکھنے پر مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

''شکر ہے میرے بچے! آپ آئے تو...... آنکھیں تھک گئی تھیں انتظار کرتے ہوئے۔'' عبدالعلی نے آ کر شاپنگ بیگ انہیں تھمایا تو لاریب نے اس تاخیر پر اس کی خبر لی تھی۔ وہ محض ہنکارا بھر کے رہ گیا تھا اور کن انکھیوں سے قدر کو دیکھا۔ جو تیار ہو چکی تھی اور بے حد پرکشش بھی لگ رہی تھی مگر مزاج بہر حال سوا نیزے پر تھا۔ بات تو اتنی اہم نہیں تھی۔ اس کی غلطی بس اتنی تھی کہ اتباع کے لیے چوڑیاں لاتے وہ اسے فراموش کر گیا تھا۔ اوپر سے لاریب نے بھی فوراً ہی گرفت کر لی تھی۔ اچھا خاصا برا بھی منایا کہ وہ آخر قدر کو کیوں بھول گیا۔ علیزے اس کی حمایت میں جتنا بھی بولتیں مگر قدر کی حمایت کا ٹولہ بھاری تھا۔ عبدالعلی کے ساتھ تھا ہی کون سوائے علیزے کے...... جبکہ قدر کے حمایتی سب تھے۔ عبیر اتباع اور لاریب بھی، وہ جتنا جھنجلا رہا تھا۔ بھی اتنا خفا ہو رہی تھیں۔

''چوڑیاں اتنی بھی اہم نہیں ہیں اماں! اس کے بغیر بھی سنگھار مکمل ہو جاتا ہے۔ پلیز اس بات کو محترمہ ایشو نہ بنائیں۔ وہ واقعی جل گیا تھا۔ کوئی

تک تھی بھلا۔ اس کا خیال کسی کو نہ تھا۔ لاریب نے اس کی اس بے لحاظی کے مظاہرے سے بے دریغ اسے گھورا تھا۔ پھر ہاتھ پکڑ کر اسے سائیڈ پر لے گئی تھیں۔

''بچی کا دل ٹوٹ جائے گا بیٹے! میں اسے ہرٹ ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ بات چوڑیوں کی نہیں ہے۔ اہمیت کی ہے۔ آخر وہ آپ کو یاد کیوں نہ رہی۔'' آخر میں اُن کا لہجہ دکھ سے لبریز ہونے لگا تھا۔ عبدالعلی نے کاندھے بے نیازی سے جھٹک دیے۔

''یاد وہ رہتے ہیں اماں! جن میں کچھ خاصیت کوئی خوبی ہو۔ محترمہ میں ایسا کچھ غیر معمولی نہیں۔'' وہ اگر شرارت کر رہا ہوتا تو لاریب برا نہ مانتی مگر وہ تو سنجیدہ تھا۔ جبھی وہ خود زرد پڑنے لگی تھیں۔

''تم اسے پسند نہیں کرتے ہو عبدالعلی!'' کتنا ہراس تھا ان کی آنکھوں میں۔ یوں گویا عمر بھر کی کمائی لمحوں میں لٹنے کے درپے ہو۔ عبدالعلی نے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔

''برا نہیں منائیے گا اماں! مگر آپ کو یہی ملی تھی ایک...... کم از کم میرے مزاج کا ہی خیال رکھا ہوتا۔'' وہ نرمی سے جھنجلایا تھا۔ اور لاریب نے گھبرا کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''اس سے آگے ایک لفظ بھی مت کہنا عبدالعلی! یہ سوچ کر کہ آج تم ایک بہن کے بھائی ہو۔ اسے کسی کے گھر بھیجنا ہے۔ کل بیٹی کے باپ بھی بنو گے۔ قدر کو ان کی جگہ پر رکھ کر سوچو۔ کچھ کہنے کے قابل نہیں رہو گے۔'' عبدالعلی نے سر تھام لیا تھا۔

''کس سمت نکل گئی ہیں والدہ! پلیز کنٹرول یور سیلف! آپ کی لاڈلی بہو کو سنبھالنے کا پورا ارادہ ہے میرا۔ ڈونٹ یو وری۔'' وہ جیسے انہی کی خاطر ہنسا تھا۔ لاریب کو قدرے اطمینان حاصل ہوا۔

''میں چوڑیاں لا دیتا ہوں۔ ورنہ وہ محترمہ کبھی اس الزام سے بری نہیں کریں گی۔'' بدمزگی سے کہتا وہ پلٹ گیا تھا۔ اور تب کا گیا اب لوٹا تھا۔ اس دوران بریرہ اور عبداللہ کے علاوہ امن اور ہارون کے بھی اتنے فون آچکے تھے۔

''ہاں تو آپ چلی جاتیں۔ یہ وہاں پہنچا دیتا میں۔'' لاریب کے جتلانے پر عبدالعلی کڑھ کر بولا تھا۔ لاریب نے گھورنے پر اکتفا کیا۔

''اچھا جاؤ! تیار ہو جاؤ فٹافٹ۔'' انہوں نے پیکٹ اس سے لے کر قدر کے حوالے کیا۔

''پہن لو بیٹے! یا میں پہنا دوں......؟'' انہوں نے اس کو نرمی سے مخاطب کیا تھا۔ انداز ہمیشہ اسی کے لیے ایسا ہوتا گویا وہ کانچ سے یا بلور سے بنی ہے۔ ذرا سا آواز بلند ہوئی یا لہجے میں سختی آئی تو ٹوٹ جائے گی۔ چٹخ جائے گی۔ عبدالعلی کو ان کے اس خصوصی پروٹوکول سے غصہ آئے جاتا۔

''وہ پہلے ہی کچھ کم خود پرست نہیں ہے۔ مغرور بھی اچھی خاص ہے۔ آپ نے اور سر پر چڑھا کے رکھا ہوا ہے۔'' وہ جھنجلائے جاتا۔ لاریب مسکرائے جاتیں۔

''تمہیں کیا ہوتا ہے۔ ناز میں اٹھاتی ہوں ناں۔ لاڈ میں کرتی ہوں۔ تم آرام سے بیٹھے رہو۔'' یہ جواب عبدالعلی کو مزید جھنجلاہٹ اور کوفت سے بھر جاتا۔

''ساری عمر میں نے نبھانا ہے اسے۔ کچھ میرا بھی خیال کرلیں۔ سکھ کا سانس لینے کو ترسوں گا لگ رہا ہے۔'' اور لاریب اسے جواب میں گھورنے لگی تھیں۔

"بوجھ سمجھو گے تو بوجھ ہی لگے گی تمہیں۔ عبدالعلی بیٹے! میں سمجھتی تھی تم اپنے بابا جان پہ گئے ہو۔ مگر اب مجھے اندازہ ہو رہا ہے۔ تم ہرگز ویسے حمبل نہیں ہو۔ جتنے کول مائنڈڈ وہ تھے۔"

وہ اداس ہونے لگیں تو عبدالعلی کو الٹا انہیں تسلیاں دینی پڑ گئی تھیں۔ اس وقت بھی وہ گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔ اسے صاف اندازہ تھا ساری عمر اس کی ساری فیملی نے ہمیشہ قدر کی قدر کرنی تھی۔ اس پر کوئی بھی اس کے حوالے سے یقین کرنا والا نہیں تھا۔ جیسے ابھی ہوا تھا کہ وہ صرف اتباع کے لیے چوڑیاں لے آیا تھا تو سب نے اسی پر اٹیک کیا تھا کہ وہ قدر کو کیسے بھول گیا۔ جواب میں وہ بھی کسی قدر سہی مگر چڑ ضرور گیا تھا۔

"مجھے صرف اتباع کے لیے کہا تھا آپ نے اماں! اور مائنڈ اٹ! مجھے اپنی ذمہ داریوں کا خیال رہتا ہے۔ محترمہ ابھی میری ذمہ داری نہیں بنی ہیں کہ آپ کو شکایت ہو۔" وہ کتنا ایری ٹیٹ ہو رہا تھا۔ لاریب کا تو منہ کھل گیا تھا۔ کتنی خفگی تھی۔ ان کے انداز میں اس پل اس کے لیے اور اس سے بھی شاید کہیں بڑھ کر دکھ۔

"یہ ذمہ داری کی بات خوب کہی آپ نے عبدالعلی بیٹے! سچ پوچھو تو اتباع نہیں قدر ہی تمہاری ذمہ داری ہے صحیح معنوں میں۔ اتباع تو پرائی ہے۔ لیکن قدر کے نان نفقہ کی ذمہ داری بھی تم پہ عائد ہو چکی۔ نکاح اہم ہوتا ہے شرعی لحاظ سے۔ رخصتی تو دنیا کی ایک ریت ہے۔" اور عبدالعلی ہمیشہ کی طرح لاجواب ہو گیا تھا۔ بے بس لاچار کسی حد تک بے زار اور کوفت زدہ، اس کا چہرہ اس کے اندر کا عکس چھلکاتا تھا۔ یہی عکس، یہی تاثرات لاریب کو اضطراب تشویش اور پریشانی میں مبتلا کرنے کو کافی تھے۔ جبھی انہوں نے ہوتے ہوتے جانے کتنی مرتبہ کا کیا ہوا سوال پھر اس سے کر لیا تھا۔......

"تمہارے جو بھی دل میں ہے قدر کے حوالے سے کھل کر کہو عبدالعلی......" عبدالعلی نے چونک کر انہیں دیکھا۔ خدشات اور خوف ان کی آواز سے ہی نہیں۔ ان کے چہرے پر بھی ہویدا تھا۔ عبدالعلی نے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ انداز ایسا تھا گویا خود پر قابو پانا چاہتا ہو۔ جو کہنا چاہتا ہو۔ وہ کہنے سے گریزاں ہو۔ جبھی لاریب کی جان پر بن کر آنے لگی تھی۔

"کسی کو پسند کرتے ہو عبدالعلی......!"

"کسی کو اس نظر سے دیکھوں گا تو پسند کروں گا۔ اماں کیوں شک کرتی ہیں مجھ پر......؟" وہ دکھ میں مبتلا ہو کر بولا۔ تو لاریب نے قدرے سکون محسوس کیا تھا۔ مگر تفتیش ابھی باقی تھی شاید۔

"پھر قدر کو اگنور کیوں کرتے ہو......؟ کیا وہ پسند نہیں تمہیں......؟"

"اسے کوئی کام نہیں ہے آپ کو مجھ سے بدگمان کرنے کے علاوہ، شکایتیں کرنے کے علاوہ۔" عبدالعلی روڈ ہونے لگا۔ لاریب سر پیٹنے والی ہو گئیں۔

"ایسا کیوں سوچا آپ نے بیٹے! وہ تو بڑی پیاری بچی ہے۔ دیکھو جب سے تمہیں دیکھا ہے ناں...... ہر وہ کام کرنے کی کوشش کرتی ہے جس سے تم خوش ہو سکو...... مگر تم......" انہوں نے شاکی انداز میں کہتے بات ادھوری چھوڑی۔

"سب سے بڑی غلطی ہی انسان کی انسان کو خوشی اور متاثر کرنے کی ہے اماں! اور اس کی سزا یہ ہے کہ انسان نہ خوش ہوں گے نہ متاثر...... محترمہ یہ توانائیاں اللہ کو راضی کرنے کو صرف کریں تو مسائل حل ہو جائیں گے۔" وہ زہر خند سے بولا تھا۔ لاریب نے اسے دھیان سے دیکھا۔

''بہت کم ایسے خوش نصیب ہوتے ہیں عبدالعلی! جو بغیر کسی راہبر کے، بغیر کسی ٹھوکر کے اللہ کے قرب کو حاصل کرلیا کرتے ہیں۔ ورنہ اللہ نے انسان کو ہی انسان کا وسیلہ بنایا ہے معرفت کا بھی...... مجھے دیکھ لو۔ کیا تھی، کیا ہوگئی وسیلہ اللہ نے تمہارے بابا جان کو بنایا۔ یہ دنیاوی محبتیں بھی خود ساختہ نہیں ہوتی ہیں۔ اللہ کی بخشی عنایتیں ہوا کرتی ہیں۔'' ان کا لہجہ ٹھہرا ہوا گھمبیر تھا۔ عبدالعلی قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ بلکہ متاثر نظر آنے لگا۔ کچھ دیر انہیں مسکرا کر دیکھتا رہا پھر ان کے گلے میں بازو حمائل کر دیے تھے۔

''اپنی مثال نہ دیں اماں! آپ نے بابا جانی سے بہت شدید محبت کی ہے۔ ورنہ کوئی عورت سوکن برداشت نہیں کرتی۔ آپ نے بابا جان کی خاطر یہ بھی کیا۔''

''نہیں بیٹے! تمہارے بابا جان کی محبت نے مجھے پوزیسو اور سیلفش بنایا تھا۔ میں یہ برداشت نہیں کرسکی تھی۔ مگر پھر اللہ کی محبت نے مجھے اس کا ظرف دیا۔ الحمد للہ!'' انہوں نے مسکرا کر تصیح کی تو عبدالعلی بھی نرمی سے مسکرا دیا تھا۔

''لیکن آپ کی تیز مزاج بہو صاحبہ کبھی یہ برداشت نہیں کرسکیں گی شاید۔'' اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے داب کر شرارت کی تو لاریب ٹھٹھک گئی تھیں۔

''کیا مطلب......؟ کیا تم بھی دوسری شادی کرنے والے ہو......؟''

''کرنے والے تو بابا جان بھی نہیں تھے مگر ہوگئی۔ آنے والے وقت کے بارے میں کوئی پہلے سے کیا کہہ سکتا ہے۔''

وہ کنپٹی کھجاتے ہوئے شرارت سے ہنسا تو لاریب نے جھینپ کر اسے ایک جھانپڑ لگا دی تھی۔

اور وہ زور سے ہنستا چلا گیا تھا۔ جبکہ دروازے میں کھڑی قدرِ دھواں ہوتے چہرے کے ساتھ وہیں سے پلٹ گئی تھی۔

☆......☆......☆

تقریب بے حد شاندار تھی۔ نکاح کی رسم سادگی سے فیملی کے درمیان ہوئی تھی۔ مگر عبداللہ کے اعزاز میں دی جانے والی یہ پارٹی بہت اعلیٰ پیمانے پر تھی۔ مرد و خواتین کا الگ الگ انتظام تھا۔ زنانہ حصے میں گھر کے مرد ہی ضرورت کے ٹائم چکر لگا لیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اتباع بھی خاصی ریلیکس نظر آرہی تھی کہ عبداللہ ایک دو بار اگر اِدھر آیا بھی تھا تو یہ سامنا دور دور سے ہی ہوا تھا۔ یہ الگ بات کہ اتنی دور سے بھی وہ اس کی وارفتہ نگاہوں کی لپک سے خود کو پگھل پگھل کر ڈھیر ہوتا محسوس کر رہی تھی۔ مگر بہر حال ہراساں تھی نہ گھبراہٹ میں مبتلا۔

''جتنی تم آج پیاری لگ رہی ہو نا اتباع......! عبداللہ بھائی کا یقیناً بس نہیں چل رہا ہوگا تمہیں اُٹھا کر کہیں غائب ہوجائیں۔'' امن نے آکر چھیڑ خانی کی تھی۔ وہ بلش کر گئی تھی۔ اور اسے گھورنے لگی مگر وہ باز آنے پر آمادہ نہیں تھی۔

''وہ تو بہت خوش ہیں۔ تم بھی اپنے دل کی ہوا لگوا دو ظالم لڑکی...... میرا بھائی دیوانہ کر چھوڑا ہے تم نے۔'' امن نے مصنوعی آہیں بھری تھیں۔ اتباع پھر جھینپ کر مسکرا دی۔ گلابی رنگت دہک کر سرخی مائل ہو رہی تھی۔

''سچ بتانا...... غصہ تو نہیں آرہا ہے ان پر؟''

''غصہ کیوں......؟'' امن کے سوال پر برا قدرے منایا تھا۔ جبھی چہک کر بول پڑی۔

''غصہ نہیں آرہا۔ سچ پوچھو تو ایسا پہلی دفعہ ہوا ہے کہ مجھے کسی مرد کے اس طرح دیکھنے پر برا نہیں

بلکہ اچھا لگا ہے۔'' یہ ان کا اصرار ہی تھا کہ اتباع سے اگلوالیا تھا۔ پھر جو اس کا ریکارڈ لگا۔ اس نے عاجز کر کے رکھ دیا تھا اتباع کو۔

''میں بھائی کو بتاتی ہوں کہ تمہیں ان کا دیکھنا پسند آرہا ہے۔ سوچ بھر کے گھوری دیں۔'' امن کھی کھی کر رہی تھی۔ اتباع صحیح معنوں میں بوکھلا اٹھی۔

''خبردار......! اگر جو تم نے انہیں بتایا تو کبھی بات نہیں کروں تم سے......'' اس کی گھبراہٹ سے انہوں نے اور حظ لیا تھا۔ کتنی دیر یونہی اسے عاجز کرتی رہیں۔ تب ہی عبداللہ پھر کسی کام سے اِدھر آیا تھا کہ امن نے اسے پکار لیا۔

''اِدھر آجائیں بھائی! ہرگز پابندی نہیں ہے آپ پر۔'' وہ شریر ہوئی جاتی تھی۔

''جناب!'' عبداللہ تو جیسے منتظر تھا۔ دانتوں کی نمائش کرتا ہوا فی الفور چلا آیا۔

''کس نے کہا پابندی ہے۔ اب ہی تو ساری پابندیاں اٹھی ہیں۔''

وہ کتنا شوخ ہو رہا تھا۔ ہر انداز سے خوشی چھلک رہی تھی۔ آنکھوں میں شوخی و شرارت کے ساتھ فاتحانہ مسکراہٹ کا رقص تھا۔ ساری توجہ، تمام تر ارتکاز اتباع پر مرکوز تھا اور وہ حجاب سے سرخ ہوتی جا رہی تھی۔

''خیر اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔ رخصتی باقی ہے ابھی۔ اتنا زیادہ نہ پھیلیں۔'' قدر نے اسے حقیقت حال سے روشناس کرانا ضروری سمجھا۔ عبداللہ متاسفانہ سانس بھر کے رہ گیا۔ پھر آس مندانہ نظروں سے اتباع کو دیکھا تھا۔

''آپ تو ہماری طرف ہیں ناں نصف بہتر! اصولاً ہونا بھی چاہیے۔'' اس کا انداز خوشگواریت سے معمور تھا۔ امن اور قدر دونوں زور سے ہنس پڑیں۔ جبکہ اتباع نے چہرہ بھی اوپر نہیں اٹھایا تھا۔ نظروں کا اٹھنا تو تھا ہی محال۔

''منہ دھو رکھیں۔ ایسی امید فضول ہے فی الحال۔'' جواب پھر قدر کی طرف سے آیا۔ عبداللہ بدمزا ہونے لگا۔

''میں نے آپ سے نہیں پوچھا۔ اتباع سے پوچھا ہے کیوں اتباع......!'' وہ ہار تسلیم کرنے والا نہیں تھا۔

''پلیز یہاں سے جائیں۔'' وہ بولی بھی تھی تو منمنا کر کہا۔ قدر کو اس پر ہنسنے کا خوب موقع ملا تھا۔

''آگیا یقین......؟'' وہ دانت نکالنے لگی۔ عبداللہ باقاعدہ کھنکارا۔

''چلیں کرلیں کچھ عرصہ من مانی! آخر تو ہمارا وقت بھی آئے گا۔ وہ کیا خوب کہا ہے کسی شاعر نے کہ......

عروج پر ہے تمہارا موسم
خزاں میں تجھ کو خرید لیں گے
بنو گے ہم سے رحم کے طالب
نہ تم کو موقع مزید دیں گے

''اوئے ہوئے...... استغفراللہ! اتنے خطرناک عزائم ہیں آپ کے......'' اس کے خاموش ہوتے ہی قدر نے اس پر گرفت کر لی تھی۔ باقاعدہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے، امن الگ کھی کھی کر رہی تھی۔ اتباع کا شرم سے برا حال تھا۔ صحیح معنوں میں بری پھنسی تھی۔

''تم خاموش رہو بی جمالو! تم درحقیقت ہو کس کی طرف......؟ اس دن میرے ساتھ تھیں۔ اب پارٹی بدل لی۔ لوٹا ہو پورا تم۔'' عبداللہ نے مسکراہٹ دباتے اسے جھاڑ پچھاڑ کی۔

''خبردار عبداللہ بھائی جو مجھے لوٹا یا بی جمالو کہا ہو تو...... دونوں ورڈ ہی میرے شایان شان نہیں

ہیں۔ "ہنسی تو اسے بھی بہت آئی تھی۔ مگر غصے میں دبا گئی۔ وہ آستینیں چڑھاتے ہوئے لڑنے کو تیار تھی۔

"ہاں اسے لوٹا نہیں لوٹی کہیے گا عبداللہ بھائی! چونکہ یہ مذکر نہیں مونث ہے اسی لیے۔"

عبدالاحد بھی چلا آیا تھا۔ آخری بات ہی سنی تھی جبھی اس لحاظ سے نادر مشورے سے نوازا۔ ان سب کا قہقہہ لاجواب تھا۔ قدر کو طیش نے گھیر لیا۔

"شرم کرو بدتمیز لڑکے! تم لڑکی والے ہو کر لڑکے والوں کی طرفداری کر رہے ہو۔" وہ چیخی تھی۔ عبدالاحد نے کاندھے اُچکا دیے۔

"پوری بات بتاؤ پھر ہی فیصلہ کر سکتا ہوں۔" وہ مزے سے بولا تھا۔ قدر جھنجلاتی ہوئی اٹھی۔

"میرا دماغ خراب نہیں کہ تم سے مغز ماری کروں۔ بھاڑ میں جاؤ۔" اس نے بھنا کر کہا اور وہاں سے چلی گئی۔

"قدر...... یہاں آؤ بیٹے!" لاریب کچھ خواتین میں گھری کھڑی اسے پکار رہی تھیں۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا پھر اپنا لباس سنبھالتی ان کی جانب آ گئی۔

"یہ ہے قدر! میرے عبدالعلی کی دلہن! بس اس کی تعلیم مکمل ہونے کا انتظار ہے پھر ہم اسے باقاعدہ اپنے گھر لے آئیں گے۔" لاریب کے انداز میں اس کے لیے محبت ہی محبت تھی۔ لاریب محجوب سی ہو گئی۔

"سلام کرو بیٹے! یہ آنٹیاں ہیں آپ کی۔" لاریب کے احساس دلانے پر اس نے گڑبڑا کر سلام کر دیا تھا۔

"ماشاء اللہ! بہت پیاری ہے۔ چاند کا ٹکڑا۔ بیٹا تو بہت سال پہلے میں نے دیکھا تھا آپ کا، تب تو وہ نوعمر سا لڑکا تھا۔ مگر تھا ماشاء اللہ وہ بھی بہت

پیارا۔" ایک خاتون نے قدر کو پیار کرتے ہوئے لگاوٹ سے کہا تھا۔ قدر گہرا سانس بھرتی اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"آپ نے چوڑیاں کیوں نہیں پہنی ہیں بیٹے!" لاریب نے اس کمی کو فوراً محسوس کیا تھا۔

"ممانی جان وہ بہت زیادہ کھلی تھیں۔ اتنی کہ خود بخود میرے ہاتھوں سے اُتر رہی تھیں۔ کیسے پہنتی......؟" وہ بسوری' لاریب متاسف ہو کر رہ گئیں۔

"عبدالعلی کیسے یہ غلطی کر سکتا ہے۔ میں نے بھی دھیان نہیں دیا کہ کھول کر دیکھ لوں۔ اس وقت افراتفری ہی ایسی تھی۔"

"یہ غلطی کرنی ہی تھی ممانی جان! انہوں نے کبھی غور سے میرا ہاتھ دیکھا ہوتا تو سائز کا بھی پتا ہوتا۔" وہ اس معاملے پر جتنا کلس چکی تھی اسی لحاظ سے بولی تھی مگر اپنے مقابل آ کھڑے ہونے والے عبدالعلی اور اس کی نظروں کا احساس کرتے ہی جیسے خفت سے سرخ پڑنے لگی۔ اسے اندازہ ہوا کتنے غلط انداز میں زبان پھسلی ہے۔

"آپ نے بلایا تھا والدہ......!" وہ سنجیدہ آواز میں بولا۔

"بہت تاخیر کر دی بیٹے! کچھ خواتین ملنے کی خواہش مند تھیں آپ سے۔" لاریب کے جواب پر اس نے پھر خاموشی کی ردا اوڑھ لی۔ پھر قدرے توقف سے مگر نرمی سے گویا ہوا تھا۔

"معذرت اماں! بابا جان کے ساتھ تھا۔ ان کے دوستوں سے ملاقات میں ذرا ٹائم زیادہ لگ گیا۔ پیغام تو مل گیا تھا مجھے آپ کا......"

"کوئی بات نہیں بیٹے! میں سمجھ سکتی ہوں۔ تقریب تو اختتام پذیر ہو گئی۔ میرا خیال ہے اب اجازت لینی چاہیے ہمیں تمہاری بہو اور ماموں

سے.....''

رسٹ واچ پر نگاہ دوڑاتی ہوئی وہ اسے تائیدی نظروں سے تکنے لگیں۔ عبدالعلی نے شانے اُچکا دیے تھے۔ کچھ دیر بعد جب وہ عبدالغنی اور لاریب کے ساتھ عبیر کو بھی گھر لے کر جا رہا تھا۔ علیزے بھی ساتھ ہولی تھی۔ بریرہ کے روکنے پر انہوں نے معذرت کر لی تھی۔

''بجو کچھ طبیعت ٹھیک نہیں۔ مکمل آرام کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کے گھر پر تو ماشاء اللہ رونق لگی ہوئی ہے۔ میں پھر کبھی آجاؤں گی۔'' اور بریرہ نے خوشدلی سے اجازت دے دی تھی۔

''تیار رہنا اتباع! کچھ دیر میں آتا ہوں لینے تمہیں بھی۔'' عبدالعلی بالخصوص اس کے پاس آکر بولا تھا۔ جبکہ وہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی تھی۔

''میں ابھی چلتی ہوں آپ کے ساتھ بھائی جان!''

''ابھی نہیں ہے جگہ گاڑی میں۔ بس ایک آدھ گھنٹہ ویٹ کرلو۔ آتا ہوں۔'' عبدالعلی اسی سنجیدگی سے کہتا مڑا تو امن نے اس کا راستہ روک لیا تھا۔

''آج کوئی کہیں نہیں جائے گا۔ ہم نے اکٹھے رات گزارنے کا پروگرام سیٹ کیا ہے۔'' وہ مسکرا رہی تھی۔ قدر نے بہت دھیان سے اسے دیکھا تھا۔ سبز دوپٹے کے ہالے میں اس کا لو دیتا ہوا صبیح چہرہ بہت غیر معمولی حد تک حسین نظر آتا تھا۔ پرل کے ٹاپس کا عکس اس کے صبیح اور کندنی گالوں پہ اطراف میں لگی برقی روشنیوں سے منعکس ہوکر اُترتا تو اس کے چہرے کی جگمگاہٹ میں مزید اضافہ کر جاتا۔ بلاشک وشبہ وہ اس سادگی و وقار اور بغیر آرائش کے بھی اتنی من موہنی نظر آتی تھی کہ نگاہ ٹھہر ٹھہر جاتی تھی۔ ایسا ہی مقدس سا روپ تھا اس کا، قدر کو لگا۔ عبدالعلی کی بھی نگاہ ہر بار اس پر ٹھہر جاتی ہے پلٹنا بھولنے لگتی ہے۔ اس کا دل تنگ سا پڑنے لگا۔ بس نہ چلا یا عبداللہ کو کہیں لے کر چلی جائے یا پھر امن کو منظر سے غائب کر دے۔ عجیب سی بے بسی اس کا احاطہ کرنے لگی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اسے اندازہ نہیں ہوسکا۔ عبدالعلی نے جواباً امن سے کیا کہا تھا۔ وہ گم صم خاموش بیٹھی تھی۔ تب امن کی ہنسی کی جھنکار پر چونکی۔

''عبدالعلی کی بات نہ ہی کریں تو اچھا ہے۔ ایک بار کی سن لیں۔ مجھے چھوڑنے آتا تھا انہیں اِدھر۔ اوپر سے گاڑی کا بھی انتظام نہیں ہو رہا تھا۔ یہ پریشان کریں تو کیا کریں۔ بائیک پر میرے ساتھ بیٹھنا آزمائش سے کم نہیں تھا۔ حل یہ نکالا کہ ہمسائے کا چھوٹا بچہ تفریح کے لالچ میں پٹا کر درمیان میں بٹھایا پھر مجھے گھر پہنچایا۔ ان کی شرافت کی یہ داستان میں نے جب اپنی فرینڈز کو سنائی تو ہنس ہنس کر مرنے والی ہوگئیں سب کی سب، کہتی ہیں اپنے اس کزن کو ملوانا ہم سے۔ میں اس زاہد خشک کو ضرور دیکھنا چاہوں گی۔ یہ پھر بائیک پر آئے ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اتنے بچے کہاں سے لائیں گے ہم۔ جوان کا مسئلہ حل کرسکیں۔'' امن کی ہنسی نہیں تھم رہی تھی۔ قدر نے گہرا سانس بھر کے کسی قدر خفگی سے اسے دیکھا اور جتلائے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

''اب اس مشقت کی ضرورت نہیں ہے۔ اس بار ساتھ جانے والی دونوں لڑکیوں سے ان کا رشتہ غیر محرم کا نہیں ہے۔ محرم ہیں وہ ہم دونوں کے.....''

اس کا لہجہ خود بخود برتری اور تفاخر کے احساس سے لبریز ہوگیا تھا۔ جسے اتباع کے ساتھ باقی سب نے بھی محسوس کیا۔ یہاں تک کہ عبدالعلی نے

بھی...... جبھی اس کی نظروں میں نمی اتر آئی تھی۔ اور قدر جو اس کی وہاں موجودگی سے بے خبر بے دھڑک یہ بات کہہ گئی تھی۔ اس کی نظروں سے جز بز خائف اور شرمندہ ہوتی نظریں چرانے پر مجبور ہوگئی۔ صرف یہی نہیں جب وہ سامنے آ کر بیٹھا قدر نے فرار اختیار کرنا چاہا تھا مگر عبدالعلی کا ارادہ شاید اسی وقت اس کی طبیعت صاف کرنے کا تھا۔ جبھی اُٹھ کر خود بھی اس کے تعاقب میں آیا اور اسے قدرے سنسان راہداری میں جالیا تھا۔

''خواتین کا خاص کر کم عمر لڑکیوں کا حیا سے عاری گفتگو کرنا ہرگز زیب نہیں دیتا ہے۔ میں غالباً پہلے بھی آپ کو بتا چکا ہوں کہ مجھے بے باک لڑکیاں بالکل پسند نہیں ہیں۔ اگر آپ سمجھیں تو لوگوں کی نظروں میں آپ اپنا ہی نہیں میرا امیج بھی خراب کر رہی ہیں۔ کچھ تو خیال کریں۔'' وہ جتنا سنجیدہ تھا اس سے بڑھ کر خفا لگ رہا تھا۔ قدر کو اس پل اتنی شرمندگی محسوس ہو رہی تھی کہ دل کرتا تھا زمین پھٹے اور اس میں سما جائے۔ اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ ہونٹ کچلتے اس نے سر کو اثبات میں ہلایا۔

''آئی ایم سوری! آپ کو آئندہ شکایت نہیں ہوگی۔'' خفت فرمانبرداری' غلطی کا اعتراف...... سب کچھ ایک ساتھ۔ عبدالعلی کو بھلا کہاں توقع تھی ایسے رویے کی۔ جبھی کچھ لمحوں کو حیرانی کی زد پر آ گیا۔

''صد شکر...... آپ کو سمجھ تو آئی۔'' وہ قدرے ریلیکس ہوا تھا۔ قدر نے پلکیں اُٹھا کر اسے لحہ بھر کو دیکھا پھر دل سوزی سے مسکرا دی تھی۔

تیری ہر بات مان لیتا ہوں
یہ بھی شکایت کا ایک انداز ہے

عبدالعلی کے اٹھتے قدموں کے بڑھتے فاصلے پر نگاہ رکھے وہ دل سوزی سے بولی تھی۔ مگر جس کے لیے کہا تھا۔ وہ سننے کی حد سے باہر جا چکا تھا۔ اس نے طویل رنجیدہ سانس بھرا اور خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

☆......☆......☆

بہت خوبصورت ماحول تھا۔ لان میں برقی قمقمے ابھی تک روشن تھے۔ باقی کی تمام لائٹیں آف کر دی گئی تھیں۔ باربی کیو کی مہک فضا کو بہت جاندار بنا رہی تھی۔ لان کے عین وسط میں الاؤ روشن تھا۔ یہ محض ماحول کی خوبصورتی کی خاطر روشن کیا گیا تھا۔ ورنہ سردیاں مکمل حد تک رخصت ہو چکی تھیں۔ اب اس گرمائش کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ مگر عبداللہ کو اس کے بغیر بہت ادھورا لگ رہا تھا یہ رومینٹک ماحول جبھی اس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکا تھا۔ یہ اسی کا اصرار تھا کہ عبدالعلی کو چپ سادھ کر اس کی خواہش کے احترام میں اتباع اور قدر کے ہمراہ وہاں رُکنا پڑ گیا تھا۔

''پاپا آپ کو کچھ یاد تو آیا ہوگا......؟'' ہارون اسرار کو تکتے عبداللہ کی آنکھوں میں شرارت اُمڈ آئی تھی۔ اور وہ جواباً خفت زدہ ہونے کے بجائے قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔ ان کی شرارتی متبسم نگاہوں کا مرکز اس پل بریرہ تھیں۔ جو بے حد پروقار اور دلنشین لگ رہی تھیں۔ ہلکے پیازی کلر کے شلوار سوٹ اور دوپٹے میں۔''

''بالکل یاد ہے اور میرا بیٹا میرا عکس ہے۔ میرے نقش قدم پر چلتا ہے۔ مگر جوانی میں ایسے مواقع عبدالہادی ڈھونڈ لایا کرتے تھے۔ دراصل ان دنوں ان کی اپنی نصف بہتر سے ذرا چپقلش چلتی تھی۔ تو بہانے ڈھونڈتے تھے یہ موصوف، اس طرح سے وضاحتوں اور گواہوں کے......'' ہارون اسرار نے شرارت میں عبدالہادی کو بھی گھسیٹ

لیا۔ جو جھینپ کر ہنسنے لگے تھے۔

''انکل اگر زیادہ اُداس ہو رہے ہیں تو میں خالہ جانی کو لے آتا ہوں جا کر......'' عبداللہ کی شرارت کا رُخ عبدالہادی کی جانب پلٹ گیا۔ وہ بے اختیار سر کو نفی میں ہلانے لگے۔

''نہیں یار! وہ تھکی ہوئی ہیں آرام کرنے دو۔''

''افوہ...... کتنا خیال ہے آپ کو ابھی بھی۔'' عبداللہ نے سیٹی بجائی۔

''ہاں تو ہونا بھی چاہیے۔ ہر کوئی کٹھور بے حس اور سنگدل ہو ضروری نہیں ہے۔'' قدرے چمک کر بولی تھی۔ نگاہ کا ترچھا زاویہ عبدالعلی پر فٹ ہوا تھا۔ جو سیخ کباب سے اتار کر چکھنے میں مصروف تھا۔ اس کی جانب قطعی متوجہ نہیں تھا۔ عبدالاحد اور اتباع سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا ہوا۔

''میں عبدالعلی کو بلوا لیتا ہوں۔ شکوے شکایات براہِ راست ہونے چاہئیں۔'' عبداللہ کی آواز پر وہ چونکی اور سٹپٹا کر متوجہ ہوئی تھی اور عبداللہ کو بے دریغ گھورا۔

''خبردار جو آپ نے کوئی فضول بات کی ہو۔ اور آپ سمجھے بھی غلط ہیں، اونہہ۔'' عبداللہ نے اب کی بار جواب نہیں دیا اور زیرِ لب مسکراتا رہا۔

''ماموں ہمیشہ ایسی محفلوں سے غائب ہو جاتے ہیں۔ میرا دل کرتا تھا آج ان سے کچھ سنوں۔ اتنی پیاری آواز ہے اُن کی۔'' امن کو عبدالغنی کی یاد ستانے لگی۔

''وہ تو تب بھی اسے تڑوایا کرتے تھے جب نوجوان تھے۔ اب تو خیر یہ ناممکن ہے جیسے۔'' ہارون اسرار کے جواب پر امن محض مسکرا دی تھی۔

کچھ دیر ایسی ہی باتیں ہوتی رہیں۔ سب اِدھر اُدھر پھرتے کھانے پینے میں مصروف تھے۔ ہارون اور عبدالہادی کے ساتھ بریرہ بھی جب آرام کے خیال سے وہاں سے گئے۔ عبداللہ باقاعدہ کھنکارتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔

''میرا خیال ہے اب ہمیں اپنے اپنے مرکز پر آ جانا چاہیے۔ آپ کا کیا خیال ہے۔'' لیے دیے سے انداز میں بیٹھی اتباع کے برابر نشست سنبھالتے ہوئے اس نے اسی سے تائید چاہی تھی۔ جو کیا ہوتی البتہ اس کی گھبراہٹ سوا تر ہونے لگی تھی۔ اس نے مضطرب ہو کر امن کو دیکھا جو پلیٹ اس کی گود میں رکھ چکی تھی۔

''کچھ تو کھا لو یار!''

''نہیں تم لو۔ میرا دل نہیں کر رہا۔'' عبداللہ سے توجہ ہٹا کر اس نے امن کو جواب دیا تھا۔

''چلیں مجھے پوچھ لیں۔'' عبداللہ جو اسے شوخ نگاہوں کی زد پر رکھے تھا مسکراہٹ دبا کر بولا۔ اتباع نے گھبرا کر پلیٹ واپس امن کو تھما دی۔

''انہیں دے دو امن۔'' اس کا لہجہ سرگوشی سے بلند ہرگز نہیں تھا۔ عبداللہ کی سماعتوں تک پھر بھی رسائی پا گیا کہ وہ تو تھا ہی پوری جان سے اس کی جانب متوجہ، جبھی دل گرفتہ مایوسانہ دیگر انداز میں سرد آہ بھر کے رہ گیا۔

غیروں کو اپنے ہاتھ سے ہنس کر کھلا دیا
مجھ سے کبیدہ ہو کر کہا کباب لیجیے
مرنا قبول ہے مگر الفت نہیں قبول
دل تو نہ دوں گا آپ کو میں جان لیجیے

وہ مسکرا رہا تھا۔ مگر اتباع کے اوسان خطا کر گیا تھا۔ شوخ نظروں کے سب انداز معنی خیز تھے۔ وہ سٹپٹا کر نظریں جھکا گئی۔ بلکہ روہانسی ہو گئی۔

''پلیز جایئے، بھائی جان سامنے ہیں۔'' انگلیاں چٹخاتی وہ بری طرح نروس تھی۔

''اجی ہم آپ کے بھائی سے نہیں ڈرتے،

آپ بھی نہ ڈریں۔'' وہ جیسے کچھ اور شریر ہوا۔ اتباع کی جان پر بننے لگی۔

''ایسی باتیں مت کریں پلیز!'' وہ روہانسی ہوئی تھی۔ عبداللہ نے مخمور قسم کی طویل سانس بھری اور اسے لودیتی نظروں سے تکنے لگا۔

بہکے بہکے سے اندازِ بیاں ہوتے ہیں
آپ ہوتے ہیں تو پھر ہوش کہاں ہوتے ہیں

انداز میں معذرت تھی۔ اتباع نے جھنجلا کر خود اٹھنا چاہا تھا کہ عبداللہ اس کا ارادہ بھانپتا ہوا سرد آہ بھرتا اسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کرتا کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''ظلم ہو چکا اتباع بہت ظالم ہیں۔ کبھی فرصتوں میں حساب کے کھاتے ضرور کھلیں گے۔'' اس کا انداز دھمکی آمیز نہیں تھا۔ ہاں محبتوں کی شدتوں سے چُور تھا۔ جبھی اتباع کی پلکیں بوجھل ہو کر جھک گئی تھیں۔

''یار بیٹھو آکر...... ساری رات ضائع کرنے پر کیوں تلے ہو۔ مقصد تو برباد نہ کرو۔'' عبداللہ نے عبدالعلی کے پاس آکر جس انداز میں کہا۔ وہ دہائی دینے کا ہی تھا۔ اگر امن ہنسنے لگی تھی تو عبدالعلی محض ہنکارا بھر کے رہ گیا۔

''کیا مقاصد ہیں آپ کے...... ہم پہ آشکار نہیں ہوئے۔'' اس نے مسکراہٹ دبائی تھی۔

''میں دلوں کے بھید پانے کا متمنی ہوں۔ ہر کسی سے کچھ نہ کچھ سننا چاہتا ہوں۔ شرط سمجھ لیں...... پلیز انکار نہیں کوئی دل رکھنا جانتا ہو تو انکار نہیں کرے گا۔''

اس کا انداز اعلانیہ تھا۔ عبدالعلی گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔ عبداللہ کی نیچر سے آگاہ تھا۔ جبھی جانتا تھا۔ وہ جو چاہتا تھا کر کے رہا کرتا تھا۔

''کون کچھ سنا رہا ہے سب سے پہلے۔''

عبدالعلی نے آکر کرسی پر بیٹھتے ہوئے حاضرین محفل کو دیکھا۔ جواب میں مختلف رسپانس سامنے آیا تھا۔ عبدالاحد سب سے پہلے سنانا چاہتا تھا۔ اتباع گھبرا گئی تھی۔ امن کی بے چینی صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ اس کی نگاہیں اندرونی حصے میں بھٹکی تھیں۔ جہاں سے جانے ارسل احمد وہاں آتا۔ انہیں جوائن کرتا یا نہیں۔ عبدالعلی بے نیاز اور لاتعلق تھا۔ قدر گم صم، ایک عبداللہ خود ہی تھا جس کا اشتیاق اور جوش وخروش دیدنی تھا۔ اس نے پہلے عبدالاحد کو موقع دیا تھا۔ جس نے ایک فنی نظم سُنا کر سب کو مسکرانے پر مجبور کر دیا۔

''اب تم عبدالعلی!'' عبداللہ کے کہنے پر وہ ذرا سا چونکا پھر آہستہ سے کھنکارا تھا۔ جب قدر نے مداخلت کی۔

''پہلے میں نہ سنادوں؟'' عبداللہ نے کاندھے جھٹک دیے۔

''شیور......!'' سب منتظر و ہمہ تن گوش ہوئے۔ وہ مدھر سروں میں کھنکاری۔

زندگی بس اسی کا نام ہوا
دوریاں ، مجبوریاں ، تنہائیاں

''یہ کیا بات ہوئی، اتنا مختصر نہیں چلے گا۔'' عبداللہ نے ڈانٹا تھا۔ وہ جیسے کچھ سوچنے لگی۔

لاپروا وہ دنیا بھر کا
پھر بھی اچھا لگا وہ دنیا بھر سے

''اونہہ...... اتنا مختصر بھی نہیں کچھ مزید۔'' عبداللہ نے مسکراہٹ دبائی۔ وہ بھی جیسے کسی ٹرانس میں تھی۔

پاگل پن کی ساری لکیریں میرے ہاتھ میں کیوں
اس کو چاہوں، میں ہی چاہوں، میں ہی چاہوں کیوں......

(لفظ لفظ مہکتے اِس خوبصورت ناول کی اگلی قسط ماہِ اکتوبر میں ملاحظہ فرمائیے)

محبت پہ یقین رکھنا...

زمر نعیم

''مطلب صاف ہے لڑکیاں کہیں انٹرسٹڈ ہوں تو اسی قسم کے جواز دے کر انکار کرتی ہیں۔'' شہری کے لبوں کی خفیف سی مسکراہٹ میں اُسے تپانے کے لیے شرارتی سی ہو گئی۔ ''مسٹر شہریار میں ذرا مختلف قسم کی لڑکی ہوں، اگر میں کہیں اور انٹرسٹڈ ہوتی تو......

محبت کے یقین اور بے یقینی سے جڑا ایک یادگار افسانہ

شام کچھ دیر پہلے بے حد حسین تھی مگر ......
اچانک اس کا حسن ماند پڑ گیا۔ لاؤنج میں بیٹھے تینوں نفوس اس طرح گم ہوئے تھے جیسے کسی نے انہیں مسمرائز کر دیا ہو۔ چائے کے کپوں میں آدھی بچی ہوئی چائے ٹھنڈی ہو کر یقیناً بے مزہ ہو چکی تھی۔ زہرا اور ماہرہ کے ساتھ راحت بیگم بھی بے یقینی کی کیفیت میں تھیں۔ تینوں کو اپنی اپنی سماعتوں پر شبہ تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے شہریار جو کہہ کر گیا ہے۔ وہ یا تو کوئی خواب تھا یا پھر انہوں نے غلط سنا تھا۔ کچھ لمحوں بعد اپنی بے یقینی کو حیرتوں میں سمو کر آخر زاہرا آپی نے ہی ماحول کے انجماد میں اپنی آواز سے ارتعاش پھیلایا تھا۔

''مما ...... مما! شہری نے کیا کہا ہے کہ ...... وہ رومیصہ سے ہی شادی کرنا چاہتا ہے؟'' زاہرا نے جس طرح مما سے تصدیق طلب کی تھی، صاف محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے بھائی شہریار کی خواہش نے انہیں کتنا بڑا دھچکہ پہنچایا ہے۔

''ہاں آپی یہی تو کہا ہے اس نے ......؟'' ماہرہ کے لبوں سے بھی شکوۂ حیرت برآمد ہوا۔ اسے بھی شہریار کی خواہش احمقانہ سی لگی تھی۔ راحت بیگم کے سینے سے ٹھنڈی آہ اٹھ کر لبوں تک آتے آتے مزید سرد ہو گئی۔

''آہ ...... خاموش نہ رہتی تو کیا کرتی۔ تم بہنوں کو یاد نہیں ہے پانچ سال پہلے بھی وہ رومیصہ سے شادی کرنے کی ضد کر چکا ہے۔''

''اس وقت بھی آپ نے اس کی ضد تو نہیں مانی تھی، اب کیا مان لیں گی ......؟ جبکہ رومیصہ تو اب ......!'' زہرا کے تیکھے لہجے میں واضح ناگواری تھی۔''

''اس کی بیوگی کا سن کر ہی وہ واپس آیا ہے۔ ورنہ مجھے تو کتنے عرصے سے ٹال رہا تھا۔'' راحت بیگم نے بہنوں پر نیا انکشاف کیا۔

''اچھا ......؟ ہم سمجھ رہے ہیں کہ پاپا کے بزنس کا (ڈاؤن فال) Downfall دیکھ کر اُسے عقل آ گئی ہے کہ دوسروں کے بھروسے دنیا کے کام نہیں چلتے۔ اپنے لیے خود بھاگ دوڑ کرنا پڑتی ہے۔'' زہرا کی حیرت میں تلخی بھی گھل گئی۔ ''مجھے بھی یہی خوش فہمی تھی۔ مگر اس نے کچھ دن پہلے مجھ پر واضح کر دیا تھا کہ اس کی واپسی کا مقصد کیا ہے۔''

راحت بیگم نے اُسے سمجھایا بھی کہ رومیصہ سے اس کی شادی ممکن نہیں ہے۔ وہ پہلے والا ایشو بھول گیا ہے۔ وہ اس سے عمر میں دو سال بڑی ہے اور ماہرہ نے حسبِ عادت کچھ تیزی سے اظہار خیال کیا۔

''اُسے پہلے بھی رومیصہ کی بڑی عمر والے مسئلے پر الجھایا تھا۔ اس وقت بھی وہ قائل نہیں ہوا تھا اور اب تو وہ خود مختار ہو چکا ہے۔'' راحت بیگم کی لاچاری میں موجودہ حشت کی بے بسی جھلک رہی تھی۔ زہرا آپی نے راحت بیگم کو تسلی آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ فکر نہ کریں مما! میں اُسے سمجھا لوں گی۔ رومیصہ کے ساتھ صرف ایک پرابلم نہیں اس کے دو بچے بھی ہیں۔ دوسروں کی اولاد کی ذمہ داری وہ کبھی نہیں اٹھائے گا۔ آپ بس اس پر اپنا دباؤ رکھیں۔'' ماہرہ نے بھی تائیداً بہن کی باتوں سے متاثر ہو کر ہاں میں ہاں ملائی۔

''ہاں مما! آپی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ آپ ہرگز مت مانیے گا۔ رومیصہ تو پہلے بھی اس کے قابل نہیں تھی۔ اب تو بالکل بھی نہیں۔'' ماہرہ نے جس نخوت سے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا راحت بیگم کو بھی تسلی ہو گئی تھی کہ شہریار کے سامنے اپنے مؤقف پر ڈٹے رہنے کے لیے ان کے دائیں بائیں ان کی

ڈھارس بی ان کی دو بیٹیاں موجود ہیں۔

☆......☆......☆

زاہرا پر عزم ہو کر شہریار کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ کمرے کی کھڑکی کے پاس کھڑا سگریٹ کو ہونٹوں میں دبائے کسی گہری سوچ میں ڈوبا محسوس ہو رہا تھا۔ آہٹ پر وہ ایسے ہی چونکا جیسے اُسے کسی کسی بھی آمد کی توقع نہ ہو۔

وہ مڑا تو سگریٹ لبوں سے نکال کر تعجب سے انہیں دیکھا۔

''آپ......پ......؟'' وہ مجسم سوال تھا۔

''اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو، کیا میں پہلی بار تمہارے کمرے میں آئی ہوں۔'' آپی نے اُسے جانچتی نظروں سے دیکھا۔

''نہیں...... ایکچو لی...... وہ......؟ اچھا آئیں بیٹھیں۔'' سگریٹ کو ایش ٹرے میں بجھاتے ہوئے اس نے آرام دہ کرسی پر جگہ سنبھالی۔ زاہرا آپی بھی ٹھان کر آئی تھیں کہ آج اُسے دو ٹوک بات کر کے جائیں گی۔ اس لیے اس کے بیڈ سے ٹک گئیں اور بلا تمہید بات شروع کی۔

''شہری تم ہمیں کس امتحان میں ڈال رہے ہو؟''

''کیسا امتحان......؟'' شہریار نے جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے پوچھا۔ پھر زاہرا کی نظروں کا مفہوم سمجھتے ہوئے گویا ہوا۔

''اگر میری خواہش کی تکمیل آپ سب کے لیے مشکل تھی تو پھر مجھے خوشیاں دینے کے دعوے کیوں کر رہے تھے آپ لوگ۔ بار بار ایک ہی اصرار کر رہے تھے کہ واپس آجاؤ۔'' اس کی سنجیدگی میں ہلکی سی تلخی بھی رچی ہوئی تھی۔ جب سے وہ واپس آیا تھا۔ اسی طرح گھر والوں پر وقتاً فوقتاً اپنی ناراضگی جتانے لگا تھا۔ زاہرا نے ایک بار شہریار کو حیرت سے دیکھا۔ اُسے ابھی بھی بے یقینی تھی کہ اس سے اس انداز میں بات کرنے والا وہی شہری ہے جو کبھی مسکرائے بغیر اس سے بات نہیں کرتا تھا۔ بڑے سے بڑے مسئلے کو بھی لاپروائی سے سن کر ٹال جاتا تھا۔ آج جیسے ڈٹ کر بہت کچھ بولنے کے موڈ میں تھا۔

''ہا......ں...... تو ہم تمہیں خوشیاں ہی دینا چاہتے ہیں، آزار نہیں۔'' زاہرا آپی نے جلد ہی اپنی حیرت پر قابو پا کر بات بڑھائی۔

''رومیصہ سے شادی کا فیصلہ سوائے دکھ کے تمہیں کیا دے گا؟''

''یہ صرف آپ لوگوں کا خیال ہے۔ پہلے بھی آپ اور ممانے مجھے ٹریپ کیا تھا۔ آپ کے نزدیک تب بھی میرا اور اُس کا کوئی میچ نہیں تھا اور اب بھی وہی ایشو ہے حالانکہ میرے لیے رومیصہ کا مجھ سے عمر میں بڑا ہونا نہ پہلے مسئلہ تھا اور نہ اب اس کے دو بچے میرے لیے کوئی ایشو ہیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولتا کچھ جذباتی ہو گیا۔ شاید اُسے لگ رہا تھا وہ اسی طرح اپنی بات منوا سکتا ہے۔

''تمہیں کوئی ایشو نہیں ہے مگر ہمیں ہے۔ ہمیں لوگوں کو فیس کرنا ہے۔ ہم اپنے سسرال اور ملنے والوں کو کیا بتائیں گے کہ ہمیں اپنے اکلوتے بھائی کے لیے پسند آئی بھی تو عمر میں بڑی اور دو بچوں کی ماں۔'' زاہرا نے بھی اُسی طرح جذباتی ہو کر جواب دیا تو وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

''آپ لوگوں کی سوچ کبھی نہیں بدلے گی۔ عمر میں بڑی۔ دو بچوں کی ماں...... دنیا کون ہوتی ہے۔'' وہ لمحہ بھر کو استہزائیہ مسکرا کر دوبارہ گویا ہوا۔

''بتائیں آپی دنیا اس وقت اعتراض نہیں کرے گی، جب میں اپنی سے آدھی عمر کی لڑکی سے شادی کروں گا۔'' وہ سراپا سوال بنا پوچھ رہا تھا۔

''دیکھو مرد کی عمر کا حساب کتاب نہیں دیکھا جاتا۔ یہ بات تم بھی جانتے ہو...... پلیز مما کو ٹینشن مت دو۔ اسمارہ کے لیے ماموں جان نے خود کہا ہے۔ تم اس کے ساتھ خوش رہو گے۔ آزما کر دیکھ لو۔ ہم تمہارے لیے برا نہیں سوچ رہے۔'' زاہرا نے یک دم اپنا رویہ نرم اور متاثر کن کرتے ہوئے اٹھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سمجھانے کی کوشش کی۔

''میں جس کے ساتھ خوش رہ سکتا ہوں آپ لوگوں کو بتا چکا ہوں۔ اگر مما چچی عاصمہ کے پاس نہیں جائیں گی تو پھر مجھے مجبوراً خود جانا پڑے گا۔'' شہریار نے قطعیت سے کہتے ہوئے بہن کا ہاتھ کندھے سے ہٹا دیا۔ زاہرا کو غصہ تو بہت آیا مگر وہ ضبط کر کے بولی۔

''مما کا جانا ممکن نہیں ہے۔ بہتر ہوگا تم اپنا فیصلہ تبدیل کرلو۔ شہری ہم رومیصہ اور چچی جان کی فنانشل ہیلپ تو کر سکتے ہیں مگر تمہاری شادی وہاں نہیں کر سکتے۔ ایسا ہوا تو ہم بہنیں اور مما...... سمجھیں گے کہ پاپا کے بعد تم نے بھی ہمیں بے آسرا چھوڑ دیا۔'' زاہرا کی نم آواز میں جذباتیت بھی تھی۔ اور زور و جبر بھی تھا۔ ''تمہیں یاد ہے نا۔ پاپا کی ڈیتھ پر تم نے ہم سے کچھ وعدے کیے تھے۔ اس کے باوجود اگر تم کوئی اسٹیپ لو گے تو یہ یاد رکھنا، شہری مما سہہ نہیں پائیں گی۔'' زاہرا آپی اپنی بات کہہ کر اسے کشمکش میں چھوڑ کر وہاں سے نکل آئیں۔ فی الحال انہوں نے راحت بیگم سے بھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ اپنے طور پر انہوں نے چھوٹے بھائی کو آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ پانچ سال بعد وہ پھر اسی کشمکش میں گھرا تھا۔ راحت بیگم نے ہمیشہ اپنے سسرالی رشتہ داروں کو فاصلے پر رکھا تھا۔ سب سے بڑی وجہ تو معاشی وطبقاتی تفرق تھا۔ جس کو بنیاد بنا کر انہوں نے بہروز دین کو فوراً شادی کے بعد ہی سگے رشتوں سے بھی دور کر دیا تھا۔ راحت بیگم کا تعلق کھاتے پیتے گھرانے سے جبکہ بہروز دین کا تعلق مڈل کلاس خاندان سے تھا۔ دونوں کی پسند و محبت کی شادی تھی۔ اسی لیے بہروز کو سوائے راحت بیگم کی ذات کے کسی رشتے واقدار کی بھی پروا نہ تھی۔ بہتر مستقبل کی چاہ میں انہوں نے پہلے اپنی ماں اور چھوٹے بھائی مہروز کو چھوڑا اور پھر آہستہ آہستہ دوریاں بڑھاتے بڑھاتے لاتعلقی قائم کر لی۔ راحت بیگم نے بھی بچوں کو ددھیال سے زیادہ قریب نہ ہونے دیا۔ وہ تو زندگی نے کروٹ لے کر بہروز کو اماں جی کی وفات پر احساس دلایا کہ اپنے پیاروں سے جدا ہونا کتنا تکلیف دہ امر ہے۔ ماں کی ممتا ان کی ہست و یاس کا ادراک اولاد کو بہت کم ہوتا ہے۔ بلکہ اکثر ہوتا ہی نہیں اماں جی نے بھی ان کی خوشیوں پر اپنی خوشیاں قربان کرتے ہوئے حرف شکایت تک نہ کہا تھا کہ وہ ان کی جدائی میں کس قدر تڑپتی ہیں۔ یہ تو چھوٹے بھائی اور بھتیجی نے انہیں جھنجھوڑ کر بتایا تھا۔ کہ آخری لمحوں میں بھی ان سے ملنے کی تڑپ لیے رخصت ہوئی ہیں۔ شہریار بھی انہی دنوں میں اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس آیا تھا۔ دادی کی وفات کے دکھ سے زیادہ اس بات کا افسوس رہنے لگا تھا کہ وہ اپنے قریبی رشتوں سے اتنی دوران کے دکھ درد سے بے پروا تھے تو آخر کیوں......؟

اس 'کیوں' کا جواب رکھنے والوں سے باز پرس کرنے کے بجائے اپنی طبیعت و مزاج کے مطابق وہ خاموشی سے چچا مہروز اور ان کی فیملی سے ربط و تعلق بڑھانے لگا۔ خون کے رشتوں کی کشش کے علاوہ شہریار کو رومیصہ سے انس و محبت نے باندھ کر بے بس سا کر ڈالا تھا۔ محبت بے اختیاری عمل ہے۔

اس کے ہونے نہ ہونے میں انسان کا رتی بھر عمل دخل نہیں۔ رومیصہ کے معاملے میں شہریار بھی بے اختیار سا ہو گیا تھا۔ باوجود اس بات کی حقیقت کو

تسلیم کرتے ہوئے رومیصہ نہ صرف اُس سے عمر میں بڑی اور مزاج میں سنجیدہ تھی۔ اُسے ہمیشہ اپنے سے چھوٹے کی طرح نرمی و اپنائیت سے ٹریٹ کرتی۔ اس کا دوستانہ رویہ اور خیال رکھنے والا انداز شہریار کے دل میں انوکھی خواہشیں پیدا کرنے لگا تھا۔ اُس کے ارمان مچلنے لگے تھے۔ اس کا دل رومیصہ کا قرب مانگنے لگا تھا۔ اور وہ اپنے دل کی مان کر ہر روز آفس سے کبھی لنچ ٹائم میں اور کبھی شام میں چائے کے وقت اپنی فرمائشیں لے کر چچا کے گھر پہنچ جاتا۔ ''چچی جان آپ کے ہاتھ کا پلاؤ کھانے کا دل چاہ رہا تھا۔ کل ضرور بنایئے گا۔'' ہلکی پھلکی رم جھم میں اچانک جا کر پکوڑے کھانے کی فرمائش کر ڈالتا۔ کام تو سارے رومیصہ ہی کرتی تھی۔ کبھی کبھی وہ چڑ جاتی۔

''شہریار بہروز تم نے کیا ہمارے گھر کو ہوٹل اور مجھے باورچن سمجھ لیا ہے۔ جو مزے سے آ کر آرڈر دیتے ہو۔ یہ چاہیے وہ چاہیے۔'' جواباً چچی عاصمہ اُسے گھور کر سرزنش کرتیں۔

''رومی! شرم کرو! کچھ یہ اس کا اپنا گھر ہے۔ تم اس پر احسان جتا رہی ہو۔''

رومی تو ذرا سی خفگی بھرے تاثر سے بس دیکھ کر رہ جاتی۔ جبکہ شہری ہنس کر اظہار کرتا۔

''چچی جان ایسے مزے کے کھانے کھانے کے لیے میں ساری زندگی احسان لینے کے لیے تیار ہوں۔'' اس کی نظروں اور لہجے میں ذومعنویت کا دونوں کو ہی احساس نہ ہو پاتا تھا۔ وہ بلا جھجک آ کر بہت اپنائیت سے بیٹھ کر وہاں وقت گزارنا پسند کرتا تھا۔ شہری کو لگتا تھا جس طرح محبت اُسے اپنے بہاؤ میں بہا کر رومیصہ کی جانب کھینچ لائی ہے، اُسی طرح رومیصہ بھی اس کا اپنی طرف بڑھتے چلے آنا محسوس کر کے اس کی پذیرائی کرے گی۔ اُسے خبر ہی نہیں تھی محبت میں خوش گمانی کی ناؤ پر سفر کرنے والے کنارے پر بھی ڈوب جایا کرتے ہیں۔ اور وہ بھی محبت کو پانے کا یقین رکھتے رکھتے اچانک لڑکھڑا کر گرا تھا تو ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا تھا۔

اُسے یاد تھے وہ لمحے، وہ ساعتیں وہ وقت جب چچی عاصمہ نے اپنے طور پر اُسے معتبر بنا کر رومی کے لیے آئے ہوئے کسی پروپوزل کی جانچ پڑتال کی ذمہ داری سونپی تھی۔

اُسے لگا تھا چچی عاصمہ نے اس کے سر پر پہاڑ رکھ دیا ہو۔ جس کے بوجھ سے اس کی روح تک دب کر گھٹنے لگی ہے۔ چچی عاصمہ بول رہی تھیں اور وہ جیسے سن کر بھی سن نہیں پا رہا تھا۔ رومیصہ سامنے ہوتی تو شاید اُس کی غیر حاضر دماغی کا نوٹس ضرور لیتی۔

''دیکھو نا بیٹا! تمہارے چچا تو ہیں سادہ مزاج، انہیں ہر کوئی اپنے جیسا ہی لگتا ہے۔ بیٹی کا معاملہ ہے آخر۔ لڑکے کے چال چلن اُس کے روزگار کے بارے میں معلوم کرنا ہمارا فرض بھی ہے اور حق بھی ہے۔ اب یونہی زبانی کلامی باتوں میں آ کر تو رومی کا ہاتھ نہیں دے سکتے نا کسی کے ہاتھ میں۔'' رومیصہ چائے لے کر آئی تھی اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔

''امی!!! اتنی جلدی کیا ہے آپ کو۔ بابا جان کر تو رہے ہیں اپنی تسلی۔ فضول میں شہری پر ذمہ داری لاد رہی ہیں آپ۔'' رومیصہ کی مداخلت پر اس کی دبی گھٹی سانسیں بحال ہوئی تھیں اور وہ خود کو ماحول میں محسوس کر پایا تھا۔ رومیصہ کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی اور لہجے میں بھری خفگی سے اُسے محسوس ہوا تھا، جیسے وہ بھی آئے ہوئے ''رشتے'' پر خوش و مطمئن نہیں ہے۔ دل کی لہر بہک کر سنبھلی تھی۔

''جلدی......؟ ماشاء اللہ سے اس سال ستائیس کی ہو جاؤ گی میری چندا۔ پہلے ہی تمہاری پڑھائی

کے خبط نے اچھے سے اچھوں کو جواب دینے پر مجبور کیا تھا۔ اب بس ہمیں اپنا فرض پورا کرنے دو۔" چچی عاصمہ کی بات پر وہ چائے سرو کیے بنا وہاں سے چلی گئی تھی۔ وہ بھی اس کی حمایت میں خود کو بولے بنا نہیں روک سکا تھا۔

"چچی جان رومیصہ ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی تو آپ مجبور کیوں کر رہی ہیں؟"

"وہ تو دیوانی ہے۔ ابھی بھی کوئی کورس کرنے کی ٹھانے ہوئے ہے۔ بیٹا اسے سمجھاؤ لڑکیوں کی عمر نکل جائے تو پھر مناسب رشتے نہیں ملتے۔ اچھے لوگ ہیں بس تو بس۔"

"مگر آپ تو کہہ رہی تھیں کہ کوئی انکوائری وغیرہ کروانی ہے۔" شہریار نے جلد بازی میں ان کی بات کاٹی تھی۔

"دل کی تسلی کے لیے چھان بین کرنا تو پڑتی ہے بیٹا۔ ورنہ تو جو مقدر میں لکھا ہو وہی ملتا ہے۔ اچھا چھوڑو تم چائے پیو، سموسے تو ٹھنڈے ہو گئے ہوں گے۔ رومیصہ...... رومی...... بھائی کے لیے گرم سموسے تل کے لاؤ۔"

شہریار کو اس وقت نہ چائے اچھی لگ رہی تھی نہ سموسے۔ اس دن پہلی بار اس نے بے دلی سے چائے زہر مار کی تھی۔

وہ اُس دن نئی کیفیت سے دو چار ہوا تھا۔ دل میں مچلتی محبت زبان سے آنکھوں میں آ ٹھہری۔ وہ چچی عاصمہ کے پاس سے اٹھ کر گھر جانے کے لیے نکلا تو صحن میں ایک طرف اداس وخاموش بیٹھی رومیصہ نے اس کے قدم جکڑ لیے تھے۔ کچھ دل کا تقاضا تھا کہ یہی موقع ہے حال دل کہہ دینے کا۔ سو وہ اس کے سامنے پہنچ کر اُسے متوجہ کر گیا تھا۔

"رومی......! آپ یہاں شادی نہیں کرنا چاہتیں۔" موہوم سی آس تھی کہ وہ شاید اُسے کوئی عندیہ دے۔

"یہاں یا کہیں کا سوال نہیں ہے شہری۔ جانتی ہوں شادی تو ہونی ہے، بس امی اور بابا کے تنہا رہ جانے کا خوف رہتا ہے۔ میں انہیں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی۔" اس کی آنکھوں میں ماں باپ سے محبت کی نمی جھلملا رہی تھی۔ شہری کو اُس لمحے وہ بہت چھوٹی اور ناسمجھ سی بچی لگی تھی۔ اس جیسی سنجیدہ اور حقیقت پسند لڑکی سے اس قسم کے رویے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

"اچھا......! میں سمجھا آپ کی اداسی اور انکار کی وجہ کچھ اور ہے۔" آخر شہری اس کے قریب ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا۔

"کچھ اور......؟" "مطلب کیا ہے تمہارا......؟" رومی کا لہجہ ہی نہیں نظریں بھی تیکھی ہو گئی تھیں۔

"مطلب صاف ہے لڑکیاں کہیں انٹرسٹڈ ہوں تو اسی قسم کے جواز دے کر انکار کرتی ہیں۔" شہری کے لبوں کی خفیف سی مسکراہٹ میں اُسے تپانے کے لیے شرارتی سی ہو گئی۔

"مسٹر شہریار میں ذرا مختلف قسم کی لڑکی ہوں، اگر میں کہیں اور انٹرسٹڈ ہوتی تو امی بابا کو کبھی کا بتا دیتی۔ بہرحال امی جو تمہیں ڈیوٹی دے رہی ہیں۔ اگر تم کر سکتے ہو کر دینا۔ کل کو یہ مت کہنا کہ میری وجہ سے نہیں معلوم کیا تھا۔"

"ہاں! میں کوشش کروں گا۔"

شہری اُس وقت تو بے دلی سے ہامی بھر کر گھر آ گیا تھا۔ لیکن پھر وہ رات بھر سو نہیں پایا تھا۔ ساری رات وہ اسی ادھیڑ بن میں رہا تھا کہ کس طرح وہ اپنے دل کی بات رومیصہ تک پہنچائے۔ آخر اس کے دل نے ہی اُسے راہ دکھائی تھی۔ صبح ناشتے کی میز پر بہروز دین، راحت اور ماہرہ کے سامنے اس نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ ماہرہ کی ان دنوں شادی

نہیں ہوئی تھی۔

"مما! چچا جان رومیصہ کی شادی کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔"

"ہاں معلوم ہے ہمیں۔ تمہارے پاپا نے بتا دیا ہے کہ وہ اس کے لیے آئے ہوئے پروپوزل کے لیے سنجیدہ ہیں۔ اب تو سنجیدہ بھی ہو جانا چاہیے۔ کافی عمر ہوگئی ہے اس کی۔"

راحت کے سرسری لہجے میں بڑی نخوت تھی حالانکہ ماہرہ بھی اس کی ہم عمر تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ راحت بیگم نے ماہرہ کی منگنی کر رکھی تھی۔

"مما! میں سوچ رہا تھا کہ اگر آپ اور پاپا میرے لیے چچا جان سے بات کریں تو۔ آئی مین رومیصہ کے لیے۔" شہریار نے آخر مدعا بیان کیا۔

"کیا...... دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا۔" راحت بیگم کا ردعمل بے ساختہ اور کٹیلا سا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ شہریار ایسی کوئی بات کرے گا۔

"وہ تم سے عمر میں بڑی ہے، تم نے یہ سوچا بھی کیسے۔"

ماہرہ اور بہروز بھی اپنی اپنی جگہ پر حیران سے بیٹھے ہوئے تھے۔ جس کے بارے میں کبھی سوچا نہ ہو، وہ بات کوئی کہہ دے تو حیرت تو ہوتی ہے۔

"مما! ایسا کیا غلط سوچا ہے میں نے۔ وہ میری کزن ہے اور اگر تھوڑا سا ایج ڈیفرنس ہے تو کیا فرق پڑتا ہے۔" شہریار نے کھل کر موقف بیان کیا تھا۔

"تمہیں نہ پڑے ہمیں فرق پڑتا ہے۔ بہروز دیکھ لیں۔ کیا گل کھلا ہے۔ اسی لیے میں اس کے وہاں جانے کے خلاف تھی۔" راحت بیگم ناراضگی کا بھرپور اظہار کرتی وہاں سے اٹھ کر چلی گئی تھیں۔

ایک عجب سی سرد جنگ چھڑ گئی تھی۔ وہ اپنے محاذ پر تنہا تھا۔ اور گھر والے متحد، حتیٰ کہ بہروز دین بھی راحت بیگم کے ہمنوا تھے۔ بیٹے کا ساتھ دینے کے بجائے انہوں نے خاموشی اختیار کرلی تھی۔ یہ کہہ کر کہ تمہاری ماں تمہارے لیے بہتر سوچ رہی ہے۔"

وہ زندگی میں پہلی بار نئے رویے دیکھ اور محسوس کر رہا تھا۔ ساری زندگی اس کی چھوٹی چھوٹی خواہشیں ماننے والی اس کی ماں اور بہنیں اُسے اس کی خوشی کے حصول سے روکنے کے لیے نئی نئی حکایتیں سنا رہی تھیں۔ زمانے کے خوف سے ڈرا رہی تھیں۔ کہ دو سال بڑی عمر کی لڑکی سے شادی کرے گا تو دنیا تو کیا جیسے زندگی سے کٹ کر رہ جائے گا۔

وہ اپنے محاذ پر ابھی ڈٹا ہوا تھا کہ اسی عرصہ میں چچا مہر دز رومیصہ کی شادی طے ہو جانے کی مٹھائی کے ساتھ ساتھ اُسے رومیصہ کا بھائی ہونے کا فرض دلانے اور رومیصہ کی شادی حوالے سے ذمہ داریاں سونپنے چلے آئے۔ وہ سن کر ششدر رہ گیا۔ اُسے توقع نہیں تھی کہ اتنی جلدی سارے مراحل طے ہو جائیں گے۔ وہ تو گھر والوں کو منانے کی دھن میں دن رات اور وقت کو ہی بھلا بیٹھا تھا۔ یک طرفہ محبت کی جنگ میں نصیب نے پسپائی لکھ دی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ خود کو سمجھائے تو کیسے۔

راحت بیگم کا موڈ اور گھر کی فضا بہت دنوں بعد بدلی تھیں اور بدل تو وہ بھی گیا تھا۔ دل کے خالص جذبوں کو دل کے نہا خانوں میں مقید کرنے کا جبر، محبت کرنے والوں کے لیے غصہ، ضد اور بے حسی سی اس کے اندر پیدا ہوگئی تھی۔ کیا تھا جو اُس کی مما اس کی ایک خاص خوشی کو دل سے مان دے کر جزو زندگی کرنے کا سامان کر دیتیں۔ جھوٹی انا کا احساس کر لیتیں تو وہ زندگی سے خالی نہ ہو جاتا۔ اس کے خواب نہ مرتے۔ نہ ہی اس کی نیندیں روٹھتیں۔

☆......☆......☆

رومی سے دل کی چاہتیں بیان کیے بغیر وہ بہت

بھرم رکھ کر ان فضاؤں سے دور چلا آیا تھا۔ جہاں وقت انسان کو احساسات سے عاری کسی مشین کی طرح گھماتا چلا جاتا ہے، جہاں رشتوں سے زیادہ ڈالر کی اہمیت ہے۔ وہ دولت کی چاہ نہیں رکھتا تھا ،بس مجبوراً خود اس کو چاہ میں مبتلا کرنے میں کوشاں ہو گیا تھا۔

اُسے یاد تھا۔ وہ رومی کے رخصت ہونے سے پہلے آخری بار ملنے آیا تھا تو اپنے اندر مچلتی محبت میں تلاطم لے کر آیا تھا۔ اگر اُسے خود پر اختیار نہ ہوتا تو یہ تلاطم سب ہی کے بھرم توڑ کر ایک طوفان لے آتا۔ وہ اس کے واپسی کے ارادے جان کر خفا ہو رہی تھی اور وہ بے بسی سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

''میں تو پہلے ہی بابا جان سے کہہ رہی تھی شہری سے کوئی توقع نہ رکھیں۔ بیٹے اور بھتیجے میں فرق ہوتا ہے۔ وہ کہاں آپ کے ساتھ ذمہ داریاں اٹھائے گا۔''

''ایسی بات نہیں ہے رومی! واپس جانا ضروری ہے۔''

''میری رخصتی تک تو ٹھہر جاتے......'' وہ خفگی سے بولتی اُسے مزید شرمندہ کر رہی تھی۔

''میرے اختیار میں ہوتا تو ضرور ٹھہرتا مگر جاب اپلائی کر رکھی تھی۔ اپائنٹمنٹ لیٹر آ گیا ہے اس لیے جانا ضروری ہے۔'' وہ کچن میں کھڑی اس کے لیے چائے بناتی اس کے ضبط کے بندھن توڑنے کی کوشش میں تھی۔ دل میں تو تھا کہ وہ اس سے حال دل کہہ کر اپنا ہمنوا کر لے مگر محبت کا بھرم ٹوٹ جانے سے ڈرتا تھا۔ ابھی تو وہ اس خوش گمانی میں زندہ تھا کہ وہ اپنی محبت میں سچا کھرا ہے۔ عمر کا فرق بے معنی کرتی اس کی چاہت اس کے حصول کی امید کو رکھتی کسی معجزے کی منتظر تھی۔ وہ اپنے طور پر کوششیں تو کر چکا تھا۔ جو اُس کے نزدیک جائز تھیں۔

''سچ سچ بتاؤ واپسی کی یہی وجہ ہے یا کوئی اور بلا رہا ہے۔'' اس کے سامنے چائے کا کپ اور بسکٹ کی پلیٹ رکھتے ہوئے وہ اُسے چھیڑ رہی تھی۔

''اگر میں کہوں کہ وہ کوئی اور یہیں چھوڑے جا رہا ہوں تو......'' شہری کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔

''رئیلی (Really) تم نے کبھی ذکر نہیں کیا' کیا......؟ واپس آ کر شادی کرو گے؟'' وہ دلچسپی ظاہر کرتی کرسی کھینچ کر سامنے بیٹھ گئی تھی۔

''میری واپسی سے پہلے اس کی شادی ہو چکی ہو گی۔'' شہریار نے دانستہ نظریں اس کے چہرے سے ہٹائی تھیں۔

''کیا......؟'' وہ بے یقینی سے چیخ اٹھی تھی۔

''تم اس طرح......؟ اتنے بزدل لگتے تو نہیں ہو......؟ تائی جان نہیں مانیں یا لڑکی...... کے گھر......!''

''مذاق کر رہا تھا۔ آپ تو سیریس ہی ہو گئیں۔ او کے میں پرسنلی آپ کو ویڈنگ گفٹ بھجواؤں گا۔ پلیز کسی سے کوئی بات مت کہنا۔'' وہ یکدم ہی کھڑا ہو گیا۔ رومی اُسے مسلسل بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے اس کے اندر جھانکنا چاہتی ہو۔ وہ اس سے کترا کر فوراً ہی وہاں سے نکل آیا تھا۔

ایک دکھ تو نارسائی کا تھا دوسرا ابھی جان کا قلق بن گیا تھا۔ سگے رشتوں کی بے اعتنائی نے اُس کے اندر نئے غم کی فصل بو دی تھی۔

☆......☆......☆

وہ گھر لوٹا تو اس کے قدم لاؤنج کے باہر ہی ٹھہر گئے تھے۔ ماہرہ، زاہرا کے ساتھ محو گفتگو تھیں۔ اس کے واپس جانے کا تذکرہ تھا۔ زاہرا حیرانگی سے پوچھ رہی تھی۔

''مما! آپ نے شہری کو روکا کیوں نہیں۔ ہم تو اُس کے لیے لڑکیاں دیکھ رہے ہیں ناں۔''

''ابھی میں خود چاہتی ہوں وہ چلا جائے۔ رومیصہ کی شادی ہو جائے پھر اطمیں ان سے لڑکیاں دیکھ لینا۔''

''مما...... وہ ناراض ہو کے جا رہا ہے، اگر واپس نہ آیا تو۔''

''وقتی ناراضگی ہے اس کی۔ بہل جائے گا کچھ دنوں میں۔'' ماہرہ کے خدشات بھی راحت بیگم کے لیے بے معنی سے تھے۔

''میں تو شکر کر رہی ہوں مما! آپ اُس کی محبت میں ایموشنل نہیں ہو گئیں۔ کہاں رومی ...... کہاں شہری۔''

''میں اس بات پر شکر کر رہی ہوں کہ چچا جان نے بروقت رومی کی شادی کا فیصلہ کر لیا۔ اگر انہیں شہری کے ارادوں کی بھنک بھی پڑ جاتی تو وہ پھر شہری کو ہی ترجیح دیتے۔'' دونوں بہنوں کو اپنی اپنی رائے دینے کا موقع ملا ہوا تھا۔

''میں ایسا ہونے دیتی۔ ہرگز نہیں ...... نہ حیثیت ...... نہ شکل وصورت اور پھر عمر دیکھو۔ میں اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے اپنی حیثیت کے مطابق اس کے جوڑ کی دلہن لاؤں گی۔ جو اس کے ساتھ جچے۔''

''صحیح کہہ رہی آپ مما! ویسے مجھے بھی یہی لگتا ہے۔ شہری رومی سے وقتی طور پر متاثر ہوا ہے۔ یہاں سے کچھ عرصہ دور رہے گا تو اس کے ٹرانس سے نکل جائے گا۔'' اس کے گھر والوں کے خیالات نے اس کے اندر نئی توڑ پھوڑ مچائی تھی۔ اس کے خالص جذبوں کو وقتی و لمحاتی محسوسات سمجھنے والے بھول رہے تھے کہ محبت اگر ملاوٹ اور غرض سے پاک ہو تو اس کا ذائقہ اور حلاوت موت کے آخری لمحے تک تسکین آور رہتا ہے۔

☆......☆......☆

اُس کے جانے کے بعد زندگی نے کتنے رُخ بدلے تھے۔ موسموں کے پیرہن اجلے، اودے اور گرد آلود ہو کر وقت کی بارشوں سے کئی بار نکھرے نکھرے تھے۔ کئی بار غم کی شدتوں میں لپٹ کر سر پٹخ پٹخ کر بین کرتے ہوئے روتے سسکتے گزرے تھے۔ وہ ان شدتوں میں نہیں تھا مگر غیر حاضر ہو کر بھی وہ اپنے ان اپنوں کا واقف حال رہا تھا جو دل میں بستے تھے۔ آنکھوں میں خواب کی مانند رہتے تھے۔ ذہن میں سوچوں کی طرح متحرک تھے۔

جن کی رفاقت کی چاہ رکھ کر بھی جدائی کی تڑپ ہے۔ وہ پردیس کی اسیری میں تھا۔ کچھ مجبوریاں اُسے گھیر لائی تھیں۔ رشتوں کے کچھ تقاضے دامن گیر ہوئے تھے۔ بے حسی وضد کے مصنوعی لبادے کو بالآخر اتار کر وہ پلٹ آیا تھا۔ پلٹ آنے میں بھی اک آس واُمید نے جذبوں کو بہلانے کا بہلاوا دیا تھا۔ مگر پھر وہی منطقیں، وہی بوسیدہ جواز جن سے وہ پہلے بھی قائل نہیں تھا اور نہ وہ اب ہونا چاہ رہا تھا۔ دل و ذہن پھر سے اپنے مؤقف پر اٹل تھے۔ مما اُسے جذباتی طور پر منانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''سنو شہری ...... میں تمہاری ماں ہوں۔ میں نے تمہاری بہتری سوچ کر ہی اسمارا کو تمہارے لیے مانگا ہے۔ تم کیوں ضد کر کے بیٹھ گئے ہو۔ اُس بڈھی سے شادی کرو گے۔''

راحت بیگم کا لہجہ و رویہ ایک بار پھر تکلیف دہ ہو گیا تھا۔ اس نے ماں کو بڑی شاکی نظروں سے دیکھا اور ناشتا کیے بغیر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''اگر آپ کو یہ میری ضد لگتی ہے تو اب میں اپنی ضد پوری کر کے رہوں گا۔''

وہ وہاں سے نکل کر بے مقصد سڑکوں پر گھومنے نکل کھڑا ہو گیا گاڑی کی تیز رفتاری اس کے اندر اٹھتے ہیجان کی غماز تھی۔ اس کا ہیجان ختم ہوا تو وہ چچی

عاصمہ کے گھر اور رومیصہ کے سامنے تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے اپنے چار سالہ بیٹے اور تین سالہ بیٹی کے ساتھ اسکول سے لوٹی تھی۔ جب سے وہ بیوہ ہو کر واپس آئی تھی، ایک اسکول میں ٹیچنگ کر رہی تھی۔ چچا مہروز بھی چند ماہ پہلے بیٹی کے دکھ کو دل کا روگ بنا کر دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔

''سنا تو تھا کہ تم واپس آ چکے ہو، مگر شاید یہاں کا رستہ یاد نہیں تھا۔'' وہ سابقہ انداز میں بولتی اس کے سامنے مشروب کا گلاس رکھتی شکوہ کناں تھی۔

''راستہ بھی یاد تھا اور تم بھی، بس! یہاں آنے کے لیے حوصلے جمع کر رہا تھا۔''

''ا...... ر...... ے...... میں'' آپ سے تم کب سے ہو گئی۔ ادب بھول گئے۔ بڑی ہوں تم سے......؟'' اس کی حیرت بجا تھی مگر وہ آج سب کچھ ٹھان کر آیا تھا۔

''بڑی ...... بڑی...... بڑی آخر تم سب کو یہ بات یاد کیوں رہتی ہے۔ کیوں اس بات کو میرے لیے ہوّا بنا دیا ہے۔ یہ کہاں لکھا ہے کہ اگر عورت مرد سے عمر میں بڑی ہے تو وہ اس سے محبت نہیں کر سکتا، اس کے بارے میں سوچ نہیں سکتا یا اس سے شادی نہیں کر سکتا۔''

''شہر...... یار کیا کہہ رہے ہو تم......؟'' رومیصہ جیسے بے یقینی سے چیخ اٹھی تھی۔ چچی عاصمہ جو طبیعت کی خرابی کی وجہ سے کمرے میں سو رہی تھیں، وہ بھی اٹھ کر چلی آئی تھیں۔ بچے بھی کھانا کھا کر سوئے ہوئے تھے۔

''ٹھیک کہہ رہا ہوں محبت کرتا ہوں میں تم سے۔ آج سے نہیں اُس پہلے لمحے سے جب میں نے تمہیں دیکھا تھا۔''

وہ بے اختیار ہوا جا رہا تھا اور رومیصہ ششدر رو گنگ۔ زمین تو ساکن تھی ہی وقت اور فضا بھی ساکت محسوس ہو رہے تھے۔ چچی عاصمہ بھی متحیری نا سمجھی کے عالم میں دروازے کی چوکھٹ تھامے کھڑی تھیں۔ بس شہریار کی آواز کی گونج تھی جو ماحول میں مرتعش ہو رہی تھی۔

''اور...... اور میں نے بہت چاہا کہ تم تک اپنے دل کی بات اُس ذریعے سے پہنچاؤں جو تمہیں معتبر کر دے۔ مگر میں ...... میں ناکام ہو گیا...... لوگ سمجھتے ہی نہیں۔ اتنے سال گزرنے پر بھی مما سمجھتی ہیں کہ یہ میری نا سمجھی، میری ضد ہے۔''

''شہریار...... وہ شاید ٹھیک سمجھتی ہیں۔'' وہ بولی تو فقط اتنا۔ اور پھر کمرے سے نکل گئی۔ وہ بے بسی سے اُسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

''چچی جان...... میں رومی سے شادی کرنا چاہتا ہوں میری بات کا یقین کریں۔ میں رومی سے محبت کرتا ہوں۔'' وہ انہیں قائل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

''ہم اس بارے میں پھر بات کریں گے بیٹا۔'' چچی عاصمہ کے لیے بھی یہ انکشاف حیران کن اور ناقابل یقین تھا۔ شہریار چند لمحے ٹھہر کر وہاں سے اٹھ آیا تھا مگر چچی عاصمہ کی سوچوں کا رخ بدل گیا تھا۔

''کاش ایسا ہو سکتا۔'' یہ حسرت ماں کے دل سے اٹھی تھی۔ مگر بحیثیت معاشرے کے فرد ہونے کے وہ اپنے ارد گرد کے لوگوں کے ذہنوں میں بسی سوچوں سے اچھی طرح آگاہ تھیں۔ ان کی بیٹی کا جرم نہ ہوتے ہوئے بھی لوگ اُسے موردِ الزام ٹھہرانے پر تلے ہوئے تھے۔

☆......☆......☆

اور پھر ایک زوردار جنگ چھڑ گئی تھی۔ پہلے وہ ماں بہنوں سے بنرد آزما تھا۔ اب رومیصہ کو بھی قائل کرنے میں ناکام ہو رہا تھا۔ اگلے دن ہی وہ

دوپہر کے بعد رومیصہ کو اپنے جذبوں کی صداقت کا ایقان بخشنے آن پہنچا۔ یہ کڑا وقت اس نے جس کشمکش میں گزارا تھا یہ وہی جانتا تھا۔ وہ بمشکل اس سے بات کرنے پر تیار ہوئی تھی۔ وہ بھی چچی عاصمہ کے کہنے پر۔

''تم نے ایسا سوچا بھی کیسے۔'' وہ قدرے خفگی سے اظہار کرتی اپنی کشمکش عیاں کر گئی۔

''سوچوں پر کسی کا اختیار ہے اور پھر میری سوچ ایسی انہونی بھی نہیں ہے۔'' اس کے سامنے کھل کر بولنے کا موقع تھا تو وہ اپنے بھرپور اعتماد سے بول رہا تھا۔ رومیصہ نے اُسے پھرانہی نظروں سے دیکھا۔

''انہونی ہے شہریار...... ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں، جن لوگوں سے وابستہ ہیں اس کے لیے ایسی سوچیں کسی دیوانے کا خواب بھی جاتی ہیں۔''

''اور تمہارے لیے......؟'' وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔

''میں بھی اُسی معاشرے کا حصہ ہوں۔'' رومیصہ کا رد یہ حوصلہ شکن تھا۔ ''میں نہ صرف عمر میں تم سے بڑی ہوں میرے دو بچے ہیں اور...... میں بیوہ ہوں۔'' وہ یکدم تلخ ہوگئی تھی۔

''ان حقیقتوں کو ماننے کے باوجود یہ بات کہاں ثابت ہوتی ہے کہ تم میرے ساتھ کے قابل نہیں ہو...... پلیز...... پلیز رومی فطرت، مذہب کی دی گئی رعایت اور تعلیم کو معاشرتی فرسودگی کے مقبرے میں زندہ دفن کرنے کی کوشش مت کرو۔ جب مذہب ہمیں زندگی کے قرینے سکھانے کی کوشش کرتا ہے تو ہم جان بوجھ کر اندھے کنوؤں میں کیوں گرنا چاہتے ہیں۔'' وہ زچ ہوکر جذباتی پن سے بولا۔

''اس لیے کہ وہ کنویں ہم نے ہی کھود رکھے ہیں۔''

''خدا کے لیے رومی...... تم تو اس سسٹم کا حصہ نہ بنو۔ تم میرا ساتھ دو تو مجھے نہ اس دنیا کی پروا ہے نہ گھر والوں کا خوف۔ میں تمہارے لیے سب سے کٹ کر رہ سکتا ہوں، تم میری محبت کا یقین تو کرو۔''

''شہریار زندگی دنیا اور رشتوں سے کٹ کر جینا آسان نہیں ہے۔ میری ماں ہے، میرے بچے ہیں انہیں کیسے فراموش کرسکتی ہوں۔ وہ بھی اس محبت کے لیے جس کا مجھے یقین نہیں ہے۔'' وہ بے رحمی سے بولتی اپنی نشست چھوڑ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔

''میں یقین دلاسکتا ہوں تمہیں کہ میرے دل کا ہر جذبہ صرف تمہارے لیے ہے۔ بتاؤ کیسے یقین آئے گا تمہیں۔ میں ہر آزمائش سے گزرنے کو تیار ہوں۔'' وہ بھی اٹھ اُس کے مقابل آ کھڑا ہوا تھا۔ شہریار کی نظریں اس کے چہرے پر ٹھہری ہوئی تھیں۔ رومیصہ اُسے ایک نظر دیکھ کر نظر چرا گئی۔

''فضول کی بحث ہے یہ۔ میں نے کبھی تمہارے بارے میں ایسا نہیں سوچا۔ تم تائی جان کی بات مان لو۔ ان کی ممتا کو آزمائش میں مت ڈالو۔''

''آزمایا تو مجھے جارہا ہے۔ بہرحال ابھی میں جا رہا ہوں، تم سوچ لو اگر میں تمہیں شریک زندگی نہ کر سکا تو کوئی اور بھی میری زندگی میں شامل نہیں ہو سکے گا۔ یادرکھنا۔''

شہریار مایوس نہیں تھا، بس رومیصہ کو سوچنے سمجھنے کے لیے وقت دے رہا تھا۔ عاصمہ چچی تو شہری کی محبت پر یقین لے آئی تھیں۔ گذشتہ برسوں میں وہ جس طرح ان سے جڑا رہا، جس طرح ان کی خیر خبر رکھی تھی۔ اس سے تو یہ ہی ظاہر تھا کہ اس کے دل میں خون کے رشتے کی کشش کے علاوہ بھی کچھ تھا جس نے ان کے یقین کو پختگی دی تھی۔

☆......☆......☆

راحت اور اُن کی بیٹیاں ڈٹ گئی تھیں۔ شہریار ان کی نہیں مان رہا تھا۔ اور وہ شہریار کی نہیں مان رہی

تھیں۔ اپنے طور پر انہوں نے بھائی سے بھتیجی اسمارا کا ہاتھ مانگ لیا تھا اور فوری نکاح کا دن بھی مقرر کر لیا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ شہری ہمیشہ کی طرح آخر ان ہی کی مانے گا۔ ایک ہفتے کے انتہائی نوٹس پر وہ تیار کر رہی تھیں خریداری وغیرہ بھی زور و شور سے جاری تھی۔ ایک بار پھر راحت بیگم اُسے منانے بلکہ رام کرنے چلی آئی تھیں۔ وہ لاتعلق سا اپنا سامان پیک کرنے میں مصروف تھا۔

''شہری...... تم کہاں جا رہے ہو......؟'' اسے سفری بیگ میں اپنا سامان ٹھونستے دیکھ کر راحت بیگم نے اپنا دل بیٹھتا محسوس کیا تھا۔ سارے خاندان کو انہوں نے دعوتِ نکاح دے دی تھی۔

''جس جگہ پر میری خوشیوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے وہاں رہ کر میں کیا کروں گا۔'' اس نے بیگ کی زپ کو جھٹکے سے بند کر کے قدرے خفگی سے جواب دیا تو ان کی آواز غم سے پھٹ گئی تھی۔

''تمہاری خوشی......؟ شہری ہمیشہ تمہاری خوشی کا ہی تو سوچا ہے۔ دیکھو تم کہیں نہیں جا سکتے۔ پرسوں تمہارا نکاح ہے۔ تم اس طرح میرے خاندان میں میرا تماشا بنواؤ گے......؟'' وہ جو بڑے غصے میں آئی تھیں۔ شہری کا ردعمل دیکھ کر ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

''اس کا سامان آپ نے خود کیا ہے مما۔ مجھے بلیم مت دیں۔'' وہ بیڈ سائیڈ ٹیبل کی درازوں سے اپنی چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی نکال کر بیگ کے وسط میں پھینک رہا تھا۔

''دیکھو شہری اگر تم نے یہاں سے جانے کی کوشش بھی کی تو میں خود کو شوٹ کر لوں گی۔ اسمارا سے نکاح سے پہلے تم نہیں جا سکتے۔'' انہوں نے شہری کو دھمکایا تو وہ بے بسی سے چیخ اٹھا۔

''مما! یہ تو سراسر بلیک میلنگ ہے۔ جس رشتے کو میں ذہن سے قبول نہیں کر رہا اُسے نبھاؤں گا کیسے۔''

''جب رشتے بن جاتے ہیں تو نبھ بھی جاتے ہیں میں ایک بار پھر تمہیں بتا رہی ہوں شہری۔ اگر تمہارا قدم اس گھر سے نکلے گا تو میرا دم جسم سے۔ اب تم سوچ لو، تمہیں ماں کی زندگی عزیز ہے یا اپنا نام نہادعشق۔''

''مما...... مما...... آپ......؟'' شہری نے بے بسی سے جاتی ہوئی راحت بیگم کو پکارا۔ وہ اُس کی پکار پر ایک پل کو رُک کر اُسے دیکھ کر چلی گئیں۔ اُسے اندازہ تھا اس کی مما ایسا کر گزریں گی، ان کی ضد سے کون واقف نہیں تھا۔ ساری زندگی اس کے پاپا کو اس کی ماں سے ملنے نہیں دیا تھا اور اب اُسے پابندیوں میں جکڑنے کی کوشش میں تھیں۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کرے تو کیا کرے۔ بے بسی کی انتہاء نے اُسے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

وہ راحت بیگم کے سامنے سر جھکائے کھڑا بول رہا تھا۔ لہجہ مدھم اور تاثر سرد تھا۔

''مما آپ چاہتی ہیں کہ میں اس گھر سے نہ جاؤں اور......'' راحت بیگم نے حیرت و خوشی سے اس کی بات درمیان سے کاٹ دی۔

''ہاں...... میرے بچے، میری جان...... تم چلے جاؤ! ایسا میں نے کبھی نہیں چاہا۔ دیکھنا تم اسمارا کے ساتھ کتنا خوش رہو گے۔ تمہیں وہ...... رومی یاد بھی نہیں رہے گی۔'' وہ جذباتی ہو گئی تھیں۔ شہریار کے چہرے پر پھیلی مردنی اور شکستگی انہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ ان سے بہت کچھ کہنے آیا تھا مگر پھر ان کی خوشی ان کا یقین ان کا ولولہ اُسے خاموشی سے پلٹ آنے پر مجبور کر گیا۔

کمرے میں آتے ہی اس نے بستر پر لیٹ کر

دراز سے خواب آور گولیوں کی شیشی نکال کر لاتعداد گولیاں ہتھیلی پر رکھیں اور پانی کا گلاس لبوں سے لگا لیا۔ اگلے ہی لمحے وہ اپنے سیل فون سے رومیصہ کو کال کر رہا تھا۔ چند بار کی کوشش کے بعد آخر رومیصہ نے اس کی کال ریسیو کی۔

''سنو رومی...... ابھی صرف مجھے بولنے دو...... پھر شاید تم یہ آواز نہ سن سکو۔'' شہری کی آواز کا بوجھل پن غیر معمولی تھا۔ رومیصہ نے چونک کر اضطراب سے پکارا تھا۔

''کیا ہوا شہری...... تم ٹھیک تو ہو......؟''

''پلیز...... ز...... ز رو...... می...... میری بات سن لو۔ تمہیں میری محبت کا یقین نہ تھا۔ جبکہ مما اور آپی کو یقین تھا کہ میں تمہاری محبت میں بغاوت پر اتر سکتا ہوں۔ تب ہی انہوں نے اپنی زندگی کی بازی لگا کر مجھے زندگی ہارنے پر مجبور کر دیا۔ وہ چاہتی ہیں میں تمہیں بھلا کر کسی اور کی محبت کو دل میں بسا لوں، تو......'' اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی اور لفظ ٹوٹ رہے تھے۔

تو ایسا ممکن ہی نہیں تھا۔ دل بعد میں دھڑکتا ہے تمہاری محبت پہلے لہو میں گردش کرتی ہے۔ جس دل میں تم نہ رہو اس کے دھڑکنے کی تمنا ہی نہیں ہے مجھے۔ سو آج میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے......

بلکہ یقیناً میرے مالک وخالق نے روز اول ہی رقم کر دیا تھا کہ تمہاری چاہت کے بغیر جینا نہیں پڑے گا مجھے۔ میں اپنی محبت کی صداقت کی گواہی بن کر تم سب سے رخصت ہو رہا ہوں...... تم نے کہا تھا نا کہ تم کو یقین نہیں ہے مگر اب تو یقین کرنا......''

اس کی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں اور سانسیں موندنے۔ لفظ بکھر کر دور تک پھیلتے ہوئے دوسری طرف فون کان سے لگائے رومی کی دھڑکنوں کی رفتار بڑھا رہے تھے۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی وہ کیا کرے۔

تایا بہروز کے گھر کا فاصلہ اتنا تھا کہ وہ برقی رو پر بھی چلتی تو نہ پہنچ پاتی۔ حواس سنبھلے تو اُسے خیال آیا کہ تائی کو فون کر کے بتا دے جب تک اس نے خبر پہنچائی بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ اپنی محبت کی صداقت کی گواہی بن کر زندگی سے دور موت کی آغوش میں سو چکا تھا۔

سسکیاں...... بین، آہیں، فریادیں...... پچھتاوے کوئی عمل بھی تو کارگر نہ ہوا تھا۔

راحت بیگم کو عالم سکتہ میں اسپتال میں پڑی تھیں جبکہ زاہرا، ماہرہ کے کوسنے اور بین رومیصہ کو مجرم ثابت کر رہے تھے۔

رومی اشکبار آنکھوں اور ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ سوچ رہی تھی کہ اس کا قصور کیا تھا۔ شہری کی محبت ہونا۔ یا پھر اس کی محبت کا یقین نہ کر کے اس کا ساتھ نہ دینا۔ دنیا دونوں صورت میں اسے کٹہرے میں کھڑا کر رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی، محبت پر تو اسے یقین تھا بلکہ اسی لمحے شہری کی محبت کا ایقان اس کی دھڑکنوں میں بھی بس گیا تھا جب وہ پہلی بار دادی کی میت میں آیا تھا اور اپنی نم آنکھوں سے اظہارِ افسوس کرتا صرف تسلی سے دلجوئی کی کوشش میں اس کے بابا کے کندھے پر جھکا اس کی آنکھوں سے دل میں اتر آیا تھا۔ یہ اور بات تھی محبت کو محسوس کر کے بھی اس کے حصول کے لیے اس نے دل کو تڑپنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اپنے اور شہری کے درمیان اُسے ہر تفرق کا ادراک بھی تھا۔ اور احساس بھی۔ تبھی اس نے کبھی شہری کی حوصلہ افزائی کی کوشش کی تھی اور نہ ہی پذیرائی۔

مگر اب شاید! شہری کی محبت کا تلاطم اُسے بھی لہروں میں بہا کر لے جاتا لیکن شہری نے تو بہت جلد نتیجہ اخذ کر کے ہار مان لی تھی۔ اُسے سوچنے کا موقع دیا تھا تو انتظار تو کرتا...... شاید محبت اُسے مجبور کر دیتی۔

☆☆......☆☆

افسانہ

الماس روحی

بڑے سرکار

آج بڑے سرکار کی حویلی کا نقشہ تبدیل ہو چکا تھا۔ نہ سرکار کے آنے کا خوف رہا نہ جانے کی فکر۔ ریت، روایت اور ماحول سب ہی کچھ تو بدل چکا تھا۔ جوان پوتے گھر میں نیکر پہن کر گھومتے، پوتیاں بال کٹوائے صحن میں ان کی آنکھوں کے سامنے ورزش کرتی ہیں، بہوئیں......

آج اور کل کی تصویر، ایک خوب صورت افسانہ

بڑے سرکار گھر میں آتے تو دروازے سے لے کر دالان تک اور دالان سے لے کر کمروں تک کھلبلی مچ جاتی۔ پردے، چادریں درست کیے جاتے۔ چاندنی کا کونا دوڑ کر سیدھا کیا

جاتا، گاؤ تکیہ تک ترچھا نہ ہوتا۔ اُگال دان جلدی سے لا کر رکھ دیا جاتا۔ بڑی بیگم صاحبہ ہدایتیں دیتی رہتیں۔

''پان کی ڈبیا کہاں ہے؟'' بٹوے میں الائچیاں ڈالیں یا نہیں۔'' اری وحیدن! آئے مکئی لگائی کہ نہیں، تیرے سرکار آتے ہوں گے، انہیں آتے ہی گرم گرم روٹی چاہیے ہوگی۔''

اتنے میں سرکار آجاتے، بڑی بیگم ان کی طرف جلدی سے دوڑتیں۔ ''لائیے شیروانی تانگ دوں۔''

گھر میں سرکار کے آتے ہی سناٹا ہو جاتا۔ منیا منہ بسورنا بھول جاتی، منے میاں پتنگ اڑاتے ہوئے، اور آداب ابا جان کہہ کر ادب سے کھڑے ہو جاتے۔ بڑے سرکار نہا دھو کر کچی کڑھائی کا نفاست سے بنا سفید کُرتا اور سفید ہی چوڑی دار پاجامہ زیب تن کیے مسہری پر براجمان ہو جاتے۔ شیروانی کی روپوں سے بھری جیب خالی کرتے اور بڑے سلیقے سے گڈی بنا کر سیف میں رکھ کر کنجی گھما دیتے۔ پھر دائیں بائیں گاؤ تکیہ رکھ کر پلنگ پر بیٹھے سارے گھر کا جائزہ لیتے رہتے اور پھر بے نیازی سے تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیتے۔

بیگم پیار بھری نظروں سے انہیں دیکھتیں اور

خوشامدانہ لہجے میں کہتیں۔ ''تھک گئے ہوں گے لائیں سر دبادوں۔'' اور کوئی جواب نہ پاکر ہاتھ سے پنکھا لے کر ہلانے لگتیں۔ سرکار جھنجھلا کر کہتے۔

''آپ کھانا دینا چاہتی ہیں یا نہیں؟''

''ہاں، ہاں ابھی لاتی ہوں، ذرا وحیدن گرم گرم پھلکے ڈال لے۔'' بیگم سہم جاتیں۔

''اتنی دیر سے کیا کیا جا رہا تھا؟'' وہ تڑخ کر پوچھتے۔

''آپ کا انتظار تھا، بس میں ابھی لائی۔'' بیگم پنکھا چھوڑ، باورچی خانے کی طرف دوڑ لگاتیں۔ کھانا دسترخوان پر چن دیا جاتا۔ بارہ سالہ منیا سرخ دوپٹا اوڑھے گرم گرم پھلکے دوڑ کر لانے لگتی۔ ''اچار رائتہ، چٹنی نہیں ہے گھر میں؟'' سرکار کھانا کھاتے کھاتے غراتے۔

''اور یہ گوشت کون لایا ہے، ساری چربی اٹھا لایا۔ ایک بوٹی بھی کھانے کے لائق نہیں۔ نہ چانپ نہ سینہ، استغفراللہ، یہ کوئی گوشت ہے؟'' بیگم صاحبہ کانپ جاتیں۔

''وحیدن اری او وحیدن! گوشت ٹو لائی تھی ناں۔''

''نہیں بڑی بیگم، خیر و لایا تھا۔''

''دیکھا! سرکار نے ایک بوٹی بھی نہیں کھائی۔ پکاتے وقت ہی دیکھ لیتی۔'' بیگم دسترخوان ہی سے وحیدن سے سوال جواب کرنے لگتیں۔

''بس کھا چکا میں کھانا، اٹھا لو دسترخوان۔'' سرکار پانی کا گلاس اٹھا کر غٹاغٹ چڑھائے جاتے۔ وحیدن باورچی خانے سے جھانک کر دیکھتی۔ بیگم صاحبہ کا اترا چہرہ، بڑے سرکار کا غصہ اُسے ایسا لگتا جیسے آج کا سارا کیا دھرا خاک میں مل گیا۔ بیگم کتھے، چونے اور پانوں سے بھری پٹاری دبے پاؤں سرکار کے سرہانے رکھ دیتیں اور خود تخت کے پیچھے کھڑی، ہلکے ہلکے پنکھا ہلانے لگتیں۔ منا پاؤں دبا رہا ہوتا اور منیا سر۔ دونوں بہن بھائی دعا کرتے۔ ''کاش ابا جان! جلدی سے سو جائیں۔'' منے کو پتنگ اڑانے کا خیال ستاتا اور منیا کا دل پاؤں پساری گڑیا کی اوڑھنی

میں ڈھنک ٹانکنے کے لیے مچلتا۔ سرکار آنکھیں موندے موندے بھی بار بار کھنکھارتے اور گھر والے سہم ہی تو جاتے۔ یہ بڑے سرکار کا دور تھا۔

آج بڑے سرکار کی حویلی کا نقشہ تبدیل ہو چکا تھا۔ نہ سرکار کے آنے کا خوف رہا نہ جانے کی فکر۔ ریت، روایت اور ماحول سب ہی کچھ تو بدل چکا تھا۔ جوان پوتے گھر میں نیکر پہن کر گھومتے، پوتیاں بال کٹوائے صحن میں ان کی آنکھوں کے سامنے ورزش کرتی ہیں، بہوئیں پیٹ کھلے، ساریاں باندھے خریداری کے لیے باہر جاتی ہیں اور وہ چندھیائی آنکھوں سے انہیں گھورتے رہتے ہیں، ان کا دل چاہتا ہے کہہ دیں کہ یہ کھلی بے حیائی ہے۔'' مگر پھر اپنی عزت کے لیے خاموش ہو رہتے تھے۔ کبھی ہمت کر کے کسی پوتی کو پکارتے ہیں تو بیگم پہلے بول اٹھتی ہیں۔

''اب کوئی نصیحت کرنے نہ بیٹھ جانا۔''

''ناشتا کب ملے گا؟'' وہ دھیمے پڑ جاتے۔

''صبر کرو بچے دفتر، کالج جا رہے ہیں، بہوؤں کو فرصت ہو گی تو دے دیں گی۔'' بیگم ٹھوکا دے دیتی ہیں۔ اب نہ تو بڑے سرکار کے گاؤ تکیے کا پتا ہے نہ اُگال دان کا۔ اپنی پان کی ڈبیا بھی وہ اکثر ڈھونڈتے پھرتے ہیں، بٹوے میں کوئی الائچیاں بھی نہیں ڈالتا تھا۔ وہ دو دن تک ایک ہی لباس پہنے رہتے ہیں، وہ سفید نفاست سے کڑھا ہوا کرتا اور چوڑی دار پاجامہ بھی ماضی کا حصہ ہو گیا تھا، اب تو بس کھدر کا کرتا اور ڈھیلا پاجامہ ہی ان کا لباس تھا۔ سر میں درد ہوتا تو ساری رات کراہتے رہتے مگر کوئی سر تک نہ دباتا تھا۔

ہاں! یہی وقت کا تقاضا تھا۔ گزرا ہوا کل ان کا تھا، بڑے سرکار کا۔ اور گزرتا وقت ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد کا تھا۔ سارا طنطنہ، جاہ و جلال اور تمکنت ہوا گئی تھی کہ اب ''بڑے سرکار'' محض بڑے ہونے کی علامت ہی بن کر رہ گئے تھے اور بس......

☆☆......☆☆

وہ دن مجھے آج بھی یاد ہے۔ اُس وقت میری عمر تقریباً سات سال تھی۔ میں اسکول سے آ کر حسبِ عادت امی کو نخرے دکھا رہا تھا۔ اور وہ بے چاری میری منتیں کر رہی تھیں۔ میں بھی اکلوتا ہونے کا خوب فائدہ اٹھاتا تھا۔ میری نظر حوریہ آپی پر پڑی، اور میں......

حقیقی عشق سے جڑا، ایک خوب صورت ناولٹ

عشق جینے کی ادا ، عشق ہر دل کی صدا
عشق کے کوچے میں فرعون گدا

میں ڈائری پڑھ کر زیرِ لب مسکرا دیا تھا۔

''یہ چپکے چپکے کس بات پر مسکرایا جا رہا ہے؟'' مشعل میرے سامنے چائے رکھتے ہوئے بولی۔

''کچھ نہیں بس یوں ہی ایک بات یاد آ گئی تھی اور خود بخود لبوں پر ہنسی آ گئی!'' میں نے اُسے دیکھتے ہوئے چائے کا کپ اٹھا لیا۔

''اچھا میں آپ سے ضروری بات کرنے آئی تھی۔ وہ حوریہ آپی پرسوں امریکہ سے آ رہی ہیں۔ اس بار ریحان بھائی اور بچے بھی ساتھ ہوں گے۔'' مشعل جوش و خروش سے بات کر رہی تھی۔

مگر میرا سارا دھیان 'حوریہ' لفظ میں اٹک گیا تھا۔ اور میں سوچ کے پروں پر سوار ہو کر ماضی کے اُن دنوں میں لوٹ گیا تھا۔ جب میں ایک جذباتی سا لڑکا تھا اور وقتی لگاؤ کو عشق جان بیٹھا تھا۔

☆......☆......☆

''چھوڑو میرا کھلونا تم گندی ہو!'' میں مسلسل زور لگا رہا تھا۔

''حوریہ آپی! دیکھیں یہ حمزہ مجھے کھیلنے نہیں دے رہا۔'' مشعل نے روتے ہوئے حوریہ آپی کو پکارا تھا۔

''ارے یہ کیا ہو رہا ہے؟ تم دونوں جھگڑ رہے ہو۔'' حوریہ آپی ناراضگی سے بولیں۔ اس سے پہلے کہ حوریہ آپی مزید کچھ کہتی، میں روتا ہوا اُن سے لپٹ گیا تھا۔

''حوریہ آپی! دیکھیں نا یہ گندی مشعل نے مجھے مارا بھی ہے۔'' میں نے سفید جھوٹ بولتے ہوئے مشعل کو دیکھا۔

''آپی یہ جھوٹ بول رہا ہے۔'' مشعل میرے جھوٹ پر چلائی تھی۔

''بُری بات ایسے نہیں کرتے۔ آپ دونوں تو دوست ہیں۔ چلو ہاتھ ملاؤ۔'' حوریہ آپی نے ہماری صلح کرواتے ہوئے کہا۔ میں نے حوریہ آپی کے کہنے پر ہاتھ تو ملا لیا تھا مگر مشعل کو منہ بھی چڑایا تھا۔

آپی نے صلح تو کروادی تھی مگر میری اور مشعل کی بالکل نہیں بنتی تھی اور قصور بھی ہمیشہ میرا ہی ہوتا تھا۔ میں دراصل اُسے آپی کے ساتھ برداشت ہی نہیں کرتا تھا۔ وہ بے چاری میرے ساتھ دوستی کرلی تھی۔ مگر میں اُس سے ہمیشہ لڑتا تھا۔ بعض اوقات میں اپنے بال نوچتا، کپڑے پھاڑتا اور اپنے کھلونے خود ہی توڑ دیتا تھا اور آپی کو رو رو کر شکایت لگاتا کہ مشعل نے مجھے مارا ہے

اور میرے کھلونے توڑے ہیں۔ آپی میری شکایت پر مشعل کو ڈانٹتی وہ بے چاری کچھ نہ سمجھتے ہوئے رونے لگ جاتی تھی۔ اور میں آپی کی گود میں بیٹھا مسکرا رہا ہوتا تھا۔

رات کو ہم دونوں حوریہ آپی کے ساتھ سوتے تھے۔ مشعل بھی حوریہ آپی کے بے حد قریب تھی۔ مشعل مجھ سے ایک سال چھوٹی تھی۔ مگر بے حد صلح جو تھی۔ میری لڑائی پر رو دھو کر پھر سب بھول جاتی تھی۔ مگر میری یہی کوشش ہوتی تھی کہ وہ مشعل آپی کے ساتھ نہ سوئے۔

''آپی آپ صرف مجھے کہانی سنائیں مشعل گندی ہے۔'' میں مشعل کو غصے سے دیکھتا ہوا کہتا۔

''کیوں بھئی کیا بات ہے؟ مشعل تو ہماری چھوٹی سی، پیاری سی بہنا ہے۔'' آپی پیار بھری نظروں سے مشعل کو دیکھتیں۔

''کیوں کہ یہ گندی ہے اور میں اچھا بچہ ہوں۔'' میں کہتے ہوئے حوریہ آپی سے لپٹ جاتا۔

''آپی میں بھی کہانی سنوں گی۔'' مشعل اُمید بھری نظروں سے آپی کو دیکھتی۔

میں آپی اور مشعل کا پیار دیکھتا تو رونے لگ جاتا تھا، اور آپی میری طرف متوجہ ہو جاتی تھیں۔ یہی میرا مقصد ہوتا تھا۔

''آپی! اس گندی مشعل کو کہہ دیں کہ میری چیزوں کو بھی ہاتھ نہ لگائے کیونکہ میں اپنے کھلونے گندے نہیں کرنا چاہتا۔'' میں منہ پھلا کر کہتا۔

''آپی میری بسورتی صورت دیکھ کر مسکرا دیتی تھیں، اور آپی کی مسکراہٹ مجھے شروع سے بہت اچھی لگتی تھی۔ حوریہ آپی تھیں بھی بہت خوبصورت، انتہائی نازک جو بھی رنگ پہنتی، یوں لگتا یہ بنا ہی حوریہ آپی کے لیے ہے۔ سادگی میں بھی اُن کا حسن بے مثال ہوتا تھا۔ آپی کو بناؤ سنگھار کی بالکل عادت نہ تھی۔

بابا کی وفات کے بعد امی مجھے لے کر جمیل ہاؤس آ گئی تھیں۔ جمیل صدیقی یعنی میرے ماموں نے خوشدلی سے آگے بڑھ کر بیوہ بہن کو گلے لگا لیا تھا۔ والدین کی وفات کے بعد جمیل ماموں نے شکیل ماموں اور صالحہ یعنی میری امی کو والدین کا پیار دیا تھا۔ جمیل ماموں بے حد محبت کرنے والے انسان تھے۔

شکیل ماموں شادی کے بعد امریکہ چلے گئے تھے اور عرصہ دراز سے وہیں مقیم تھے۔ اُن کے دونوں بچے عمران اور ذیشان بھی وہیں پیدا ہوئے تھے۔ البتہ ممانی ذرا الگ مزاج کی تھیں۔ وہ ہم میں گھل مل نہ سکی تھیں۔ اُن کے مزاج کو دیکھتے ہوئے شکیل ماموں نے الگ رہنا ہی مناسب سمجھا تھا۔

البتہ آمنہ ممانی بے حد محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ اُن کی دو بیٹیاں 'حوریہ' اور 'مشعل' دونوں ماں کی طرح بے حد خوبصورت تھیں۔ ہماری آمد پر آمنہ ممانی نے خوشی کا اظہار کیا تھا اور مجھے ممانی کے ساتھ ساتھ ماں کی محبت دی تھی۔ امی اکثر کہا کرتی تھیں۔

''آمنہ بھابی! آپ نے اور بھائی جان نے حمزہ کو بگاڑ دیا ہے۔'' اور وہ دونوں مسکرا دیتے تھے۔ میں گھر بھر کی آنکھوں کا تارا بنا ہوا تھا۔ گھر کا واحد بیٹا۔

گھر میں سب بہت اچھے تھے۔ مگر میرا دھیان تو ہر پل حوریہ آپی میں اٹکا رہتا تھا۔ مشعل کو چھوٹی ہونے کے باوجود وہ محبت حاصل نہیں

تھی۔ جس کا میں مالک تھا۔ انہی محبتوں نے مجھے غصیلا بنا دیا تھا۔ کسی بات پر انکار ہوتا تو میں رو رو کر آسمان سر پر اُٹھا لیتا تھا۔ ایسے میں سب میری ناز برداری میں لگ جاتے تھے۔ میں اِن محبتوں کا عادی ہو گیا تھا، اور حوریہ آپی کی توجہ اِدھر اُدھر ہو جائے یہ تو بالکل گوارا نہیں تھا مجھے۔

☆......☆......☆

وہ دن مجھے آج بھی یاد ہے۔ اُس وقت میری عمر تقریباً سات سال تھی۔ میں اسکول سے آ کر حسبِ عادت امی کو نخرے دکھا رہا تھا۔ اور وہ بے چاری میری منتیں کر رہی تھیں۔ میں بھی اکلوتا ہونے کا خوب فائدہ اٹھاتا تھا۔ میری نظر حوریہ آپی پر پڑی، اور میں اُن کی جانب بڑھ گیا تھا۔ آپی عنابی رنگ کے لباس میں بے حد خوبصورت لگ رہی تھیں۔ وہ جھولے پر بیٹھی اپنے پاؤں میں پازیب پہن رہی تھیں۔ پازیب اُن کے دودھیا پیروں میں بے حد بھلی لگ رہی تھی۔ وہ غالباً نہا کر آئی تھیں۔ لمبے دراز بال کھلے ہوئے تھے، مجھے آپی بہت اچھی لگی تھیں۔

''آپی!'' میرے بلانے پر آپی نے میری طرف دیکھا تھا۔ اُن کی نیلگوں آنکھیں بے حد شفاف تھیں۔

''کیا بات ہے میرے ننھے دوست؟'' آپی میری طرف دیکھ کر محبت سے مسکرائی تھیں۔

''میں ننھا نہیں ہوں بڑا ہو گیا ہوں۔'' میں نے ناگواری سے انہیں ٹوکا۔ وہ میری بات پر پہلے حیران ہوئیں اور پھر ہنس پڑیں۔

''سوری! ویری سوری! مسٹر حمزہ! آپ واقعی بہت بڑے ہو گئے ہیں۔'' آپی بھی مسکرا رہی تھیں۔

''آپی کیا سب کی شادی ہوتی ہے؟'' میں نے ایکدم اپنی عمر سے بڑا سوال کر دیا تھا۔ آپی نے لحہ بھر کے لیے مجھے حیرت سے دیکھا اور زیرِ لب مسکرائی تھیں۔

''آج میرا یہ ننھا سا دوست بہت بڑی بڑی باتیں کر رہا ہے۔'' آپی ہنوز مسکرا رہی تھیں۔

''میرا مذاق نہ اڑائیں!'' میں سنجیدگی سے بولا۔

''مگر ابھی تو تم بہت چھوٹے ہو۔'' آپی نے میرے سوال کا جواب دیا۔

پھر کب ہوگی میری شادی؟'' میں بسورا تھا۔

''ارے حمزہ بھئی کیا بات ہے؟ یہ شادی کا شوق کہاں سے آ گیا اچانک؟'' آپی حیران ہوئیں۔ جواباً میں خاموش رہا تھا۔ آسمان پر اُڑتے ہوئے پرندوں پر نظر ڈالی تھی۔

''اچھا ہو جائے گی شادی بھی اب جاؤ اسکول کا ہوم ورک کرو۔'' آپی ہونٹوں پہ ہنسی چھپاتے ہوئے بولیں۔

''آپی آپ مجھ سے شادی کریں گی؟'' میں نے آپی کو غور سے دیکھا۔ آپی نے چند لمحوں کے لیے خاموشی سے مجھے دیکھا تھا اور پھر مسکراتے ہوئے بولیں۔

''ہاں بابا میں تم سے ہی شادی کروں گی۔'' آپی ابھی بھی مسکرا رہی تھیں۔

''پکا وعدہ!'' میں جوش سے بولا۔

''بالکل پکا وعدہ!'' آپی میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولیں۔

☆......☆......☆

جوں جوں میں بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ آپی کے ساتھ میری محبت بڑھتی جا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ شمع ہوں اور میں پروانہ! میری پوری کوشش ہوتی تھی کہ مشعل آپی کے قریب نہ ہونے پائے

اور میری ان کوششوں پر مشعل حیرت سے مجھے دیکھتی تھی۔ میری حرکتیں اُس کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔

سمجھ بھی کیسے آتیں میں خود جانے بنا، سوچے بنا آپی کو چاہے جا رہا تھا۔ آپی کی ہر بات، ہر ادا، اُن کی مسکراہٹ مجھے بھاتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ آپی نے مجھ پر کوئی جادو کر دیا تھا کہ مجھے اُن کے علاوہ کوئی نظر ہی نہیں آتا تھا۔

☆......☆......☆

میں ابھی اسکول سے آیا تھا۔ گھر آتے ہی نظریں حوریہ آپی کو تلاش کر رہی تھیں۔ آپی کسی سے فون پر محوِ گفتگو تھیں۔ مجھ پر ایک نظر ڈال کر وہ پھر باتوں میں مصروف ہوگئی تھیں۔ مجھے آپی کی لاپروائی ایک آنکھ نہ بھائی تھی، اور میں نے چیزیں اُٹھا اُٹھا کر اِدھر اُدھر پھینکنا شروع کر دیں۔ میرے شور شرابے پر امی گھبرا کر آئیں۔

''کیا ہوا؟ کیوں طوفان مچا رہے ہیں؟'' امی نے مجھے ڈانٹا۔

''امی! آپی میرا بالکل خیال نہیں رکھتیں۔ میرے کھلونے گم ہوجاتے ہیں اور آپی فون پر بات کرتی رہتی ہیں۔'' میں بسورا۔

اسی موقع پر حوریہ آپی بھی پہنچ گئی تھیں۔ انہوں نے میری شکایت سُن لی تھی اور مسکراتے ہوئے مجھے گلے لگا لیا تھا۔ میرے لیے یہی بہت تھا۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے مجھے بہت بڑا اعزاز مل گیا ہو۔ میں نے چڑانے والے انداز میں مشعل کو دیکھا تھا اور اُسے منہ چڑایا تھا۔

☆......☆......☆

رفتہ رفتہ میں نے حوریہ آپی کو 'آپی' کہنا چھوڑ دیا اور بہت دھڑلے سے انہیں 'حوریہ' کہنے لگا۔

''یہ تم آپی کا نام کیوں لیتے ہو؟'' مشعل نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔

''تمہیں کیا تکلیف ہے؟'' میں نے چڑ کر جواب دیا۔ مجھے مشعل کی مداخلت بہت بُری لگی تھی۔

''آپی بڑی ہیں۔'' مشعل میرے غصے کے باوجود آرام سے بولی۔

''حمزہ یہ کیا بدتمیزی ہے؟ مشعل صحیح کہہ رہی ہے۔ بہت من مانی کرنے لگے ہو۔'' امی نے ایکدم آکر مجھے ٹوکا تھا۔ میں چپ رہا تھا۔

''بہت بدتمیز ہوتے جا رہے ہو۔'' امی ہنوز غصے سے بولیں۔

''رہنے دیں پھوپو! جیسے میرا دوست خوش، ویسے میں خوش۔'' حوریہ آپی نے میری طرف داری کی۔

''حوریہ تم نے بہت بگاڑ دیا ہے اسے۔'' امی نے مجھے غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔ مگر میں حوریہ آپی کے ساتھ لپٹ گیا تھا۔

☆......☆......☆

آپی کی سالگرہ کا دن تھا۔ اُس دن آپی نے پنک کلر کا بے حد نفیس سوٹ پہنا تھا۔ بہت حسین لگ رہی تھیں۔ مگر میں نے ضد کی کہ وہ سرخ رنگ کا لباس پہنیں۔

امی نے مجھے ڈانٹا مگر مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ میرے ضد کرنے پر آپی سرخ رنگ کا لباس پہن آئی تھیں۔

''اب خوش ہو؟'' آپی مجھے دیکھتے ہوئے مسکرائیں، میں بھی جواباً مسکرایا تھا۔

''حوریہ! بہت بگاڑ دیا ہے تم نے اِسے۔'' امی نے مجھے غصیلی نظروں سے گھورا۔

''کوئی بات نہیں پھوپو! بچہ ہے بڑا ہو کر ٹھیک ہوجائے گا۔'' حوریہ آپی میری حمایت میں

بولیں۔

میں نے آپی کو سالگرہ پر تاج محل کا ماڈل تحفہ میں دیا تھا۔ لمحے بھر کو آپی کی آنکھوں میں حیرت اُبھری۔ مگر وہ مجھے دیکھ کر مسکرا اٹھیں۔

''حوریہ آپ مجھ سے شادی کریں گی؟'' میں نے اُمید بھری نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

''ہاں بالکل!'' حوریہ مسکرائی تھیں۔

''پھر یہاں ڈائری پر سائن کردیں، تاکہ میں آپ کو آپ کا وعدہ یاد دلا سکوں۔'' میں نے جوش سے کہتے ہوئے ڈائری اُن کے سامنے کی۔

حوریہ آپی نے سائن کردیے تھے۔ اور مجھے خوشی کے مارے رات بھر نیند نہیں آئی تھی۔

☆☆☆

اب سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے اپنی حالت پر۔ نجانے ہم نے عشق، جنون، محبت اور پاگل پن کو گڈمڈ کیوں کردیا ہے؟ عشق کے عین کو جانے بنا ہم دعویٰ کر ڈالتے ہیں کہ ہمیں فلاں سے بہت طوفانی قسم کا عشق ہو چلا ہے۔ حالانکہ میرے نزدیک عشق بہت پاکیزہ جذبہ ہے، جو خالص ہو تو عشق حقیقی تک چلا جاتا ہے۔ اسی لیے شاید عشق ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتا۔

مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں حوریہ آپی سے محبت کرنے لگا ہوں۔ بچپن کی شفقت کو میں نے سوچے سمجھے بنا محبت کا نام دے دیا تھا۔

گھنٹوں اپنے لیپ ٹاپ میں موجود حوریہ آپی کی تصویر کو دیکھتا رہتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ دنیا میں صرف یہی ایک ضروری کام ہے، کہ میں کبھی حوریہ آپی کو دیکھتا رہوں اور کبھی اُن کی تصویر باقی ہر بات میرے لیے غیر اہم تھی۔ چودہ سال کی عمر میں اپنے آپ کو مکمل ہیرو سمجھ رہا تھا۔

وقت کا کام گزرتا ہے اور وہ چپ چاپ گزر جاتا ہے۔ میرے جذبوں میں بھی شدت آتی جارہی تھی۔ اک دیوانگی تھی جو بڑھتی جارہی تھی۔ میری دنیا 'حوریہ' پر شروع ہوتی تھی اور 'حوریہ' پر ہی ختم ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ کہیں بھی کچھ نہیں تھا۔

''یہ تم میرے کمرے میں کیا کر رہی ہو؟'' میں کمرے میں داخل ہوا تھا کہ سامنے مشعل کو کھڑے پایا۔

''کیوں میں تمہارے کمرے میں نہیں آسکتی؟'' مشعل نے مجھے سنجیدگی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ نجانے کیا تھا اس کی نگاہوں میں کہ میں پل بھر کے لیے گڑبڑا گیا تھا۔

''صفائی کرنے آئی تھی کہ!'' مشعل نے بات ادھوری چھوڑ کر مجھے گھورا۔

''یہ تمہیں کیا تکلیف ہوئی ہے میرے کمرے کی صفائی کی اور تمہیں کیا ماسی کی پوسٹ پر رکھ لیا گیا ہے؟'' میں اب اُس کا مذاق اُڑا رہا تھا۔ اصل میں مجھے مشعل کی موجودگی ناگوار گزر رہی تھی۔

''یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ کیا چھپا رہی ہو؟'' مشعل کو مسلسل خاموش دیکھ کر یکدم مجھے خیال آیا تھا۔

میرے کچھ کہنے سے قبل ہی مشعل نے میری نظروں کے آگے حوریہ آپی کی تصویر کردی تھی۔

چند لمحوں کے لیے میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا مگر اگلے ہی لمحے میں نے غصے سے وہ تصویر چھین لی تھی۔

''یہ تم حوریہ آپی کی تصویر تکیے کے نیچے کیوں رکھتے ہو؟'' مشعل نے میری خاموشی پر مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''میری مرضی۔ تمہیں کیا ہے؟ میں جو دل

چاہے کروں۔‘‘ میں نے غصے سے کہا۔

’’میری تصویر تو نہیں رکھی تم نے؟‘‘ مشعل نے مجھے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے شکوہ کیا تھا۔

’’مجھے رات کو سونا ہوتا ہے، ڈرنا نہیں ہوتا کہ تمہاری تصویر اپنے پاس رکھوں۔‘‘ میں نے جواب دیا۔

ہماری بحث نہ جانے کب تک جاری رہتی کہ حوریہ آپی کی آمد ہوئی تھی۔

’’تم دونوں پھر جھگڑا کر رہے ہو؟‘‘ آپی نے ہم دونوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

مشعل نے فوراً تصویر والی بات آپی کے گوش گزار کر دی تھی۔ بات سن کر آپی نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔

’’حوریہ! دراصل وہ کسی بزرگ نے کہا ہے کہ......‘‘

’’خوبصورت پریوں کو لیپ ٹاپ پر بھی اسکرین پر لگا کر رکھو۔ یہ بھی کہا ہوگا نا۔‘‘ مشعل نے مجھے گھورا۔

نہیں کہا تھا کہ خوبصورت پریوں کی تصویر رات کو اپنے پاس رکھو تو بہت اچھی نیند آتی ہے۔‘‘ میں نے آپی کی سوالیہ نظروں کے جواب میں فوراً وضاحت کی تھی۔

میری بات پر آپی نے ہنستے ہوئے میرے سر پر چپت لگائی تھی اور مسکراتے ہوئے چلی گئیں تھیں، مگر مشعل کی نگاہوں میں شکوہ تھا۔

اُس دن کے بعد مجھے احساس ہوا کہ مشعل میری ذات میں دلچسپی لیتی ہے، اُسے میری فکر ہے، ورنہ وہ اتنی گہرائی سے اس صورت حال کو نہ جانتی۔ مجھے مشعل سے مزید چڑ ہونے لگی تھی۔

☆......☆......☆

میں ابھی کالج سے گھر آیا تھا۔ آج خلافِ معمول حوریہ آپی نظر نہیں آ رہی تھیں۔

’’کیسے ڈھونڈ رہے ہو؟‘‘ مشعل نجانے کب سے مجھے تاڑ رہی تھی۔

’’حوریہ آپی کہاں ہیں؟‘‘ میں نے مشعل کے انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے مطلب کی بات کی۔

’’وہ اپنے کمرے میں ہیں۔ دراصل کچھ خاص مہمان آئے ہیں۔‘‘ مشعل نے جواب دیا۔

’’کون سے مہمان؟‘‘ میں نے حیرت سے پوچھا۔

’’رشتے کے لیے آئے ہیں؟‘‘ مشعل فاتحانہ انداز سے دیکھ کر مسکرائی۔

’’شکر ہے تم سے جان چھوٹ جائے گی۔‘‘ میں ایکدم ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

’’پوری بات تو سُن لو۔ میرا نہیں آپی کا رشتہ لے کر آئی ہیں۔ راحت خالہ اور ریحان بھائی بھی ساتھ آئے ہیں۔‘‘ مشعل مسکراتے ہوئے بولی۔

میں پل بھر کے لیے چپ ہو گیا تھا۔ مشعل مجھے ابھی تک گہری کھوجتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں غصے سے پاؤں پٹختا ہوا۔ اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ امی دو بار دروازے پر آئیں مگر میں نے دروازہ نہیں کھولا۔ سارا دھیان حوریہ کی طرف لگا تھا کہ کب وہ آئیں گی۔ مگر ابھی تک اُن کا کچھ پتا نہ تھا۔ انتظار کرتے کرتے میں نے کمرے میں چیزیں پھینکنا شروع کر دیں۔ شور پر گھر والے اکٹھے ہو گئے تھے۔

’’ارے! یہ کیا پاگل پن ہے؟ حمزہ کیا بات ہے آخر؟ دروازہ کھولو!‘‘ امی کی پریشان آواز سنائی دی۔

''کیا تماشا لگا رکھا ہے، کسی سے لڑ کر آئے ہو؟ کچھ بولتے کیوں نہیں؟'' یہ ماموں کی آواز تھی۔

''شاید میرے جانے کی خبر سے گھبرا گیا ہے۔ مجھ سے پیار بھی تو بہت کرتا ہے۔ حمزہ دروازہ کھولو۔'' یہ حوریہ تھیں میرے ہاتھ پل بھر کے لیے تھم گئے تھے۔

''کوئی اُس سے بھی پوچھ لے کہ کیا بات ہے؟ آپ سب اپنے اندازے نہ لگائیں۔ کہیں کوئی اور ڈرامہ دیکھنے کو نہ مل جائے۔'' مشعل کی ہنستی ہوئی آواز اُبھری۔

''پلیز! آپ سب چلے جائیں، میں اسے سمجھاتی ہوں۔'' حوریہ سب سے مخاطب ہوئیں۔ حوریہ کے بے حد اصرار پر میں نے دروازہ کھول دیا تھا۔

''حمزہ! یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ سرخ آنکھیں اور بال بکھرے ہوئے ہیں؟ کیا بات ہے؟ سب تمہاری وجہ سے کتنا پریشان ہو رہے ہیں۔''

حوریہ میرے سر پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔ مجھے پانی کا گلاس دیا جو میں نے اُٹھا کر پھینک دیا۔ میری حرکت پر حوریہ گھبرا سی گئیں۔

''حمزہ کیا بات ہے؟ تم وجہ نہیں بتاؤ گے تو مجھے کیسے پتا چلے گا؟'' حوریہ پریشانی سے بولیں۔

''آج آپ کی معصومیت پر قربان ہونے کو دل چاہ رہا ہے۔'' میں غصے سے اُن کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولا۔ میری بات پر حوریہ کی آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔

''حوریہ آپ وعدہ خلاف ہیں۔ ریحان بھائی کی دولت نے آپ کو خود غرض بنا دیا ہے۔ آپ نے جس طرح نظریں بدلی ہیں میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ آخر آپ نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ آپ اتنی سنگدل اور خود غرض کیسے ہوگئیں؟ میں آپ سے محبت کرتا رہا۔ اگر آپ نے شادی کسی اور سے کرنا تھی۔ تو مجھ سے کیوں وعدہ کیا تھا شادی کا؟'' میں غم و غصے سے بولتا چلا گیا۔

''شادی!'' حوریہ کی مدہم سرگوشی سنائی دی تھی۔ میرے دیکھنے پر اُن کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے تھے۔ اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپاتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گئیں۔ میں دروازے میں کھڑا انہیں بے وفا اور نجانے کیا کچھ کہہ رہا تھا۔ میرے اس طرح بولنے پر ایک دم ماموں آگئے تھے اور نہایت غصے میں میرے منہ پر تھپڑ مار دیا۔

''تمیز نہیں...... بڑی بہن سے اس طرح بات کرتے ہیں؟'' ماموں مجھے غصے سے گھورتے ہوئے بولے میں خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کل تک جن کی آنکھوں کا تارا تھا۔ آج اُن کی نفرت کا شکار ہو رہا تھا۔

☆......☆......☆

دو دن تک آپی میرے سامنے نہیں آئیں۔ آپی کی طرف سے مکمل خاموشی پر مجھے غصہ آ رہا تھا۔ میرا کہیں آنے جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ نہ کھانے کی پروا تھی۔ امی کئی بار کھانا لے کر آئی تھیں۔ مگر میں نے انکار کر دیا تھا اور وہ مایوس ہو کر چلی جاتیں۔

ایک دن شام کو آپی کمرے میں آئیں۔ میں بیڈ پر آنکھیں بند کر کے لیٹا ہوا تھا۔ آہٹ پر دیکھا اور غصے سے منہ پھیر لیا، وہ میرے پاس آ کر بیٹھ

گئیں۔ چند لمحوں تک مجھے خاموشی سے دیکھتی رہیں۔

''حمزہ! میں نے بہت سوچا دو دن تک اپنی غلطی تلاش کرتی رہی کہ میری کس بات اور حرکت نے تمہیں اس قدر غلط فہمی کا شکار کر دیا؟ مجھے بالکل اندازہ ہی نہیں ہوا کہ میری گود میں بیٹھنے والا حمزہ کب بڑا ہو گیا؟ اتنے غور وخوض کے باوجود مجھے اپنی ایسی کوئی غلطی نظر نہیں آئی۔'' آپی رندھی ہوئی آواز میں بولتی جا رہی تھیں۔

''بند کریں یہ باتیں اگر آپ کو کچھ یاد نہیں تو میں آپ کو یاد کرواتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں انہیں بازو سے پکڑ کر الماری کے پاس لے گیا اور اس میں سے ڈائری نکال کر اُن کو اُن کے 'سائن' دکھائے۔ حوریہ حیران پریشان ہو کر قریب ہی پڑی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

''تاج محل، کے تحفے کو دیکھ کر بھی آپ میرے جذبات سے بے خبر رہیں۔ یہ معصومیت تھی یا بے نیازی؟'' میں انہیں دیکھ کر بے رحمی سے بولا۔

''حمزہ! میں نے تو بچہ سمجھ کر تمہیں بہلایا تھا۔'' حوریہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔

''اچھا ٹھیک ہے آپ مجھے بچہ سمجھتی تھیں مگر آپ ہی بتائیں میں آپ کے وعدے کو کیا سمجھتا؟ کیا میں اتنی عقل و شعور رکھتا تھا کہ آپ کے وعدے کو صرف آپ کا ایک بہلاوا سمجھتا؟'' میں جوش میں انہیں دیکھتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک کہا تم نے۔ بچے بھی دل و دماغ رکھتے ہیں۔ وہ بھی اپنی مرضی سے سوچتے ہیں۔ بچے معصوم ہوتے ہیں۔ مگر خدارا چندا! یہ الزام، کہ میں بھی تمہارے بارے میں ایسا سوچتی تھی اور اور اب تمہیں دھوکہ دے کر کہیں اور شادی کر رہی ہوں۔ پلیز حمزہ مجھے اتنا غلط نہ سمجھو۔ میری محبت اور شفقت کی ایسی سزا تو نہ دو۔ خود سوچو جب تم یہ بات اس طرح سب گھر والوں کے سامنے کہو گے تو کیا میں کسی سے نظریں ملا پاؤں گی؟'' حوریہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

میں کچھ دیر تک انہیں دیکھتا رہا تھا۔ نجانے میں اتنا سنگدل کیوں ہو گیا تھا کہ مجھے اُن کے رونے پر ذرا بھی رحم نہیں آیا تھا۔ حالانکہ میں محبت کا دعویدار بن رہا تھا۔

''مت روئیں میرے سامنے میں جس کرب سے گزر رہا ہوں۔ آپ اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتیں۔ آپ یہاں سے چلی جائیں مجھے آپ سے مزید کوئی بات نہیں کرنی۔''

☆......☆......☆

ساری رات جاگنے کی وجہ سے صبح سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ کالج جانے کو بالکل دل نہ چاہ رہا تھا۔ ہر چیز سے دل اُچاٹ ہو گیا تھا۔ اتنی دیر میں دروازے پر دستک ہوئی۔ مگر میں نے اَن سنی کر دی۔

''حمزہ! دروازہ کھولو ابو بلا رہے ہیں۔'' مشعل کی آواز سنائی دی۔ جواباً میں خاموشی سے لیٹا رہا تھا۔

''میں جانتی ہوں کہ تم جاگ بھی رہے ہو اور سُن بھی رہے ہو۔'' مشعل بولی۔

''جب سب کچھ پتا ہے تو پھر چلی کیوں نہیں جاتی۔ میں آ جاؤں گا جب میری مرضی ہو گی۔'' میں غصے سے چلایا۔

کچھ دیر بعد میں کمرے سے باہر آ گیا، ماموں کے پاس پہنچا، مجھے دیکھتے ہی ماموں نے کہا۔

''ہاں بھئی یہ کیا چل رہا ہے؟ کالج بھی نہیں گئے؟ طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟'' سر جھکا کر میں خاموش کھڑا رہا تھا۔

''کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟'' ماموں میرا بازو جھجھوڑ کر بولے۔ اسی دوران میری نظر سامنے کھڑی حوریہ پر پڑی تھی۔ اُن کی نظروں میں غم اور تاسف صاف جھلک رہا تھا۔ مگر میں غصے میں بولا۔

''میری طرف سے کوئی مسئلہ نہیں مسئلہ اپنی صاحبزادی سے پوچھیں۔'' میں نے ایک چبھتی نگاہ حوریہ پر ڈالتے ہوئے کہا۔ میری بدتمیزی پر ماموں مجھے مارنے کے لیے آگے بڑھے مگر امی نے انہیں روک دیا۔

''بھائی جان! میری خاطر اسے معاف کردیں۔'' امی ماموں کے آگے منت سماجت کررہی تھیں۔

''اُس کے اگر یہی طور طریقے رہے تو اس کی، اس گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے۔'' ماموں غصے سے دھاڑے۔

یہ سنتے ہی میں کھولتے دماغ کے ساتھ گھر سے باہر نکل گیا تھا۔ امی آوازیں دیتی رہ گئیں، مگر مجھے کوئی پروا نہ تھی۔ حوریہ کی کال بار بار آتی رہی مگر میں نے غصے سے سیل فون آف کردیا۔

☆......☆......☆

رات کو دیر سے گھر آیا تھا۔ خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گیا۔ کمرے میں امی موجود تھیں۔ جو ابھی تک میرے انتظار میں جاگ رہی تھیں۔

''حمزہ میرے بچے! میرے لعل! یہ تُو نے کیا حالت بنا رکھی ہے؟ کیوں مجھے پریشان کررہا ہے؟ آخر بات کیا ہے۔'' ماں کے لاڈ پر میں اُن کی گود میں سر رکھ کر رو دیا۔

اسی دوران دروازے پر دستک ہوئی سامنے دیکھا تو حوریہ کھانے کی ٹرے لے کر آئیں۔

''حمزہ! چلو جلدی سے اٹھو اور کھانا کھالو۔ دیکھو میں تمہاری پسند کا کھانا لائی ہوں۔'' حوریہ کھانا رکھتے ہوئے لاڈ سے بولیں۔

''امی اِن سے کہہ دیں کہ یہاں سے چلی جائیں ورنہ میں چلا جاؤں گا۔'' میں ہنوز غصے میں تھا۔

''حمزہ! تھوڑا سا تو کھالو۔'' حوریہ میری بدتمیزی نظر انداز کرتے ہوئے بولیں۔ اُن کے اصرار پر میں اُٹھا اور کھانے کے برتن زمین پر پھینک دیے اور کمرے سے نکل گیا۔

کافی دیر بعد میں دوبارہ اپنے کمرے میں آیا تو امی ابھی تک کمرے میں موجود تھیں۔

''آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں؟'' میں انہیں دیکھتے ہوئے بولا۔ جواباً وہ مجھے مسلسل دیکھتی جارہی تھیں۔

''کیا ہوا امی؟ ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں؟'' میں اُن کے یوں دیکھنے پر حیرت سے بولا۔

''میں دیکھ رہی ہوں کہ میرا حمزہ، کب اتنا بڑا ہوگیا کہ اتنے بڑے بڑے فیصلے بھی کرنے لگا اور مجھے خبر بھی نہیں ہوئی۔'' امی دُکھ سے بولیں۔

''کیا ہوا؟'' میں حیرانگی سے بولا۔

''یہ تم نے حوریہ سے کس قسم کی باتیں کی ہیں؟'' امی اب حیرت سے پوچھ رہی تھیں۔

''اچھا! تو وہ آپ کو سب کچھ بتا چکی ہیں؟'' میں بات سمجھتے ہوئے بولا۔

''ہاں بتا چکی ہے کہ تم کس قدر بدتمیز اور گستاخ ہوچکے ہو۔'' امی غصے سے بولیں۔

''امی کیا محبت کرنا گناہ ہے؟'' میں نے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''محبت کرنا گناہ نہیں ہے، مگر دوسروں کے جذبات کا احترام نہ کرنا تو گناہ ہے۔'' امی ابھی بھی غصے میں تھیں۔

''انہوں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا مگر اپنی بے وفائی کا قصہ تو نہیں سنایا ہوگا کہ وعدہ مجھ سے کیا اور شادی کسی اور سے کر رہی ہیں۔'' میں انجام سے بے نیاز ہوتے ہوئے بولا۔

''حمزہ! باز آجاؤ بچپن کے پیار اور شفقت کو محبت کا نام دے رہے ہو؟'' امی غصے سے چلائیں۔

''آپ جو بھی کہیں میں اپنے ارادہ سے باز نہیں آؤں گا۔ وہ مجھے بچہ نہ سمجھیں کہ آسانی سے چھوڑ دیں۔ میرے علاوہ کسی سے شادی کا سوچیں بھی نہ۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ آپ خود ہی ماموں سے بات کرلیں ورنہ میں اب رُکنے والا نہیں۔'' میں ہٹ دھرمی سے کہتا ہوا بیڈ پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ امی میری طرف مایوسی سے دیکھتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

کمرے میں ایک دم گھٹن بڑھ گئی تھی۔ کوئی میری بات سمجھنے کو تیار ہی نہ تھا۔ کسی کو میرے جذبات کی فکر ہی نہیں تھی۔ میں غمزدہ ہو رہا تھا۔

میرا مزاج طنزیہ اور دل جلانے والا ہوتا جا رہا تھا۔ میری اکثر باتوں پر حوریہ کی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔ اُس دن حوریہ ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ میں انہیں سنانے کے لیے موبائل لیے ٹی وی لاؤنج میں آگیا۔

''یار بس کیا بتاؤں! آج کل کی لڑکیاں بڑی لالچی اور مطلبی ہوتی ہیں۔ جہاں دولت کی چمک دیکھی وہیں محبت بدل لی۔ پھر ہم مردوں پر الزام بھی رکھتی ہیں کہ بے وفا ہیں، ہرجائی ہیں۔'' میں مخاطب اپنے دوست سے تھا مگر سنا حوریہ کو رہا تھا۔ میری باتوں پر اُن کے چہرے پر درد اُمڈ آیا انہوں نے پل بھر کے لیے میری طرف دیکھا اور ٹی وی آف کر کے جانے لگیں۔

ہم چھین لیں گے تم سے یہ شانِ بے نیازی
تم مانگتے پھرو گے اپنا غرور ہم سے

میں دل جلانے والے انداز میں انہیں دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

☆......☆......☆

حوریہ اور مشعل کچن میں تھیں۔ میں محض حوریہ کا دل جلانے کے لیے بے مقصد گیا اور بلا ضرورت چیزوں کو پٹخ دیا۔

''حمزہ کیا مسئلہ ہے؟ اگر کوئی کام ہے یا کوئی چیز چاہیے تو بتادو۔ خوامخواہ ہمارا دماغ نہ خراب کرو۔'' مشعل میرے شور کرنے پر غصے سے بولی۔

''بتا تو دیا ہے کہ کیا چاہیے؟'' میں حوریہ پر گہری نظر ڈالتا ہوا کچن سے نکل گیا۔ میں ابھی باہر آیا ہی تھا کہ امی کو اپنا منتظر پایا۔

''حمزہ! کیا ہوگیا ہے تمہیں؟ کیوں ہر وقت مجھے پریشان کرتے رہتے ہو۔'' امی ناراضگی سے بولیں۔

''کیا ہوا ہے امی!'' میں اُن کی ناراضگی پر بولا۔

''کمرے کا حال دیکھا ہے کس قدر گندا ہے۔ حمزہ اب تم بچے تو نہیں رہے کہ اپنے کمرے کو بھی صاف نہ رکھ سکو ایک طوفان مچا ہوتا ہے۔'' امی مزید بولیں۔

حوریہ امی کو چائے دینے آئیں تو اُن کو سنانے کے لیے میں فوراً بولا۔

''امی اب کسی کو اپنے بناؤ سنگھار سے فرصت نہیں ملتی۔ اب ہماری کسی کو کیا فکر؟'' حوریہ

میرے طنز پر شاکی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

''حمزہ! تم باز آجاؤ تم حد سے بڑھتے جارہے ہو۔ آپی کو ہر دم کچھ نہ کچھ کہتے ہو۔ وہ تمہیں بچہ سمجھ کر نظر انداز کر رہی ہیں تو تم بالکل بدتمیز ہو گئے ہو۔ ابو کو بتادوں گی۔'' مشعل نجانے کہاں سے ٹپک پڑی تھی۔

''تو ابھی تم لوگوں کو حد سے بڑھنے کا مطلب نہیں پتا۔ چلو کوئی بات نہیں، آہستہ آہستہ یہ بھی بتادوں گا۔'' میں زہریلی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔

''بہت ڈھیٹ ہو۔'' مشعل میری بات پر سرتاپا سلگ کر بولی۔ میری باتوں پر حوریہ اپنے آنسو صاف کرتی ہوئی چلی گئیں اُن کے جانے پر امی اور مشعل دونوں نے مجھے ملامتی انداز میں دیکھا تھا۔

☆......☆......☆

حوریہ کی دوست کی شادی تھی۔ وہ اور مشعل جارہی تھیں۔ انہیں دودن وہیں رُکنا تھا۔

''یہ آپ شادی میں جارہی ہیں یا مجھ سے فرار چاہ رہی ہیں؟'' میں حوریہ کے کمرے میں آیا تو حوریہ اپنے کپڑے بیگ میں رکھ رہی تھیں۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے حمزہ! تم کیوں ہر بات کو منفی انداز میں لے رہے ہو؟'' حوریہ رسانیت سے بولیں۔

''پھر آپ ٹھہریں گی نہیں، شام کو واپس آجائیں۔'' میں ضدی انداز میں بولا۔

''تمہیں ہر معاملے میں ضد کرنے کی عادت پڑگئی ہے۔ وہ میری بچپن کی دوست ہے۔ اور صرف دودن کی تو بات ہے۔ پھر تم اب بچے نہیں رہے کہ اکیلے نہ رہ سکو۔'' حوریہ میرے انداز پر کچھ غصے سے بولیں۔

''اب کیوں منہ سُوجا ہوا ہے؟'' اچانک ہی مشعل کی آمد ہوئی تھی۔

''آپی آپ کے لاڈ پیار نے اس کی عادتیں بگاڑ دی ہیں۔'' مشعل میری طرف دیکھ کر طنزیہ انداز میں بولی۔

''میں کہہ رہا تھا کہ شادی میں مشعل کو بھیج دیں تاکہ دودن گھر میں سکون رہے۔'' میں جل کر بولا۔

''لو دوست تو وہ آپی کی ہیں، وہاں میں اکیلی کیا کروں گی۔'' مشعل میری بات سن کر حیرت سے بولی۔

''میں بھی تو اکیلا ہو جاؤں گا۔'' میرے لہجے میں اُداسی آگئی۔

''بڑے دودھ پیتے بچے ہونا۔ جو اکیلے نہیں رہ سکتے۔ آپی آپ پھوپو کو اس کے فیڈر کا ٹائم اور سیریلیک کی ترکیب بتادیں، تاکہ منے میاں کو کوئی مسئلہ نہ ہو۔'' مشعل میرا مذاق اُڑاتے ہوئی بولی۔ اُس کی بات پر حوریہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ مجھے احساس ہوا تھا کہ حوریہ بہت دنوں بعد کھل کر ہنسی ہیں۔ ورنہ اُن کا چہرہ مرجھا کے رہ گیا تھا۔ میرا دل اچانک ہی شرمندگی محسوس کرنے لگا تھا۔

''حمزہ یہ چابی لو اور دونوں کو چھوڑ آؤ، اور ہاں دودن بعد واپس بھی لے آنا اور گاڑی احتیاط سے چلانا۔'' ماموں یہ کہہ کر باہر چلے گئے تھے۔

گاڑی میں بیٹھ کر میں مسلسل ہارن پر ہارن دیے جارہا تھا۔ جیسے سارا غصہ ہارن پر نکال رہا تھا۔ حوریہ مجھے غصے سے دیکھتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ مشعل بھاگتی ہوئی آئی تھی۔

''تم کہاں آرہی ہو؟ تم رکشے میں آجانا۔'' میں مشعل کو تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ میری بات پر حوریہ کے چہرے پر ہنسی آگئی تھی۔

گاڑی کی اسپیڈ میں نے تیز رکھی تھی۔ حوریہ نے دو تین بار ٹوکا بھی مگر میں نے سنی اَن سنی کردی۔

''حمزہ گاڑی آہستہ چلاؤ۔'' مشعل غصے سے بولی۔ میں نے میوزک آن کردیا تاکہ مشعل کی آواز ہی نہ آئے۔

مشعل رودینے والے انداز میں بولی کہ'' میں ابھی ابو کو فون کرتی ہوں۔''

جیسے ہی اُس نے فون پکڑا، میں نے اسپیڈ اور تیز کردی کہ موبائل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ جس پر میں نے دل کھول کر فاتحانہ قہقہہ لگایا۔ حوریہ کی دوست کا گھر آ گیا تھا۔

مشعل مجھے غصے سے دیکھتے ہوئے پہلے اُتری تھی۔ حوریہ جیسے ہی اُترنے لگیں تو میں فوراً بولا۔

''ابھی بھی سوچ لیں، میں اپنے اِرادے سے ہرگز باز نہیں آؤں گا۔'' میری بات پر حوریہ غصے سے گاڑی سے نکل گئیں۔

☆......☆......☆

دو دن کے بعد حوریہ نے مجھے فون کیا مگر میں نے ریسیو نہیں کیا بلکہ موبائل آف کردیا۔

مشعل نے فون کیا تو میں نے صاف کہہ دیا کہ میرے پاس فالتو ٹائم نہیں ہے آنے کا۔'' میں حوریہ سے دو دن کا انتقام لے رہا تھا۔ جانتا تھا، حوریہ ماموں کو کبھی شکایت نہیں لگائیں گی اور نہ ہی مشعل کو کہنے دیں گی۔ اس لیے میں مطمئن تھا۔

''یہ تم دونوں رکشے میں کیوں آئی ہو؟ حمزہ نہیں گیا؟'' ماموں نے دونوں سے پوچھا۔

مشعل میری شکایت لگانے لگی تھی کہ حوریہ نے فوراً منع کردیا اور گاڑی کی خرابی کا بہانہ بنایا تھا۔

حوریہ آپی نے ہمیشہ مجھ سے محبت کی، بے لوث اور پُر شفقت اب مجھے بہت افسوس ہوتا ہے کہ اُن کے انمول جذبوں کی بار ہا توہین کرتا رہا ہوں۔

اُن کی محبت اس ماں کی طرح تھی۔ جو اپنی اولاد سے بنا کسی غرض کے کرتی ہے اور کبھی صلہ نہیں مانگتی۔

☆......☆......☆

شام کو حوریہ میرے کمرے میں آئیں۔

''حمزہ آخر اس طرح کب تک چلے گا۔ تم کب تک یونہی تکلیف میں رہو گے اور مجھ سمیت سب کو اذیت دیتے رہو گے؟'' حوریہ میرے قریب بیٹھی فکرمندی سے بولیں۔

''تو پھر آپ ہی بتائیں میں کیا کروں۔'' میں بے بسی سے بولا۔

''چھوڑ دو اپنی ضد حمزہ۔'' حوریہ اب بھی دلگرفتہ تھیں۔

''آپ چھوڑ دیں ضد۔'' میں بھی ترکی بہ ترکی بولا۔

''حمزہ! جو تم چاہتے ہو وہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ میں مرنا قبول کرلوں گی مگر جو تم سوچ رہے ہو وہ میرے لیے انتہائی اذیت ناک ہے۔'' حوریہ بے بسی سے بولیں۔

''تو پھر آپ سمجھ جائیں میری بات!'' میں ضدی انداز میں بولا۔

''ناممکن ایسا کبھی نہیں ہوگا۔'' حوریہ آنسو صاف کرتے ہوئے اٹل انداز میں بولیں۔

''تو پھر جائیں اور آئندہ مجھ سے اس موضوع پر تب بات کریں جب آپ میری سچی محبت کی قائل ہوجائیں۔'' میں مضبوط لہجے میں کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ میری ذہنی کشمکش بڑھتی جا رہی تھی۔ امی، حوریہ، مشعل سب جانتے ہوئے بھی

انجان بن رہے تھے۔ البتہ ماموں اور ممانی میری چاہت سے بے خبر تھے۔ کبھی دل چاہتا تھا کہ گھر چھوڑ دوں اور اِن سب کو ساری زندگی کا غم دے جاؤں مگر......

اور یہی ذہنی انتشار کالج میں ایک لڑائی کا ذریعہ بن گیا۔ ایک لڑکے سے لڑائی ہوگئی، پرنسپل نے ماموں کو فون کر دیا۔ ماموں جب کالج آئے تو میں پرنسپل کے آفس میں زخمی ہوا بیٹھا تھا۔

''جمیل صاحب! حمزہ ایک قابل طالب علم ہے مگر چند دن سے نہ تو تعلیم کی طرف توجہ دے رہا ہے اور ہر کسی سے اِس کا رویہ بھی درست نہیں۔'' پرنسپل تشویش بھرے انداز میں ماموں سے مخاطب تھے۔ ماموں نے ملامت کی نگاہ مجھ پر ڈالی۔

''اس دفعہ میں اس کو موقع دے رہا ہوں، آئندہ ایسی کسی حرکت پر میں اسے کالج سے نکال دوں گا۔'' ماموں راستے میں ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ گھر میں جب داخل ہوئے تو سب پریشان ہوگئے۔ امی پوچھتی رہیں کیا ہوا ہے؟

''اپنے لاڈلے سے پوچھ لو! یہ کیا کرنا چاہتا ہے؟'' ماموں ایک قہر آلود نگاہ ڈال کر کمرے میں چلے گئے۔

''حوریہ بیٹا تم ہی پوچھو اسے کیا ہو گیا ہے؟ آخر کیا مسئلہ ہے؟ بتاتا کیوں نہیں ہے؟ تمہارے بہت قریب رہا ہے کیا اب تمہیں بھی کچھ نہیں بتاتا؟'' ممانی جان فکرمندی سے بولیں۔

میں کمرے میں لیٹا ہوا تھا امی پاس بیٹھی تھیں کہ اتنی دیر میں دروازہ کھلا مجھے پورا یقین تھا کہ یہ حوریہ ہیں اسی لیے جھٹ آنکھیں بند کر لیں۔

''آؤ حوریہ! بیٹھو بیٹا اور سمجھاؤ اِس نالائق کو کہ باز آجائے اپنی حرکتوں سے شرمندہ کروا دیا ہے اس نے بھائی اور بھابی کے سامنے مجھے تم بیٹھو، میں اس کے لیے گرم دودھ لاتی ہوں۔''

امی یہ کہہ کر کمرے سے چلی گئیں۔

''حمزہ!'' آپی میرے قریب بیٹھ گئیں۔ میں ابھی بھی آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔

''میں جانتی ہوں حمزہ! تم جاگ رہے ہو۔'' حوریہ میرے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔ آج حوریہ میرے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔ آج حوریہ میرے قریب بیٹھی تھیں۔ محبت سے ماتھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ اسی طرح جیسے وہ بچپن میں لاڈ کرتی تھیں۔ میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔

''حمزہ! یہ تم نے کس عذاب میں مجھے اور خود کو ڈال دیا ہے؟ میں ابو کو کیا بتاؤں کہ میں تمہاری تکلیف سے واقف ہوں مگر میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔'' حوریہ بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھیں۔

میرے دل کو خوش فہمی سی ہو چلی تھی کہ حوریہ میری محبت کا اعتراف کر رہی ہیں اور آہستہ آہستہ میری ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیں گی۔

☆......☆......☆

وہ بے حد حسین شام تھی۔ سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے، بارش کا سلسلہ کافی دیر سے جاری تھا، دوائیوں کے زیرِ اثر نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ خواب میں دیکھا کہ سخت اندھیرے میں ناہموار راستے پر چلتا جا رہا ہوں۔ کہیں راستہ نہ مل رہا تھا۔ اچانک دور سے روشنی دکھائی دی۔ میں رُک گیا۔ روشنی بڑھتے بڑھتے میرے چاروں طرف پھیل گئی، میں ایک بلند جگہ پر کھڑا تھا۔

اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ میں ابھی تک خواب کے بارے میں سوچ

رہا تھا کہ اذان کی آواز سنائی دی زندگی میں پہلی بار اتنے خضوع نماز پڑھی اور دیر تک دعا مانگتا رہا۔
''یا اللہ! تُو جانتا ہے میں نے حوریہ سے بچپن سے محبت کی ہے وہ کسی اور کی ہو جاتیں، میں تصور بھی نہیں کرسکتا میری مدد فرما کہ میں اپنی محبت پالوں اور اس راستے میں تمام آنے والی رکاوٹیں دور فرما دے۔'' سامنے نظر پڑی تو حوریہ آپی مسکرا رہی تھیں۔
''کیا مانگ رہے تھے؟'' حوریہ نرمی سے بولیں۔
''خدا سے اپنی محبت مانگ رہا تھا۔'' میں مسکراتے ہوئے بولا۔ میری بات سمجھ کر انہوں نے نظریں چرالیں۔ اور بولیں۔
''اچھا یہ دیکھو تمہاری پسند کا کھانا لائی ہوں۔'' حوریہ میرا دھیان ہٹانے کو بولیں۔ کھانے کے دوران میں اُن کی اُلجھن محسوس کرتا رہا۔ وہ بار بار بات بدل دیتی تھیں۔

☆......☆......☆

میرے زخم بھر چکے تھے، میں بے حد خوش رہنے لگا تھا۔ لیکن میرا حسین خواب تب ٹوٹا جب حوریہ کی منگنی کا علم ہوا۔ میرا دل چاہ رہا تھا تمام دنیا کو آگ لگا دوں۔ حوریہ آپی کے منگیتر کو قتل کردوں۔ تمام وقت اپنے کمرے میں یہ سوچتا رہتا کہ منگنی نہ ہونے پائے۔ حوریہ آپی اِن دنوں بالکل میرے سامنے نہ آتیں۔
''حمزہ! کیسے ہو؟'' مشعل نجانے کب میرے کمرے میں آئی تھی۔
''ہوں ٹھیک ہوں اب۔'' میں مروتاً مسکرایا۔
''حمزہ کبھی اِدھر اُدھر بھی دیکھ لیا کرو۔''
مشعل پُراسرار انداز میں مسکرائی۔
''کیا مطلب؟'' میں حیرت سے بولا۔
''حوریہ آپی کے علاوہ تو تمہیں کوئی نظر نہیں آتا۔'' مشعل کے لہجے میں شکوہ تھا۔ میں لمحے بھر کے لیے چپ رہ گیا تھا۔ اُس کا اشارہ اپنی طرف تھا۔ مگر یہ بات میرے لیے اہم نہ تھی۔
''مشعل مجھے تنگ نہ کرو جاؤ یہاں سے۔'' میں بیزاری سے بولا۔
''ہاں تمہیں کسی کی کیا پروا؟ تم کیوں نہیں مان لیتے کہ حوریہ آپی تمہارے لیے نہیں بنی ہیں۔ تم نے ہمیشہ میرے جذبات کو نظر انداز کیا ہے۔ آخر میں بھی تو انسان ہوں۔ تم سے محبت کرتی ہوں اُس سے کہیں زیادہ جو تم آپی سے کرتے ہو۔'' مشعل بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔
''مشعل! میں نے صرف حوریہ کو چاہا ہے۔ اُن کی جگہ میں کسی کو نہیں دے سکتا۔ اور تمہیں تو بالکل بھی نہیں کیوں کہ تمہیں دیکھ کر مجھے، ہر پل اُن کی یاد آئے گی۔ میں نہ خود خوش رہوں گا اور نہ تمہیں رکھ سکوں گا۔ محبت کرتی ہو تو محبت کرنے والوں کی تکلیف کو بھی سمجھو۔'' میں نے کہتے ہوئے رُخ موڑ لیا۔
مشعل کمرے سے جا چکی تھی۔ ہم انسان بھی بے حد خود غرض ہوتے ہیں۔ صرف اپنی محبت کی تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ کسی دوسرے سے ہمیں کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ میں بھی بے حد خود غرض ہو چکا تھا۔
میرے پاس صرف دو دن تھے۔ جو کچھ کرنا تھا ان ہی دو دنوں میں کرنا تھا۔ حوریہ آپی کی منگنی کا اعلان سُن کر تو جیسے میری زندگی میں طوفان آ گیا تھا۔ خطرناک، منفی سوچیں میرے دماغ میں بھر رہی تھیں۔ غلط یا صحیح کسی بھی طرح بس یہ منگنی

رُک جائے۔

انہی سوچوں کو دماغ میں لیے میں سڑک پر بے مقصد گھوم رہا تھا۔ اچانک میری نظر سامنے ایک بورڈ پر پڑی میری نظر صرف اسی جملے پر ٹھہر گئی تھی ''محبوب آپ کے قدموں میں'' فوراً اندر داخل ہوگیا۔

وہاں اور لوگ بھی بیٹھے تھے۔ سامنے ایک سیاہ رنگت کا مکروہ شکل کا شخص بیٹھا تھا۔ غالباً وہی، بنگالی بابا' تھا۔ چند لمحوں کے لیے میرا دل چاہا کہ بھاگ جاؤں مگر میرے دماغ پر عشق کا بھوت سوار تھا، سو جانے کا ارادہ ترک کر کے بیٹھ گیا۔

''کیا چاہتے ہو؟'' بابا آنکھیں بند کیے مجھ سے مخاطب تھا۔

''میں...... میں دراصل کسی سے محبت کرتا ہوں اور......''

''جانتا ہوں آگے بولو۔'' بابا نے میری بات کاٹ کر کہا۔

''میں چاہتا ہوں وہ ہمیشہ کے لیے میری ہوجائے۔'' میں نے فوراً دل کی بات کہہ ڈالی۔

''کام ہوجائے گا مگر......'' بابا نے آنکھیں کھول کر میری طرف ذومعنی انداز میں دیکھا۔

میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا، تبھی چند نوٹ اُسے تھما دیے۔

''یہ تعویذ لو، اسے رات 12 بجے کے بعد جلا دینا۔ جو چاہتے ہو وہی ہوگا۔'' بابا نے میری طرف تعویذ بڑھاتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

میں نے رات بارہ بجے کے بعد تعویذ جلا دیا اور صبح تک انتظار کرتا رہا کہ کب کوئی خبر ملے گی کہ منگنی نہیں ہورہی مگر ایسا کچھ نہ ہوا اور منگنی کا دن آن پہنچا۔ میں کمرے میں بے قراری سے ٹہل رہا تھا۔

''حمزہ میری جان! بیٹا ضروری نہیں کہ انسان زندگی میں جو چاہیے وہی ہو۔ میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ مجھے میرے بھائی اور بھابی کے سامنے رُسوا نہ کرنا۔ ابھی تک یہ معاملہ تمہارے ماموں کے علم میں نہیں ہے، ورنہ طوفان آچکا ہوتا۔ خاموش رہنے میں ہی سب کی بھلائی ہے۔ کوئی بھی ایسی حرکت نہ کرنا کہ بدمزگی ہو۔'' امی بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔

☆......☆......☆

مہمانوں کی آمد کا آغاز ہوچکا تھا۔ میری گھبراہٹ بڑھتی جارہی تھی۔ میں یہ سب نہیں دیکھ سکتا تھا، اسی اضطرابی کیفیت میں گھر سے باہر نکل گیا اور رات کو جب سب سوگئے، تو گھر میں داخل ہوا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی میری نظر حوریہ آپی پر پڑی، شاید میرا ہی انتظار کررہی تھیں۔ میری نگاہ اُن کے ہاتھ میں موجود خوبصورت 'انگوٹھی' پر پڑی۔

''منگنی بہت بہت مبارک ہو۔'' میں انہیں دیکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں بولا۔

''حمزہ! تم کہاں چلے گئے تھے۔ ہم سب کتنا پریشان ہورہے تھے؟'' حوریہ فکر مندی سے بولیں۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ کے معصوم چہرے کے پیچھے اتنا خودغرض چہرہ چھپا ہوا ہے۔ یہ سرپرائز دینا چاہتی تھیں؟ اب میں بھی آپ کو ایسا سرپرائز دوں گا کہ یاد رکھیں گی۔''

''حمزہ! میری بات تو سنو۔'' حوریہ آپی گھبراتے ہوئے بولیں۔

''مت لیں میرا نام اور نہ ہی مجھ سے بات کریں۔'' میں کہہ کر کمرے میں داخل ہوگیا۔

حوریہ آپی نے میرے کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کی تو میں نے دروازہ بند کرلیا۔

''حمزہ دروازہ کھولو!'' حوریہ بولیں۔

''چلی جائیں میں آپ کی آواز بھی نہیں سننا چاہتا۔'' میں اندر سے دھاڑا۔

کس قدر شفاف محبت تھی حوریہ آپی کی کہ میری ہر زیادتی کے باوجود وہ میری فکر کرتی تھیں۔ انہیں میرا غم تھا۔ میں انہیں خود غرض کہہ رہا تھا مگر نہیں جانتا تھا کہ اصل میں خود غرضی میں دکھا رہا تھا۔

غم و غصہ اور اضطرابی کیفیت میں ہی میں نے نیند کی نجانے کتنی گولیاں کھالیں اور جب ہوش آیا تو میں اسپتال میں تھا۔

حوریہ آپی اور مشعل پاس بیٹھی تھیں۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر حوریہ آپی نے مجھے آواز دی مگر...... مگر میں بے حس بنا لیٹا رہا تھا۔

''حمزہ! یہ تم نے کیا کیا؟ اگر تمہیں کچھ ہوجاتا تو؟'' حوریہ آپی ابھی تک نڈھال تھیں۔ میں جواباً خاموش رہا تھا۔

''کیوں ایسی ضد لگائی ہے تم نے جو میرے بس میں نہیں۔'' حوریہ بولیں۔ میں خاموشی سے انہیں دیکھتا جا رہا تھا۔

''میں یہ تو کرسکتی ہوں کہ تمام عمر شادی نہ کروں مگر جو تم چاہتے ہو وہ مجھے ہرگز قبول نہیں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولیں۔

''تو پھر ٹھیک ہے آپ کھو دیں گی اپنے حمزہ کو۔'' میں سختی سے کہہ کر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔

''حمزہ! میرے بچے! میرے لعل! یہ کیا کر دیا تُو نے۔'' امی میرے قریب آکر ممتا سے چُور لہجے میں بولیں۔

''امی میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے امی کو محبت سے دیکھتے ہوئے تسلی دی۔

''حمزہ! بیٹا بڑی مشکل سے جان بچی ہے۔ ڈاکٹر مایوس ہوچکے تھے۔ حوریہ نے دن رات تمہاری زندگی کے لیے دعائیں مانگیں۔ تمہارے ہوش میں آنے تک کچھ کھایا نہ پیا۔'' امی مجھے سوپ پلاتے ہوئے محبت سے بولیں۔

میں سُن کر دل ہی دل میں نہال ہو رہا تھا۔ مجھے اب اپنی منزل بہت قریب نظر آرہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میری محبت جیت جائے گی۔ میں دل ہی دل میں خدائے پاک کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اُس نے مجھے میری محبت دے دی کیا واقعی بنگالی بابا کا تعویذ کام کر گیا تھا؟

میں سرشار انداز میں سوچ رہا تھا کہ یکایک شور کی آواز...... ماموں ممانی اور امی کی ملی جلی آوازیں مجھے فوراً خیال آیا کہ امی نے شاید ماموں سے بات کی ہے؟ ایکدم کمرے کا دروازہ زوردار آواز میں کھلا اور ماموں غضبناک انداز میں کمرے میں داخل ہوئے۔ یوں لگا جیسے کمرے میں بھونچال آگیا ہو۔

''یہ میں کیا سن رہا ہوں؟'' ماموں شعلہ بار نگاہوں سے مجھے گھورتے ہوئے بولے۔ میں جواباً خاموش رہا تھا۔

''میں کیا پوچھ رہا ہوں؟'' وہ میرا بازو جھنجھوڑ کر دھاڑے۔ میں نے ماموں پر ایک نظر ڈالی اور پھر سر جھکا لیا تھا۔

''تو یہ چل رہا تھا گھر میں؟ خودکشی کے پیچھے یہ وجہ تھی؟ کیوں تم نے حوریہ سے ایسی بات کی؟ جواب دو، کی تھی یہ بات؟'' ماموں چلائے۔

میں خاموش رہا تھا مگر ہاں میں سر ہلا دیا۔ میرے اقرار پر انہوں نے ایک زوردار تھپڑ مجھے

رسید کیا۔
''یاد رکھو حمزہ! یہ میری زندگی میں کبھی نہیں ہوسکتا۔ ہماری محبتوں کا تم یہ صلہ دو گے، میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔'' ماموں کی نظروں میں غصہ، شکوہ اور غم نمایاں تھا۔ وہ کمرے سے جاچکے تھے۔ میں ساکت اپنی جگہ بیٹھا تھا۔ مجھے اُن سے اتنے سخت ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔

میں اُس دن بہت رویا تھا، شاید اپنی زندگی میں کبھی نہیں رویا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ ماموں کے سامنے جاؤں اور چیخ چیخ کر پوچھوں کہ میری اس خواہش میں آخر کیا قباحت ہے۔ جو پوری نہیں ہوسکتی؟ میں ایسا کون سا کام کررہا ہوں جو خلافِ شریعت ہے؟ مگر یہ جرأت نہیں کرسکا تھا۔ میں نے بے بسی کے عالم میں اللہ سے بھی ڈھیروں شکوے کرڈالے۔ مگر پھر بھی میں ہارنے کو تیار نہیں تھا۔ فوراً آنسو پونچھتا ہوا آپی کے کمرے میں گیا اور بہت بے رحمی سے اُن کا بازو کھینچتا ہوا بولا۔
''ابھی اور اِسی وقت میرے ساتھ چلیں۔''
میرے انداز پر وہ حیران ہوئیں۔
''مگر کہاں اور کیوں؟ بات کیا ہے؟'' حوریہ آپی مجھے دیکھتے ہوئے بولیں۔
''ہم ابھی اور اسی وقت کورٹ میرج کریں گے۔'' میں مضبوط لہجے میں بولا۔
''حمزہ! تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟'' آپی نے اپنا ہاتھ چھڑالیا۔
''تو پھر ماموں سے صاف صاف کہہ دیں کہ آپ میرے علاوہ کسی سے شادی نہیں کریں گی۔'' میں مزید ہٹ دھرمی سے بولا۔
''حمزہ! بس کردو۔ خدا کے لیے ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے مجھے اس حد تک نہ لے جاؤ کہ مجھے تم سے نفرت ہوجائے۔'' حوریہ آپی ایکدم پھٹ پڑیں۔
''تمہاری خودکشی کی کوشش کے بعد میں نے یہ معاملہ اللہ کے سپرد کردیا تھا کہ جو میری قسمت میں ہوگا وہی مجھے منظور ہوگا۔ تمہاری وجہ سے میں نے یہ بھی سوچا کہ میں تمام عمر شادی نہ کروں، تاکہ تمہیں تکلیف نہ ہو۔ تاکہ تمہیں اذیت نہ ہو۔'' حوریہ آپی روتی ہوئی بولتی گئیں۔
''حمزہ میں تمہاری ہر غلطی کو معاف کرتی رہی کہ تم بچے ہو، نادان، ناسمجھ ہو، تمہارے طنزیہ اور ذومعنی جملوں پر میرا دل روتا تھا کہ کیا یہ وہی حمزہ ہے جسے میں نے اتنے لاڈ پیار سے پالا تھا؟ جس کے ناز اٹھائے، جس کے مسکرانے پر میں کھل اٹھتی تھی؟ پھر بھی میں نے کبھی برا نہیں چاہا۔ ہمیشہ تمہاری بھلائی چاہی۔ تمہاری حرکتوں اور نادانیوں نے مجھے گھر بھر میں رسوا کیا، مگر میں نے کبھی شکوہ نہیں کیا۔ سب سے بڑھ کر تم نے میری بے لوث شفقت کو خودغرضی اور بے حسی قرار دیا، مگر آج تم نے حد کردی۔ مجھے تم سے اس بدتمیزی کی اُمید نہیں تھی۔ حمزہ! تمہیں کیا ہوگیا ہے میری ماتا جیسے جذبات کو تم نے اس قدر کمتر اور غلط کیوں جان لیا کہ تمہیں کوئی شرمندگی ہی نہیں۔'' حوریہ آپی اپنا چہرہ چھپا کر زاروقطار رو رہی تھیں۔
میں جو اُن کی باتیں سُن رہا تھا۔ یکایک ہوش میں آیا اور ایک لمحے کے لیے بھی میرے لیے کھڑا ہونا مشکل ہوگیا تھا میں نجانے کس طرح اپنے کمرے میں آیا۔
اگلے دن ماموں نے فیصلہ کردیا کہ حمزہ کو پڑھائی کے لیے امریکہ بھیج دیا جائے اور ایک ہفتے کے اندر اندر حوریہ اور ریحان کی شادی کردی جائے اور میرا آپی سے ملنا بالکل بند کردیا گیا۔

☆......☆......☆

آپی کی شادی کی تیاریاں شروع ہوگئی تھیں۔ میں جو آپی کی باتوں پر وقتی طور پر خاموش ہوگیا تھا۔ پھر سے بھڑک اٹھا میری کیفیت اُس جنونی بچے کی طرح ہوگئی جو پہلے تو کھلونا مانگنے کی ضد کرتا ہے اور جب کھلونا نہ ملے تو وہ اس کھلونے کو توڑ دیتا ہے کہ وہ کسی کے استعمال میں نہ رہے۔ میرا عشق جنون کی شکل اختیار کرتا جارہا تھا۔ پل بھر میں ایک بے رحمانہ فیصلہ کر بیٹھا۔ میں نے بازار سے تیزاب کی بوتل خریدی، کہ حوریہ آپی اگر میری نہیں ہورہیں تو پھر کسی کی بھی نہ ہوں۔ اُن کے کمرے کی جانب بڑھا۔ زرد کپڑوں میں وہ حور لگ رہی تھیں۔ اُن کے اِرد گرد لڑکیوں کا ہجوم تھا مگر اس خوشی کے موقع پر بھی وہ بے حد اُداس نظر آرہی تھیں۔

میرا دل ایک دم بجھ سا گیا تھا۔ یقیناً اُن کے اُداس چہرے کے پیچھے میں ہی تھا۔ مگر اگلے ہی لمحے مجھے یہ اُداس چہرہ نہایت خودغرض اور دھوکے باز دکھائی دینے لگا میری گرفت بوتل پر مزید سخت ہوگئی۔ مگر اس ذاتِ پاک کے کام نرالے ہوتے ہیں۔

''حمزہ میری جان! کہاں ہو تم؟'' ماضی کے پردے پر حوریہ آپی کی دلکش آواز اُبھری۔ میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا تھا۔

''جیسے میرا ننھا سا دوست خوش، ویسے ہی میں خوش۔'' ایک مرتبہ پھر آواز سنائی دی۔

''حمزہ تو میرا شہزادہ ہے۔'' حوریہ آپی کی محبت بھری آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ میری نگاہیں حوریہ آپی کے چہرے پر پڑیں، اُن کا چہرہ اُداس اور آنکھیں بجھی ہوئی تھیں۔ میری آنکھوں میں دُھندسی چھاگئی، میرے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے، دل ایکدم گھبرا گیا۔ تیزاب کی بوتل پر نظر پڑی تو میرا دل ڈوب گیا۔

''یا الٰہی میں کیا کرنے لگا تھا؟ مجھے اپنے آپ سے نہایت خوف محسوس ہوا تھا۔ میرا دل چاہا کہ حوریہ آپی کی گود میں چھپ جاؤں اور کہوں ''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' اور وہ مجھے اپنی آغوش میں چھپالیں۔ میرا دل ہر چیز سے اُچاٹ ہوگیا تھا۔

اسی اضطرابی کیفیت میں اچانک ہی ایک فیصلہ کر ڈالا۔ گھر چھوڑنے کا، میں نے الوداعی نگاہ حوریہ آپی پر ڈالی اور پھر باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

☆......☆......☆

نجانے کون سی منزل تھی اور کون سا راستہ تھا؟ مجھے کچھ معلوم نہ تھا۔ انجانی سمت بڑھتا جارہا تھا۔ بھوک، پیاس کسی بھی چیز کا ہوش نہیں تھا۔ قدم تھے کہ رُکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ میں بہت دور جانا چاہ رہا تھا میں ہار گیا تھا، ناکام ہوگیا تھا۔ میری محبت ہار گئی تھی۔ اور مجھ میں حوصلہ نہیں تھا کہ میں اپنی محبت کو کسی اور کا ہوتے ہوئے دیکھوں۔ زندگی بے رونق اور بے معنی ہوگئی تھی۔ نظروں کے سامنے انجان راستہ تھا اور نگاہوں میں دھند چھائی تھی۔ میں راستہ دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

☆......☆......☆

قدم رُکے تو سامنے ایک مزار تھا۔ جہاں عجیب سماں بندھا تھا۔ فضا میں کبوتروں کی غٹرغوں سنائی دے رہی تھی۔ میں انجانی کشش کے تحت اندر داخل ہوگیا۔ ہر سُو گلاب اور اگربتیوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ مزار پر بے حد سکون تھا۔ میرے بے قرار دل کو قرار محسوس ہوا اور میں نڈھال سا ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گیا۔

''یہ لو۔'' کی آواز پر میں نے آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا تھا۔

''لو پانی پیو۔'' وہ مہربان صورت اور مہربان آواز والا شخص پھر بولا۔ میں نے گلاس تھام لیا اور پانی پی گیا۔

''اُداس ہو؟'' وہ اجنبی شخص۔ میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ میں جواباً خاموش رہا تھا۔

''دل پر چوٹ کھائے لگتے ہو؟'' وہ اجنبی گویا میرے اندر جھانکنے لگا تھا۔

میرے دل میں ہُوک سی اٹھی تھی۔ یہی سچ تھا۔ میرے نظریں چُرانے پر وہ شخص مسکرایا تھا۔

''اس عمر میں ایسے روگ لگنا عجیب بات نہیں۔'' وہ پھر بولا۔ مجھے اب اُس کی باتوں میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔

''میرے دوست! میرے خیال میں یہ کوئی اتنی بڑی بات بھی نہیں۔'' وہ اجنبی شخص میرے متوجہ ہونے پر بولا۔

''آپ کے لیے اس لیے بڑی بات نہیں کہ آپ نے شاید کبھی کسی سے محبت ہی نہیں کی؟ آپ کیا جانیں گے؟'' اس عرصے میں پہلی بار بولا۔

میری بات سُن کر وہ شخص زیرلب مسکرایا اور پھر یہ مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی۔

''یہ آپ کی مسکراہٹ...... میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا۔'' میں حیران ہوتے ہوئے بولا۔

''بتاؤں گا مگر پہلے تم اپنی اُداسی کی وجہ بتاؤ۔'' وہ شخص پھر بولا۔ نجانے کیا تھا اُس شخص کے لہجے میں کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی سب بتا بیٹھا۔ حوریہ آپی سے میری بچپن کی محبت اور اُن کی خودغرضی......

''آپ اِسے محبت کہہ سکتے ہیں مگر میرا یہ عشق ہے میں نے ہر پل انہیں چاہا، انہیں سوچا ہے، مگر وہ میرے عشق سے انکاری ہیں۔ انہوں نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟'' میں بولتا چلا گیا۔

''عشق کا مطلب کیا ہے؟'' وہ شخص میرے خاموش ہونے پر بولا۔

''کیا مطلب؟'' میں حیران ہوا۔

''بھئی میں تم سے صرف عشق کا مطلب پوچھ رہا ہوں۔'' وہ شخص اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ میں ایک پل کے لیے بالکل خاموش ہوگیا تھا۔

''میرے دوست دراصل عشق ایک ملکوتی جذبہ ہے۔ عشق کیا نہیں جاتا، ہوجاتا ہے۔ یہ ہر قسم کی توقعات سے پاک ہوتا ہے۔ محبت میں دوئی ہوتی ہے مگر عشق میں وحدت ہوتی ہے۔ اس میں 'میں' نہیں ہوتا صرف 'تُو ہی تُو' ہوتا ہے۔ جس کا عشق حقیقی ہوتا ہے کامیاب وہی ہے۔ ہم عام لوگ عشق کرنے کی بات کرتے ہیں، ہم تو محبت بھی ٹھیک طرح سے کر نہیں پاتے۔

عشق امتحانات سے خالی نہیں ہے۔ عشق کا میدان یا عشق کا راستہ آزمائشوں اور امتحانات سے بھرا پڑا ہے۔'' میں خاموشی سے اُس شخص کی باتیں سُن رہا تھا۔

''اب میں تمہیں اپنی مسکراہٹ کی وجہ بتاتا ہوں۔ میں نے بھی کبھی کسی سے محبت کی تھی۔ جانتے ہو میں نے کس سے محبت کی تھی؟ اپنی بیوی سے......''

وہ میری بچپن کی منگیتر تھی۔ ہمارے درمیان کوئی ظالم سماج نہیں آیا تھا۔ میں نے ہر پل اسی کو چاہا تھا۔ اُس کی تمنا کی تھی۔ مگر شادی کی رات اُس نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا۔

''احسن! میں نے کبھی تم سے محبت نہیں کی۔ یہ ہمارے بڑوں کا فیصلہ تھا۔ میری محبت کوئی اور ہے۔ مجھے آزاد کردو گے تو تمہارا احسان ہوگا مگر میں تمہیں ساری زندگی کوئی خوشی اور محبت نہ دے سکوں گی۔'' وہ شخص نجانے کہاں کھویا تھا۔

''مجھے وقتی طور پر دھچکا لگا تھا مگر پھر سنبھل گیا

ویسے بھی کسی کو خود سے محبت کرنے پر مجبور تو نہیں کیا جاسکتا۔ پھر میں نے سارا الزام اپنے سر لے لیا۔ خاندان بھر نے لعن طعن کی، مگر میں نے اُف تک نہ کی۔ محبت کی تھی، اس لیے محبت کو رُسوائی سے بچانا چاہتا تھا۔ میں نے اُسے طلاق دے دی۔ اُس کی ممنون نظریں آج بھی مجھے یاد ہیں۔ وہ اپنے گھر میں اپنے شوہر کے ساتھ خوش ہے۔ میرے لیے یہی کافی ہے۔ اُس کے بعد میرے دل کو سکون کی دولت مل گئی۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ عشق مجازی خود کچھ بھی نہیں اگر وہ عشقِ حقیقی میں نہ ڈھلے۔

اب تمہاری بات کی طرف آتا ہوں۔ تم نے اپنی کزن سے بے انتہا محبت کی اور اُس محبت میں جان سے بھی گزرنے سے دریغ نہیں کیا، مگر میں تم سے کہوں گا کہ تمہارا جذبہ ہمیشہ سے یکطرفہ رہا۔ تمہاری کزن نے صرف تم سے وہ محبت کی جو بھائیوں سے کی جاتی ہے۔ اُس کی محبت بے غرض اور لالچ سے پاک تھی مگر تمہارے رویے نے یقیناً اُس لڑکی کو دُکھ پہنچایا۔ تم نے اُس کی محبت کا اس قدر غلط مطلب نکالا کہ وہ ساری زندگی محبت کرنے سے خوف کھائے گی۔ جس بچے کو اُس نے انتہائی محبت سے پالا، اُسی بچے نے خاندان بھر میں اُسے رُسوا کروایا۔ کیا یہ تمہاری خود غرضی نہیں ہے؟'' انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے مجھے دیکھا اور سوال کر ڈالا۔

''آپ میری محبت کو خود غرضی کہہ رہے ہیں۔'' میں دُکھ اور صدمے سے بولا۔

''بالکل!'' وہ یقین سے بولا۔

''کوئی میری بات نہیں سمجھتا کسی کو میری پروا نہیں ہے۔'' میں نروٹھے پن سے بولا۔ میری بات پر وہ شخص مسکرانے لگا تھا۔

''چلو مان لیتے ہیں کہ اُس نے تمہارے ساتھ ایسا کیا مگر تم بھی سوچو، تم نے اُس کے ساتھ کیا کیا؟ بے وفائی اور مطلبی پن؟'' وہ شخص رسانیت سے بولا۔

''میں نے کیا بے وفائی کی ہے؟ کیا مطلبی پن کیا ہے اُس کے ساتھ؟'' میں ایک دم سب کچھ بھلا کر اپنے دفاع کے لیے تیار ہوگیا۔ اس لمحے مجھے آپی بھی یاد نہ رہی صرف اپنی پڑ گئی تھی۔

''دیکھا دل پر چوٹ لگی تو رونا بھی آیا، وہ یاد بھی آیا۔ یہ مطلبی پن نہیں، اس ذات پاک کے ساتھ اور پھر کیا ہے؟'' وہ اجنبی شخص نرمی سے بولا۔

''آج اپنے عشق کے لیے اتنا غم زدہ ہو جو عشق صحیح معنی میں 'محبت' کہلانے کے بھی لائق نہیں جو صرف 'ضد' اور 'اَنا' ہے ایک انسان کو پانے کے لیے غور سے سنو۔ تمہاری چاہت میں ہونا وہی ہے جو (اللہ) اُس کی چاہت ہے۔''

''کیا ہے اُس کی چاہت؟'' میں بالکل بچوں کی طرح پوچھ بیٹھا۔

''یہی کہ ہر انسان دل سے ہر قسم کی محبت کو نکال کر اپنا سر اللہ کے در پر جھکا دے۔'' وہ شخص بولا۔

میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ میں بالکل ساکت ہوگیا تھا۔ غور کیا تو احساس ہوا کہ واقعی میری محبت تو یکطرفہ جذبہ تھا۔ آپی کو حاصل کرنے کا جنون تھا، ضد تھی، اس کی خاطر میں آپی پر تیزاب تک پھینکنے والا تھا۔ مجھے لگا کہ میں تو ایک خود غرض زندگی گزار رہا تھ، جس میں اللہ سے تعلق صرف نام کا تھا کہ یہ مانگ لوں اور وہ مانگ لوں بالکل اس بچے کی طرح جو ماں باپ سے ہر جائز و ناجائز کا مطالبہ کرے مگر کسی ایک چیز کے نہ ملنے پر شکوہ کردے کہ آپ کو مجھ سے پیار نہیں ہے۔'' آج مجھے اپنی شکایت

اُسی بچے کی لگ رہی تھی۔ دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر میں بے تحاشا رو رہا تھا۔ وہ شخص اس دوران بالکل خاموش رہا تھا۔

میں آنسو صاف کر کے اُس سے بولا۔

''میرے محسن! مجھے کچھ اور بھی بتائیں۔''

''بس میرے دوست! میں کیا، میری اوقات کیا؟ بس اتنا یاد رکھنا کہ

رب رب کردے بڈھے ہو گئے
مُلا، پنڈت، سارے
رب دا کھوج کداں نہ لبا
سجدے کر کر ہارے
رب تے تیرے اندر وسدا
وچ قرآن اشارے
بُلھے شاہ رب اونوں مل دا
جہڑا اپنے نفس نوں مارے''

میں کافی دیر زار و قطار روتا رہا۔ اُس مہربان شخص نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے کچھ دیر بعد جب سر اٹھایا تو اپنے محسن کو دور جاتا ہوا دیکھا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں اپنے محسن کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکا تھا۔ جو عشقِ حقیقی اور مقصدِ حیات مجھے بتا گیا تھا۔ میں 'بحرِ آگہی' میں غوطہ زن ہوا تو احساس ہوا کہ حقیقت وہ نہیں جو نظر آتی ہے بلکہ حقیقت کو کھوجنا پڑتا ہے اپنے نفس کو مار کر، میرے دل و دماغ سے اندھیرے چھٹ چکے تھے۔

میں ایک نئے عزم اور اُمید کے ساتھ کھڑا ہوا کہ میں مجھے اللہ اور اُس کے ساتھ ہر اُس روٹھے ہوئے رشتے کو منانا ہے جس کو میں نے اپنی ضد اور خودغرضی کی وجہ سے ناراض کر دیا تھا۔

''میں گھر کی طرف واپس چلا۔ سب سے سامنا کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ خاص کر حوریہ آپی سے، میں گھر میں داخل ہوا سیدھا حوریہ آپی کے کمرے کی طرف گیا۔ آپی کسی سے فون پر میرا ہی پوچھ رہی تھیں کہ میں اتنی دیر سے کہاں غائب ہوں؟''

میری آنکھوں میں اُن کی محبت پر آنسو آ گئے۔ آہٹ پر آپی نے میری طرف دیکھا تھا۔

''حمزہ! تم کہاں تھے؟ کیوں پریشان کرتے ہو تم ہم سب کو؟''

میں جواب میں خاموش رہا اور آنسو تھے کہ رُکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ آگہی کا ایسا سمندر میرے اندر در آیا تھا کہ جس میں اُتر کر میں ڈوبا نہیں تھا بلکہ حقیقت کو پا گیا تھا۔

''حمزہ میری جان! کیا ہوا؟ کیوں رو رہے ہو؟'' آپی میری حالت پر گھبرا گئیں۔

''آپی مجھے معاف کر دیں میں نے آپ سب کو بے حد تکلیف دی ہے۔'' میں بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

میرے منہ سے بہت عرصے کے بعد آپی سُن کر وہ بہت حیران ہوئیں اور محبت سے میرا چہرہ، دونوں ہاتھوں سے تھام کر بولیں۔

''حمزہ! میری جان! میں تم سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتی۔'' میں اُن کی محبت جانتا تھا تبھی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

دو دن بعد آپی کی شادی تھی میں نے بھائیوں کی طرح اپنی ہر ذمہ داری کو پورا کیا تھا۔ امی سمیت تمام گھر والوں سے معافی مانگ چکا تھا اور وہ سب مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے۔ انہوں نے کھلے دل سے مجھے اور میری نادانیوں کو معاف کر دیا تھا۔

کیونکہ اب میں حقیقی عشق کو جان چکا تھا اور جو اسے جان لے وہ کبھی ناکام نہیں رہتا۔

☆☆......☆☆☆

افسانہ

راحت وفا راجپوت

پاگل آنکھوں والی لڑکی

زندگی کی پہلی رات تھی۔ جو میں نے جاگ کر گزاری۔ اس لڑکی کا سراپا میری نظروں کے سامنے پھرتا رہا۔ پہلی بار کسی کے تصور نے میری تنہائی کو مہکایا تھا۔ یہ بات جان کر بھی کہ وہ ایک شادی شدہ لڑکی ہے اور ایک بچی کی ماں ہے۔ میں اُسے ذہن سے......

اُس کی زندگی کی شام بھی اُن آنکھوں میں ٹھہر گئی تھی

ایک خوبصورت افسانہ، جو دلوں سے مکالمہ کرے گا

جن سے مل کر زندگی سے پیار ہو جائے وہ لوگ آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں اس لڑکی کو میں نے گرمیوں کی ایک شام کو دیکھا تھا۔ کچھ لوگ بہت جلد باز ہوتے ہیں۔

پہلی ہی نظر میں آنکھوں میں نہیں رکتے۔ سیدھے دل میں اتر جاتے ہیں دل کی گہرائیوں میں بیٹھ جاتے ہیں اور پھر چیلنج کرتے ہیں کہ اگر ہمت ہے تو دل سے نکال کر دیکھو۔ تب سارا وجود بے بس ہو جاتا ہے۔

☆......☆......☆

میں عمر کے اس دور میں تھا جب خواب دیکھے جاتے ہیں اور صنفِ نازک میں بے انتہا کشش محسوس ہوتی ہے۔ مگر میں لڑکیوں سے دور ہی بھاگتا تھا۔ کچھ تو میں فطرتاً شرمیلا تھا، کچھ گھر کا ماحول بہت مذہبی تھا اور دوسرے جم کے ایکسر سائز کروانے والے کوچ صاحب نے پہلے دن ہی کہہ دیا تھا کہ اگر اپنا جسم مضبوط بنانا ہے تو اپنے خیالات کو اُجلا رکھنا۔ اپنے آپ پر اور نفس پر قابو رکھنا۔ سو میری زندگی میں کسی لڑکی کے رنگین آنچل کا سایہ بھی نہیں تھا۔

علامہ اقبال کے شہر سیالکوٹ کے بہترین کالج میں فورتھ ایئر کا اسٹوڈنٹ تھا۔ ان دنوں کالج یونین کے چند لڑکوں کے ساتھ میری تلخ کلامی ہو گئی اور بات اور زیادہ بڑھ گئی۔ سو میں ڈٹ گیا اور ہاتھا پائی میں ایک لڑکے کے سر پر چوٹ لگ گئی۔ نیچے گرنے کی وجہ سے اس کا سر پھٹ گیا۔ اس کے ساتھی اسے ہاسپٹل لے گئے۔ میں گھر آ گیا شام کو پتا چلا کے لڑکے کے گھر والے تھانے میں میرے خلاف پرچہ درج کروانا چاہتے ہیں امی جان کا رو رو کر برا حال ہو گیا۔

میری باجی لاہور میں بیاہی ہوئی تھیں۔ ابو نے اُن سے بات کی، تو انہوں نے کہا عادل کو چند دنوں کے لیے لاہور بھیج دیں۔ میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ ابو نے سمجھایا کہ تم چلے جاؤ میں لڑکے والوں سے مل کر معاملہ ختم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پھر امی نے ہاتھ جوڑ دیے۔ مجبوراً میں لاہور آ گیا۔

☆......☆......☆

میرے بہنوئی بزنس مین تھے۔ باجی کے دو بچے

تھے۔ بیٹا فہد چھ سال کا تھا اور بیٹی گود میں تھی۔ فہد میرے آنے سے بہت خوش تھا۔ لاہور آنے کے ہفتہ بعد ہی میں سخت بور ہوگیا۔ گھر فون کرتا تو ابو کہتے ابھی ٹھہر جاؤ معاملہ گرم ہے۔ مجبوراً صبر سے انتظار کرتا رہا۔ ایکسر سائز چھوڑ دینے کی وجہ سے جسم ست ہونے لگا تھا۔ باجی کا گھر مال روڈ کے قریب تھا۔ ایک دن بھائی جان کہنے لگے۔

''تم کیا عورتوں کی طرح گھر بیٹھے رہتے ہو۔ شام کے وقت باغِ جناح چلے جایا کرو۔ واک ہو جایا کرے گی۔ اور فہد کو بھی گھما لایا کرو۔'' مجھے بھی آئیڈیا اچھا لگا۔ بھائی جان تو گاڑی استعمال کرتے تھے۔ ان کی موٹر سائیکل گیراج میں کھڑی رہتی تھی۔ سو میں نے وہ لے لی اور پھر روزانہ لارنس گارڈن جانے لگا۔ وہاں جاتے ہوئے چھٹا روز تھا۔ جب میں نے اُسے دیکھا۔

اُس روز فہد Ball کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ میں قریب ہی بینچ پر بیٹھا تھا کہ اچانک ایک طرف سے تین چار سالہ بچی بھاگتی ہوئی آئی اور اس نے فہد کا بال پکڑ لیا۔ فہد رُک کر بڑی دلچسپی سے دیکھنے لگا۔

پیلے رنگ کی پھولی پھولی فراک میں وہ جیسے پری لگ رہی تھی۔ وہ بال پکڑ کر فہد سے بولی۔
''میں لے لوں۔'' فہد ہنس پڑا میں اٹھ کر بچی کے پاس چلا آیا اور بچی کو گود میں اٹھا لیا۔
''آپ کو بال پسند ہے؟'' میں نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
''ٹھیک ہے بیٹا! آپ لے لو۔'' وہ خوشی سے بال پکڑ کر بھاگ گئی۔
''کیوں ماسٹر رونا تو نہیں آ رہا۔'' میں نے فہد کو چھیڑا۔
''نہیں ماموں میں اچھا بچہ ہوں! دوسروں کو اپنی چیزیں دے دیتا ہوں۔'' فہد سنجیدگی سے بولا تو مجھے ہنسی آ گئی۔ ابھی ہم بات کر ہی رہے تھے کہ وہ بچی دوبارہ آ گئی۔ بال فہد کی طرف بڑھا کر بولی۔
''اپنا بال لے لو۔''
''کیوں بیٹا کیا ہوا۔'' میں نے پوچھا۔
''ماما ڈانٹتی ہیں۔'' وہ منہ بسور کر بولی۔
''لائبہ جلدی واپس آؤ۔'' پیچھے سے ایک نسوانی آواز آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔
پھر نظر لوٹ کر نہیں آئی
تجھ پہ قربان ہو گئی ہو گی
سفید شلوار دوپٹے میں گلابی رنگ کی پرنٹڈ قمیض میں اس کا چہرہ بھی گلابی ہو رہا تھا۔ میری نظریں اس کا طواف کرتی رہیں۔ وہ بچی کا ہاتھ پکڑ کر چلی گئی حد نظر تک اس کی پشت پر سیاہ گھنی چوٹی دیکھتا رہا۔

☆......☆......☆

زندگی کی پہلی رات تھی۔ جو میں نے جاگ کر گزاری۔ اس لڑکی کا سراپا میری نظروں کے سامنے پھرتا رہا۔ پہلی بار کسی کے تصور نے میری تنہائی کو مہکایا تھا۔ یہ بات جان کر بھی کہ وہ ایک شادی شدہ لڑکی ہے اور ایک بچی کی ماں ہے۔ میں اُسے ذہن سے نکال نہ پا رہا تھا۔
دوسرے دن لارنس گارڈن جانے کے لیے پہلی بار میں دل لگا کر تیار ہوا۔ خوبصورت اسٹائلش سلے ہوئے کاٹن کے سوٹ میں میرا قد اور بھی نمایاں ہو رہا تھا۔ سیاہ بال میں نے خوبصورت انداز میں سنوارے تھے۔ باجی نے فوراً میری نظر اتاری۔
کیا بات ہے لگتا ہے واک کرنے نہیں کسی سے ملاقات کرنے جا رہے ہو۔ باجی نے مذاق کیا تو میں جھینپ سا گیا۔

☆......☆......☆

دھڑکتے دل کے ساتھ میں باغ میں داخل ہوا۔ فہد آگے آگے چل رہا تھا۔ میں بے قراری سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں نے واک بھی نہیں کی۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے۔ فہد کو ساتھ لیے میں گیٹ کی طرف بڑھا اچانک سامنے والے ٹریک سے وہ آتی ہوئی دکھائی دی۔ میں وہیں ٹھہر گیا اور وہ میرے نزدیک سے گزر گئی۔ ایک مدہوش کن مہک میرے اردگرد پھیل گئی۔ آج بھی اس نے سفید شلوار دوپٹے کے ساتھ ریڈ قمیض پہن رکھی تھی۔ لگتا تھا اسے سفید رنگ بہت پسند ہے۔ وہ چھوٹا سا تولیہ لے کر منہ صاف کرنے لگی اور وہیں بینچ پر بیٹھ گئی۔ تب میں نے اُس شخص کو دیکھا جو لائبہ کو گود میں اٹھائے اس کی طرف آیا تھا۔ وہ اس کا شوہر تھا۔ کتنا خوش قسمت شخص تھا۔ وہ جو اس کے اتنا قریب تھا اور دونوں میں ایک اٹوٹ بندھن تھا۔ وہ اُس کی ہم سفر تھی۔ وہ بھی خوبصورت تھا۔ بالکل جوان، شادی شدہ لگتا ہی نہ تھا۔ دونوں شاید آپس میں کزن تھے۔ دونوں میں مشابہت تھی۔ چیزیں سمیٹ کر وہ گیٹ کی طرف چلنے لگے تو میں بھی ان کے پیچھے چل دیا۔ وہ ہنستے مسکراتے باتیں کرتے جا رہے تھے۔ اس لڑکی کی دلکش ہنسی اور مدھر آواز میری سماعتوں میں رس گھول رہی تھی۔ پھر وہ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر چلے گئے۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ فہد نے مجھے متوجہ کیا تو میں اسے لے

کر بوجھل قدموں سے گھر پلٹ آیا۔

☆......☆......☆

میری پہلی خواہش، پہلی نظر کی محبت، ایک شادی شدہ لڑکی ایک بچے کی ماں۔ قسمت کی اس ستم ظریفی پر میں نڈھال ہو گیا تھا۔ روز اپنے آپ سے وعدے کرتا کہ اب میں وہاں نہیں جاؤں گا اور پھر وہاں چلا جاتا۔ دل بس میں نہیں تھا۔ اب روزانہ اُس سے سامنا ہونے لگا۔ میں جان بوجھ کر اُس کے سامنے سے گزرتا۔ وہ دونوں میاں بیوی باری باری واک کرتے۔ ایک لائبہ کو لے کر بیٹھ جاتا اور دوسرا واک کرتا میں اُسی وقت واک شروع کرتا جب وہ کرتی۔ میں بھی اُسی کے ٹریک پر واک کرتا مگر اس کے ساتھ ساتھ نہیں چلتا بلکہ اس کے مقابل یعنی ہم دونوں کا ٹریک ہی تھا اور میں چونکہ تیز چلتا تھا۔ اس لیے دو بار اس کا سامنا ہوتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی تھی۔ روزانہ سامنا ہونے سے اتنا ہونے لگا کہ نظریں ملنے سے اس کی آنکھوں میں ہلکا سا شناسائی کا رنگ جھلکنے لگا۔ فہد بھی لائبہ کے ساتھ کھیلتا تھا۔ اس کا شوہر بھی اب مجھے پہچاننے لگا تھا۔ ایک شناسا مسکراہٹ مجھے دیکھ کر اُس کے چہرے پر آجاتی تھی۔

میری محبت کی کہانی کتنی عجیب تھی۔ محبوب کو خبر ہی نہیں تھی اور میں جل رہا تھا۔ اُسے خبر ہی نہ تھی کہ کوئی اس کی چاہت میں دیوانہ ہو رہا ہے۔ مجھے اس کے چہرے کا ایک ایک نقش ازبر ہو گیا تھا۔ وہ سامنے سے آتی تو کئی بار دل چاہا کہ اس کے سامنے کھڑا ہو جاؤں اور اُسے روک کر کہوں۔

''اے حسین لڑکی، تمہارے خیالوں میں میرا گزر ہے کہ نہیں، میں تو تمہاری محبت میں مٹا جا رہا ہوں۔ میرے کشکولِ محبت میں اپنی نظر کے چند سکے ڈال دو۔''

☆......☆......☆

ایک ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ وہ حسین لڑکی جس کا نام بھی مجھے معلوم نہ تھا۔ میرے لہو میں شامل ہو گئی۔ میرے اندر بس گئی تھی۔ کسی پل مجھے قرار نہ تھا۔

دل کی رگ رگ نچوڑ لیتا ہے
عشق میں یہ بڑی مصیبت ہے

میں عشق میں اندر ہی اندر گھل رہا تھا۔ صبر کا دامن ہاتھ سے نکلتا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک دن لائبہ فہد کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اس کا شوہر واک کر رہا تھا۔ بال کو ٹھوکر لگاتے ہوئے لائبہ نیچے گر گئی۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر اسے پکڑا، وہ بھی تیزی سے میری طرف آگئی۔

''لائیے مجھے دیجیے۔'' اس نے مجھ سے کہا۔ چند لمحے میں جیسے ساکت کھڑا رہ گیا۔ وہ میرے بہت قریب تھی۔ مجھ سے مخاطب تھی۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا تھا۔

لائبہ کو پکڑاتے ہوئے میرے ہاتھ اس کے ہاتھوں سے مس ہو گئے۔ میں ایک ٹک اُسے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر اُلجھن ابھر آئی۔ لائبہ کو لے کر وہ چلی گئی۔ آج قریب سے اس کی آنکھوں کو دیکھا تو پتا چلا اس کی آنکھوں کا رنگ آسمانی تھا۔

☆......☆......☆

گھر سے ابو کا فون آیا تھا۔ وہ مجھے واپس بلا رہے تھے۔ مگر اب میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ سو بہانہ بنا کر ٹال دیا۔

اس روز شام ہونے کو تھی وہ تھکی تھکی اور گم صم سی واک کر رہی تھی۔ جلد ہی اس نے واک چھوڑ دی اور ایک درخت کے نیچے پڑے بینچ پر بیٹھ گئی۔ میرا دل سوچ کر ہی بے چین ہو گیا کہ پتا نہیں کیا بات ہے، شاید طبیعت خراب ہے۔ کیا کروں کیسے پوچھوں۔ اس دن وہ دونوں جلدی واپس چلے گئے۔ پھر اگلے تین روز تک وہ باغ میں نہیں آئی۔ میرا برا حال تھا۔ بے بسی کی انتہا ہو گئی تو میں کمرے میں چھپ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔

لوگ کہتے ہیں مرد رویا نہیں کرتے مگر کیوں......

کیا مردوں کو تکلیف نہیں ہوتی۔ انہیں بھی چوٹ لگنے سے درد ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ مرد دوسروں کے سامنے نہیں روتے۔

پھر اس رات میں نے رو رو کر دعائیں کیں۔ گڑگڑا کر خدا سے التجا کی کہ اُس لڑکی کو میرے دل سے نکال دے۔ مجھے سکون دے دے۔ دعا مانگ کر دل کو جیسے سکون مل گیا۔

☆......☆......☆

اگلے روز میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ لارنس گارڈن میں قدم رکھا۔ آج میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اُسے دیکھوں گا بھی نہیں۔ میں جانتا تھا وہ میری کبھی نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنے شوہر اور بچی کے ساتھ پرسکون زندگی گزار رہی ہے، مطمئن ہے۔ وہ تو شاید کسی اور کا تصور بھی گناہ سمجھتی ہے۔

اس کا شوہر واک کر کے آیا۔ وہ بیٹھی رہی۔ شاید آج اس کا ارادہ نہیں تھا۔ میں فہد کو وہیں کھیلتا چھوڑ کر واک کے لیے ٹریک پر آ گیا اور دوسرے ہی چکر میں عجیب بات ہوئی۔ وہ میرے سامنے آ گئی۔ میں نے دل کو مضبوط کیا اور اس کی طرف دیکھے بغیر اس کے قریب سے گزرنے لگا۔

''پلیز میری بات سنیے۔'' اس کی آواز نے جیسے میرے قدموں کو جکڑ لیا۔ میں ایک لمحے کو ساکت رہ گیا۔ مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ بس اُسے دیکھتا رہا۔ اس کا دلکش چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ رنگ زرد ہو رہا تھا۔ نظریں جھکائے وہ سخت مشکل میں نظر آ رہی تھی۔

''جی کہیے......'' میں نے ہمت کر کے پوچھا۔

''آپ پلیز یہاں نہ آیا کریں۔'' اس کے منہ سے بڑی مشکل سے یہ الفاظ ادا ہوئے۔

''جی!'' میں حیران رہ گیا۔

''مگر کیوں؟'' میں نے سوال کیا مگر وہ چپ رہی۔

''بتایئے نا آپ کیوں چاہتی ہیں کہ میں یہاں نہ آیا کروں۔ اور گارڈن میں نہ آیا کروں یا آپ کے سامنے نہ آیا کروں۔'' میں نے پوچھا۔

''آپ پلیز میرے سامنے نہ آیا کریں۔'' اس نے ویسے ہی نظریں جھکائے جھکائے کہا۔

''وجہ جان سکتا ہوں۔'' اب میں نے ذرا اطمینان سے پوچھا۔

وہ پھر خاموش رہی۔ ''بتایئے نا۔'' میں نے اصرار کیا۔

''بس ایسے ہی......'' اس نے کہتے کہتے نظر اٹھائی اور میری نظروں سے نظر مل گئی۔ اور پھر فہم و ادراک کے سارے احساس میرے دل کو چھوتے چلے گئے۔ وجہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ میں نے ایک لمحے میں جان لیا تھا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہی تھی کہ میں اس کے سامنے نہ آیا کروں۔

یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں دن رات جس آگ میں جل رہا تھا اس کی ذرا سی بھی تپش اس تک نہ پہنچتی۔ میرا رونا، دعائیں کرنا، راتوں کو جاگنا رائیگاں نہیں گیا تھا۔ محبت خوشبو کی طرح اڑ کر اس کے دل میں بھی بس گئی تھی۔ میں تو یہ بھول ہی گیا تھا کہ عورت کی حس اس معاملے میں بہت تیز ہوتی ہے۔ مرد کی ایک نگاہ سے ہی وہ سمجھ جاتی ہے اور نہ جانے کب میری نظروں کا پیام اس کے دل نے قبول کر لیا تھا۔

''اگر میں یہ کہوں کہ یہ میرے بس میں نہیں ہے تو پھر۔'' میں نے سوال کیا۔ اس بار اس کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئی تھیں۔

''میں بہت پرسکون زندگی گزار رہی تھی، مگر آپ نے مجھے بے سکون کر دیا۔ میرے اتنے اچھے شوہر ہیں۔ میں ان سے بے وفائی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ مگر اب میرا خیال بھٹکنے لگا ہے۔ آپ پلیز یہاں نہ آیا کریں۔''

وہ رونے لگی۔ ابھی تک آس پاس کوئی نہیں آیا

تھا۔ میں نے بھرپور نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ وہ رو رہی تھی۔ مجھ سے اس کی بے بسی دیکھی نہ گئی۔ پھر اچانک اس نے جانے کے لیے قدم بڑھایا۔

''صرف ایک بات۔'' میں نے کہا تو وہ رُک گئی۔ مڑ کر نہیں دیکھا۔

''کیا اتنا حق ملے گا مجھے جس نے مجھے یہ میٹھا درد بخشا ہے۔ اس کا نام جان سکوں۔''

وہ ذرا سا مڑی تھی۔ ''میرا نام عالیہ ہے۔'' یہ کہہ کر وہ چلنے لگی تو میں نے پکارا۔

''عالیہ......'' میرے نام لینے سے واضح طور پر اس کا وجود ٹھہرایا تھا۔ ''میرا نام نہیں پوچھیں گی؟''

''نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''اتنا بوجھ برداشت نہیں ہوگا مجھ سے۔''

وہ چلی گئی۔ میں نے گہری ہوتی شام کے سائے میں اُسے خود سے بہت دور جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ چلی گئی مگر وہ شام میرے اندر کہیں ٹھہر گئی تھی۔

یہی ہے زادِ سفر جو سفر میں رکھنا ہے
تجھے تو حد نظر تک نظر میں رکھنا ہے

اُس دن کے بعد میں کبھی لارنس گارڈن نہیں گیا۔ کچھ دنوں بعد میں اپنے گھر واپس آ گیا۔ پڑھائی شروع ہوگئی تو دن گزرنے لگے۔ موسم بدلنے لگے۔ سب کچھ بدل گیا مگر نہ بدلا تو میرے دل کا موسم نہ بدلا۔ میرے اندر وہ آخری شام ٹھہر گئی تھی۔ وہی شام جس نے مجھے یہ خوشی بخشی کہ میرا جذبہ رائیگاں نہیں گیا تھا۔ اور وہی شام ہجر کی شام بن گئی۔ وہ آنکھیں جن میں میرے لیے آنسو تھے میرے دل میں گڑ گئی تھیں۔

میں نے لاہور جانا بہت کم کر دیا۔ تعلیم مکمل ہوگئی بہت اچھی جاب مل گئی۔

☆......☆......☆

باجی کے بچوں کا عقیقہ تھا۔ سارا خاندان لاہور میں جمع تھا۔ بچے آئسکریم کھانے کی ضد کرنے لگے۔ میں اور بھائی جان بچوں کو لے کر چمن آئسکریم آ گئے۔ مال روڈ کی رونقیں عروج پر تھیں۔ گاڑی کافی فاصلے پر پارک کی تھی۔ بچوں کو لے کر آئسکریم پارلر کی طرف بڑھا۔ تو بے خیالی میں سامنے نظر اٹھ گئی۔ اور پھر میں ساکت رہ گیا۔ وہی حسن بے مثال، وہی خوبصورت آنکھیں اس کے شوہر نے بچی کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ عالیہ کی گود میں دو تین سال کا بچہ تھا۔ جو شاید ضد کر رہا تھا۔ اس کا شوہر آئسکریم لینے چلا گیا۔ وہ ایک سائیڈ پر کھڑی تھی۔ میں اُسے دیکھتا رہا۔ میرے دل میں اداسی پھیلنے لگی۔ پھر نہ جانے مجھے کیا ہوا میں تیزی سے آگے بڑھا اور اس کے بالکل قریب سے گزرتے ہوئے اُسے دیکھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھا۔ میں صرف ایک لمحے کو رُکا اور پھر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ مجھے جس چیز کی تلاش تھی وہ مل گئی تھی۔ وہ واقعی ذرا نہ بدلی تھی۔ ویسا ہی حسن، ویسی ہی شلوار اور دوپٹے کے ساتھ رنگین قمیض مگر وہ آنکھیں بدل گئی تھیں۔ وہ آنکھیں جن میں زندگی ہوتی تھی۔ چمک تھی اب ان میں مکمل اداسی تھی۔ وہ شام جو میرے دل میں ٹھہر گئی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا، وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ کیسی عجیب محبت تھی، جو دو اجنبیوں کو دل سے احساس ایک کر گئی تھی۔

☆......☆......☆

اب میں عمر کے اس منزل پر ہوں جہاں زندگی میں ٹھہراؤ آ جاتا ہے۔ بے حد خیال رکھنے والی بیوی، ذہین اولاد معاشرے میں بہترین مقام یہی چیزیں انسان کی کامیابی کی ضمانت ہوتی ہیں نا۔ مگر دل کا کیا کیا جائے کہ ایک بار جہاں ٹھہر گیا تو ٹھہر گیا۔

وہ شام، وہ آنکھیں، ہمیشہ میرے دل میں رہتی ہیں۔ کیا آپ کے پاس کوئی نام ہے اس محبت کا......؟

☆☆......☆☆

افسانہ

محمد ابو ہریرہ بلوچ

دو پل کی ملاقات

تم جانتی ہو عائشہ جب میں اس بار جاؤں گا تو مجھے کوئی خوف نہیں ہوگا۔ پہلے جب جاتا تھا تو مجھے یہ خوف لگا رہتا تھا کہ اچانک اماں کو تمہاری شادی کرنا پڑ جائے گی۔ جب میں گھر آؤں گا تو تم نہیں ہوگی یا پرانے زمانے والے ڈاکو گھوڑوں پر آئیں گے اور ڈاکوؤں......

کبھی کبھی دو پل کی ملاقات، پوری زندگی کا ماحاصل

صبح سے اسپتال کے لان میں یہ اس کا تیسرا چکر تھا۔ وہ تو بیسیوں بار وارڈ سے برآمدے اور برآمدے سے لان میں آ چکی تھی۔ گلابی چادر میں اُس کا زرد چہرہ سرسوں کا پھول لگ رہا تھا۔ اپنے وجود کو چادر سے چھپائے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی لان کے اس کونے کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں رکھے ایک بنچ پر وہ اکیلا بیٹھا تھا۔

اُس نے نظر اُٹھا کر اپنی طرف آتی لڑکی کو دیکھا اور پھر لان میں دیکھنے لگا۔ لان میں طرح طرح کے مریض اور تیمار دار بیٹھے تھے۔ کچھ بیمار بچے اور بوڑھے گھاس پر لیٹے ہوئے تھے اور اُن کے پاس بیٹھے ان کے گھر والے انہیں اخبار یا چادر کے پلو سے ہوا دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس بور کر دینے والے منظر کو جسے وہ کئی دنوں سے دیکھ رہا تھا نظریں ہٹا کر ایک بار پھر اپنی طرف آتی لڑکی کو دیکھنے لگا۔ آہستگی سے چلتی ہوئی وہ اس کے قریب بنچ پر بیٹھ گئی۔ پھر آہستہ سے بولی۔

''صرف یہ کونا تھوڑا سا پُر سکون ہے۔''

شاید اس لڑکی نے یہ بات اپنے آپ سے کی تھی۔ عمر فاروق نے سر ہلایا اور گردن کو ہلکا سا خم دے کر اس کی طرف دیکھا۔ ایک شعر پوری شدت سے اس کے ذہن میں گونجا۔ بنچ پر بیٹھے اس نے اپنا رُخ لڑکی کی طرف کیا اور بولا۔

''محترمہ کیا میں آپ کو ایک شعر سنانے کی گستاخی کر سکتا ہوں؟''

لڑکی نے ایک نظر اسے دیکھا پھر سامنے لان کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ توقف کے ساتھ بولی۔

''سنایئے۔'' عمر فاروق نے شکریے کے طور پر ایک لمبا سانس کھینچا اور بولا۔

سمجھ سکا نہ میرے چاند کوئی بھی درد تیرا
مثالِ برگِ خزاں، رنگ کیوں ہے زرد تیرا

عمر فاروق کے شعر کہنے کے بعد لڑکی نے دوبارہ یہی شعر زیرِ لب دہرایا۔ پھر تھوڑی دیر خاموشی کے بعد بولی۔

''اچھا شعر ہے۔ کیا مجھے دیکھنے کے بعد آپ

کو یہ یاد آیا؟''
عمر فاروق دل ہی دل میں شرمندہ ہوا اور پھر

دھیرے سے مسکرایا پھر بولا۔
''آپ نے کیسے اندازہ لگالیا؟'' لڑکی نے

ایک طویل سانس کھینچی اور بولی۔
''میں اب بھی کبھی کبھار آئینہ دیکھ لیتی ہوں۔'' عمر فاروق لڑکی کے اس جملے پر غور کرنے لگا اور وہ لڑکی کچھ دور بے حال ہوتی ہوئی اس عورت کو دیکھنے میں مشغول ہوگئی۔ جس کا کمزور بچہ قے کر رہا تھا۔ لمبی ہوتی خاموشی سے تنگ آ کر عمر فاروق نے اس سے پوچھا۔
''میں نے شاید آپ سے آپ کا نام نہیں پوچھا۔'' وہ لڑکی اس عورت کو دیکھتے ہوئے مگن انداز میں بولی۔
''جی! اور آپ نے بھی تو اپنا نام نہیں بتایا۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میرا نام عمر فاروق ہے۔''
''اور مجھے عائشہ کہتے ہیں۔'' چند لمحوں بعد وہ بولی اور پھر اس عورت کو دیکھنے لگی جو کہ ایک بار پھر اپنے بچے کی قے کو کپڑے سے صاف کر رہی تھی۔
''یہاں آپ کس سلسلے میں ہیں۔ کیا آپ کا کوئی عزیز بیمار ہے؟'' عمر فاروق نے ایک بار پھر اس لڑکی کو مخاطب کیا۔ عائشہ نے تھوڑا سا رُخ موڑ کر اسے دیکھا اور پھر دائیں ہاتھ کی لکیروں کو کھوجنے لگی پھر بولی۔
''یہاں میری تائی اماں ایڈمٹ ہیں۔ اُن کی دماغ کی شریان پھٹ گئی ہے۔''
''اب کیسی ہیں وہ؟'' عمر فاروق نے پوچھا۔
''ٹھیک نہیں ہیں۔'' وہ مایوسی سے بولی۔
''شاید بچ جائیں اور شاید نہ بھی۔''
عمر فاروق چاہتے ہوئے بھی اسے تسلی کا کوئی لفظ نہ کہہ سکا۔ اس طرح کے کام اسے ہمیشہ ہی مشکل لگا کرتے تھے۔ اچانک ہی اس کے اندر چائے پینے کی طلب جاگی تو اس نے عائشہ سے بھی پوچھ لیا۔
''آپ چائے پیئیں گی؟''
''چائے۔'' اس نے زیرِ لب بڑبڑایا۔ پھر ہلکا سا مسکرائی۔
''میں چائے بہت پیتی ہوں مگر آج صبح سے ایک کپ بھی نہیں پیا۔''
''کیوں؟'' عمر فاروق کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''بس ایسے ہی کسی نے پوچھا نہیں اور میں نے پی نہیں۔ دراصل چائے میں دوسروں کے کہنے پر ہی پیتی ہوں خود سے کبھی خیال نہیں آیا۔''
عمر فاروق اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں ابھی آتا ہوں۔ آپ یہیں بیٹھیے گا۔'' اور پھر اس لڑکی کا جواب سنے بغیر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ دونوں ہاتھوں میں چائے کے کپ اٹھائے آ گیا۔ ایک کپ اسے پکڑاتے ہوئے جب اس کی سرد انگلیوں کا لمس اپنے ہاتھ پر محسوس کیا تو غزل کا دوسرا شعر اس کی زبان سے پھسلا۔

جتا رہا ہے مجھے کتنی محبتوں کا فراق
بجھا بجھا یہ بدن، ہاتھ سرد سرد تیرا

''لگتا ہے یہ غزل آپ کو بہت پسند ہے۔'' کہتے ہوئے اس لڑکی عائشہ نے چائے کا ایک گھونٹ بھرا۔ عمر فاروق بھی خاموشی سے چائے پینے میں مصروف ہوگیا۔
عائشہ نے چائے ختم کی اور پھر اُٹھ کر اسپتال کے اندرونی حصے کی طرف چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی بیزار شکل لیے ہوئے عثمان کے پرائیویٹ روم میں آ گیا۔
اسے دیکھتے ہی عثمان چہکا اس نے ایک بے نیاز نظر اس پر ڈالی اور میز پر پڑے شاپر میں سے

ایک سیب نکال کر اپنے رومال سے صاف کر کے کھانے لگا۔

''صبح سے دو کلو سیب کھا چکا ہے تُو۔'' عثمان چلایا۔

''سیب نہ کھاؤں تو کیا تیری ٹوٹی ہوئی ٹانگیں دباؤں۔'' عمر فاروق نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے طنز کیا تو عثمان کی آنکھیں غصے سے باہر کو ابل پڑیں۔

''مجھے ہاتھ لگا کر تو دیکھ لبو! تیری ٹانگیں توڑ کر تیرے ہاتھ میں نہ پکڑائیں تو میرا نام بھی عثمان نہیں۔'' وہ غصے سے پھنکارا۔ عمر فاروق عثمان کی یہ بات سن کر ہنس پڑا۔

''یہ گیدڑ بھبکیاں انہیں دینی تھیں جنہوں نے تیری ٹانگیں توڑی تھیں۔ شاید ڈر کر بھاگ جاتے۔''

عثمان اسے مارنے کے لیے ارد گرد کوئی چیز تلاش کرنے لگا جب کچھ نہ ملا تو جھنجلا کر بولا۔

''دیکھ لوں گا تمہیں بھی اور اُن کو بھی۔'' سیب کھانے کے بعد اس نے دل ہی میں فریاد کی۔

''ہائے اباجی! کہاں لا پھینکا آپ نے مجھے۔'' عثمان اس کے چچا کا لڑکا تھا۔ راہ چلتوں کو چھیڑ کر جھگڑا کرنے کا شوقین تھا اور اس وقت اسپتال میں اس کی موجودگی ایسے ہی واقعہ کا نتیجہ تھی۔ کسی لڑکی کو چھیڑنے پر اس کے بھائیوں نے اسے پکڑا اور اس کی دونوں ٹانگیں توڑ کر گھر کے دروازے پر ڈال گئے۔ چچا نے ابا کو فون کیا۔

''بھائی صاحب میرا اکلوتا بچہ......'' بھائی صاحب نے اتنا سنتے ہی جھٹ بوریا بستر باندھا، عمر فاروق کو ساتھ گھسیٹا اور اپنے گاؤں سے لاہور آ کر ہی دم لیا۔

چچا سرکاری ملازم تھے۔ تھے تو وہ سرکاری ملازم لیکن کبھی دفتر سے چھٹی کرنا گوارہ نہ کی اب عثمان کو اسپتال میں بستر پر پڑا دیکھ کر انہیں ہول اٹھنے لگے۔ ابا کی محبت نے ایک بار پھر جوش مارا اور انہوں نے فیصلہ سنا دیا کہ جب تک عثمان اسپتال میں ہے۔ عمر فاروق اس کے ساتھ رہے گا تا کہ اکیلے پڑے پڑے اسے اکتاہٹ کا احساس نہ ہو۔ اپنے ابا کے اس ظالمانہ فیصلے پر اس سے جس قدر ہو سکتا تھا احتجاج کیا۔ عثمان نے جب بھی حسبِ توفیق ناک بھوں چڑھائی مگر ان کے فیصلہ بدلنا نہ ممکن تھا۔

یوں تو وہ دونوں کزن تھے اور ہم عمر بھی مگر کبھی زندگی میں دو منٹ بھی پیار محبت سے ایک ساتھ نہ بیٹھ سکے تھے۔ عثمان نہایت متحرک لڑکا تھا اور عمر فاروق اس کی اسی اسپتال میں آ کر یہ صلاحیت بیدار ہوئی تھی ورنہ وہ جہاں ایک دفعہ بیٹھ جاتا وہاں سے اسے اٹھانا محال ہو جاتا۔ عثمان کو اس کی ہر عادت فضول لگتی تھی اور عمر فاروق کو بھی اس کی ہر عادت واہیات لگتی۔ ایسی صورت میں ان دونوں کا اسپتال میں ایک ساتھ رہنا کسی بڑے امتحان سے کم نہ تھا۔

اب وہ دونوں اپنا اپنا غم غلط کرنے کے لیے ایک دوسرے پر طنز کے وار کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے شاپر میں سے آخری سیب نکالا اور باہر جانے لگا۔

''میرا باپ یہ سیب میرے لیے لے کر آتا ہے۔'' عثمان پیچھے سے چلایا۔ عمر فاروق نے جیب سے رومال نکالا اور سیب صاف کرتے ہوئے بولا۔

''اور میرا باپ مجھے یہ سیب کھانے کے لیے یہاں چھوڑ کر گیا ہے۔''

☆......☆......☆

لمبے ہال سے گزرتے ہوئے وہ پرائیویٹ رومز کے اَدھ کھلے دروازوں سے اندر جھانکتا آگے بڑھ رہا تھا جب اچانک ایک اَدھ کھلے دروازے سے وہ مانوس گلابی چادر نظر آئی جس میں سرسوں کا وہ زرد پھول لپٹا ہوا تھا۔ عمر فاروق نے آہستہ سے دستک دیتے ہوئے اندر جھانکا۔

عائشہ نے مڑ کر دیکھا اور دوبارہ پلٹ کر ڈرپ کی رفتار چیک کرنے لگی۔ عمر فاروق سمجھ نہ سکا کہ اسے اندر آنے کی اجازت ملی ہے یا نہیں۔ ڈرپ کی رفتار سے مطمئن ہونے کے بعد وہ عمر فاروق سے بولی۔

''آپ باہر کیوں کھڑے ہیں؟''

''میں سمجھا شاید آپ نے مجھے اندر آنے کی اجازت نہیں دی۔'' وہ اندر آتے ہوئے بولا۔

''میں بھلا آپ کو اجازت کیوں نہ دوں کیونکہ آپ جس بنچ پر بیٹھے تھے میں بھی وہاں بغیر پوچھے ہی بیٹھ گئی تھی۔'' عائشہ نے کہتے ہوئے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''آپ کی تائی اب کیسی ہیں؟'' عمر نے بیٹھتے ہی سوال کیا۔

عائشہ نے ایک نظر بستر پر پڑی عورت کو دیکھا اور بولی۔

''مشینیں بتاتی ہیں کہ وہ اب کچھ بہتر ہیں۔''

عمر فاروق نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر بولا۔

''شام کی چائے کے لیے اگر میں آپ کو کہوں تو آپ برا تو نہیں مانیں گی؟'' عائشہ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''آپ ڈرتے بہت ہیں۔ میں برا نہیں مانوں گی، آپ لا دیجیے گا۔'' عمر فاروق مسکراتے ہوئے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

مغرب کی اذان سے تھوڑا پہلے وہ عائشہ کو چائے کا کہہ کر لان میں آ گیا۔ ہوا خوشگوار تھی اور صبح کے مقابلے میں اب اسپتال کے لان میں رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ اب صرف مریضوں کے ساتھ آئے ہوئے تیماردار لان میں بیٹھے تھے اور باتوں میں مصروف تھے۔ عمر فاروق جب دو چائے کے کپ لے کر آیا تو عائشہ پہلے سے ہی بینچ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ گرم گرم چائے کا کپ اسے پکڑاتے ہوئے وہ بینچ پر بیٹھ گیا۔ پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

''یہاں چائے اچھی مل جاتی ہے۔'' عائشہ کچھ نہ بولی اور خاموشی سے چائے پیتی رہی۔ چائے پینے کے بعد اس نے کپ اپنے اور عمر فاروق کے درمیان رکھ دیا اور بولی۔

''مجھے لگتا ہے کہ تائی زندہ نہیں رہیں گی؟''

''ان کی کتنی اولادیں ہیں؟'' عمر فاروق نے جھجکتے ہوئے پوچھا مگر اس نے شاید سنا ہی نہیں اور اپنے ہی رو میں بولنے لگی۔

''انہیں جلدی بھی تو بہت تھی نہ مرنے کی۔ ہر روز دعائیں کرتی تھیں کہ یا اللہ میرے لیے آسانی عطا فرما اور میں جانتی تھی کہ اُن کی آسانی اُن کی موت میں ہی ہے۔ بس اللہ نے اُن کی سن لی۔ کیپٹن عبداللہ کہتا تھا کہ اللہ میری ماں کی بہت سنتا ہے۔'' عمر فاروق نے دیکھا کہ اس کے چہرے کی زردی زائل ہو رہی ہے۔

''وہ کہتا تھا کہ اماں! یہ جو بلی آپ نے پال رکھی ہے نا۔ اسے آپ سے بڑا پیار ہے۔ میں آپ کو چھوڑ کر جاؤں تو جاؤں یہ آپ کو چھوڑ کر نہیں جائے گی۔ وہ صحیح کہتا تھا۔ مجھے تائی سے پیار ہے۔ مگر اس لیے نہیں کہ وہ میری تائی ہے بلکہ اس لیے کہ وہ کیپٹن عبداللہ کی ماں ہے۔ کیپٹن عبداللہ تو

اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ مگر میں اس کی ماں کو چھوڑ کر کہاں جاؤں۔''

بولتے بولتے وہ یکدم خاموش ہوگئی۔ گہری خاموشی چھا گئی۔ وہ کچھ دیر اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا پھر جیسے ہار کر پوچھ بیٹھا۔

''کیپٹن عبداللہ یہاں سے چلا گیا عائشہ؟''

ہر بار کی طرح اس بار بھی عمر فاروق کا سوال اس کے ارتکاز کو نہ توڑ سکا۔ وہ اسی طرح خاموش اپنے پیروں پر نظر جمائے بیٹھی رہی۔ پھر یوں لگا جیسے کسی سہانی یاد نے اس پر سایہ کیا ہے اس کے چہرے پر نرم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اور وہ جیسے بے خودی کے عالم میں بولی۔

''جب عبداللہ کو افغان بارڈر پر پوسٹ کیا گیا تو تائی بڑا گھبرائی، وہ شہابی گالوں والی پٹھان لڑکیوں سے بڑا ڈرتی تھیں۔ تایا جی ایک بار کابل گئے اور وہاں سے ایک افغان عورت کو بیاہ لائے۔ تائی نے کئی سال خوب صورت سوتن کا دکھ سہا۔ وہ دنیا سے رخصت ہوئیں تو تایا بھی ساتھ چلے گئے۔'' کہتے کہتے وہ جیسے کسی کی یادوں میں کھو گئی۔

''ایسے تو تجھے پٹھانوں کے دیس نہ جانے دوں گی۔ تیرا پکا انتظام کر کے، تیری بیوی کو ساتھ بھیجوں گی۔'' وہ اڑ گئیں۔

''اماں! ابا آپ کے شوہر تھے۔ وہ آپ پر سوتن لے آئے۔ میں کس پر سوتن لے کر آؤں گا۔ میری تو ابھی پہلی شادی بھی نہیں ہوئی۔ یہ تو سراسر زیادتی ہے۔ ایسے تھوڑا ہی شادی کروں گا۔ لمبی چھٹی لے کر دھوم دھام سے شادی کروں گا اور لمبے ہنی مون ٹرپ پر جاؤں گا اپنی دلہن کے ساتھ......'' مگر تائی پر عبداللہ کی ان باتوں کا مطلق اثر نہ ہوا۔

''میں نہیں آنے والی تیری باتوں میں۔ کسی اور کو پھسلاؤ، میں تو تیرا نکاح کروں گی اور وہ بھی ابھی کے ابھی کروں گی۔'' تائی نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔ کیپٹن عبداللہ تخت سے اٹھا اور صحن کے بیچوں بیچ دھرنا دے کر بیٹھ گیا۔

''بلائیے مولوی کو ابھی کے ابھی نکاح ہوگا۔ میں بھی اپنی ماں کا فوجی بیٹا ہوں۔ تب تک یہاں سے نہ اٹھوں گا جب تک بیوی والا نہ ہو جاؤں۔'' تائی نے دو منٹ سوچا اور پھر تخت سے اُتر کر پاؤں میں چپل پہنتے ہوئے بولی۔

''چل پھر یوں ہے تو یونہی سہی۔ یہیں بیٹھا رہ میں ابھی آئی۔'' اور دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ کیپٹن عبداللہ گھبرا کر برآمدے میں بیٹھی عائشہ سے بولا۔

''تمہارے سوا اماں کی نظر کسی اور پر تو نہیں تھی؟ دیکھنا یار کہیں مروا ہی نہ دینا۔'' پھر تھوڑی دیر بعد سچ میں تائی مولوی صاحب کو لے آئی اور دونوں کا نکاح کروا دیا۔ تائی جب محلے میں مٹھائی بانٹنے گئی تو وہ اس کے کمرے میں چلا آیا۔

''سنا تھا دلہنیں شرماتی بھی ہیں؟'' اس نے اپنے لبوں سے پھوٹتی مسکراہٹ کو بمشکل دبایا اور بولا۔

''جو شرماتی ہیں وہ دلہنیں ہوتی ہیں میں دلہن نہیں ہوں۔'' وہ دو قدم اور آگے بڑھا۔

''تو پھر تم کون ہو؟''

''میں'' اس کو کوئی جواب نہ سوجھا اس لیے خاموش رہی۔ وہ بولا۔

''تم برسوں سے اس دل کی آرزو ہو۔ تم اس چاند کی چاندنی ہو۔ تم اس آنگن کا کھلنے والا پھول ہو۔ تم وہ بلی ہو جس کو میری ماں نے میرے لیے پالا ہے۔''

''بکواس نہ کرو۔'' وہ آہستہ سے بولی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔
''کیوں نہ کروں؟'' وہ فرش پر دوزانو اس کے سامنے بیٹھ گیا۔
''یہ بکواس آج بھی نہ کروں تو کب کروں؟''
''جب تم لمبی چھٹی لے کر آؤ گے۔ دھوم دھام سے شادی کرو گے۔ لمبے ہنی مون ٹرپ پر جاؤ گے تب کرنا یہ ساری بکواس۔''
''تب تک تو اور بھی بہت سی باتیں جمع ہو جائیں گی۔ ابھی والی ابھی کر لینے دو ناں۔'' وہ گھٹنوں پر رکھے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر ملتجی انداز میں بولا۔
''زندگی میں چاہے اور جتنی بھی بہاریں آئیں یہ دن اور لمحے تو لوٹ کر نہیں آئیں گے، نہیں آئیں گے ناں۔'' کیپٹن عبداللہ نے جیسے اس سے تصدیق چاہی تو اس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔
''تو پھر مجھے اجازت دو کہ میں تمہارے ہاتھوں کے اس پیالے میں اپنا چہرہ رکھ کر تھوڑی دیر آنکھیں موند سکوں۔ کیا کبھی کسی درخت نے کسی تھکے ہوئے سے یہ کہا ہے کہ جاؤ پیچھے ہٹو میں تمہیں ستانے کے لیے اپنا سایہ نہیں دیتا۔''
وہ کچھ نہ کہہ سکی پھر ہلکی ہلکی بڑھتی ہوئی شیو والا چہرہ اس کے ہاتھوں میں سما گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد آنکھیں موندے موندے بولا۔
تم جانتی ہو عائشہ جب میں اس بار جاؤں گا تو مجھے کوئی خوف نہیں ہوگا۔ پہلے جب جاتا تھا تو مجھے یہ خوف لگا رہتا تھا کہ اچانک اماں کو تمہاری شادی کرنا پڑ جائے گی۔ جب میں گھر آؤں گا تو تم نہیں ہو گی یا پرانے زمانے والے ڈاکو گھوڑوں پر آئیں گے اور ڈاکوؤں کے سردار کو تم سے پہلی ہی نظر میں محبت ہو جائے گی اور وہ تمہیں اُٹھا کر لے جائیں گے اور میں ساری زندگی تمہیں کھوجتا کھوجتا آخر کار مر جاؤں گا۔'' عبداللہ کی یہ باتیں سن کر وہ مسکرا دی۔
''میں نہیں جانتی تھی کہ کیپٹن عبداللہ اتنا پاگل ہے۔'' وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔
''اب تم اماں کو یہ سمجھا سکتی ہو کہ شہابی گالوں والی پٹھان لڑکیاں میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں اور ہاں یہ بھی سمجھا دینا کہ جوان کے ساتھ ہوا وہ محض ایک اتفاق تھا۔''
''وہاں حسن ہے تو سہی مگر شٹل کاک برقعہ بھی ہے، ورنہ تم جیسے پاگل وہاں سے دیوانے ہو کر ہی لوٹیں۔'' وہ مطمئن سی ہو کر بولی۔
''میں بھی کہوں اماں کی تو راتوں کی نیندیں حرام ہوئی پڑی ہیں اور یہ بی بی بڑی مطمئن پھرتی ہے۔ اب پتا چلا تمہیں مجھ پر نہیں ان کے شٹل کاک برقعوں پر بھروسا ہے۔'' کیپٹن عبداللہ نے اسے تیکھی نظروں سے گھورا۔ عائشہ نے مسکراتے ہوئے کندھے اچکائے تو وہ بھی ہنسنے لگا۔
''بڑی خراب ہو تم۔''
''تم سے تو کم ہوں۔'' عائشہ نے جواب دیا۔
''ہاں مجھ سے کم ہو۔'' وہ اچانک اٹھا اور اس کی پیشانی پر نرمی سے ایک بوسہ دیا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔
پریشان ششدر سی بیٹھی عائشہ نے اپنی پیشانی کو چھوا جو کہ دہکنے لگی تھی۔ یکدم وہ جھرجھری سی لے کر حال میں واپس آ گئی تھی۔
''کیپٹن عبداللہ چلا گیا اور مجھے لگا سورج میری پیشانی پر چمکنے لگا ہے۔''
☆......☆......☆
شام پر تیزی سے رات چھا گئی تھی۔ بینچ پر بیٹھے وہ دونوں چائے کے خالی کپوں کی مانند تھے جن کے اندر کی گرمی زائل ہو گئی تھی۔ وہ یوں کب سے

خاموش بیٹھی تھی جیسے برسوں سے ایک لفظ بھی نہ بولی ہو۔ عمر فاروق کی نظریں اس کی چادر سے ڈھکی پیشانی پر ٹکی تھیں جہاں سورج چمکتا تھا اور اس کے کانوں میں ایک ہی جملہ بار بار ٹکرا رہا تھا۔

''مجھے لگا جیسے سورج میری پیشانی پر چمکنے لگا ہے۔'' عمر فاروق اس کی سکوت کو توڑنا نہ چاہتا تھا مگر یہ اس کے اختیار کی بات نہ تھی اسے نہ چاہتے ہوئے بھی بولنا پڑا۔

''عائشہ! کیا کیپٹن عبداللہ لوٹ کر آیا تھا؟'' افق پر نظریں جمائے جیسے وہ کسی دھیان کے عالم میں بولی۔

''آیا تھا! اس دن اس نے تازہ شیو کی ہوئی تھی اور اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔'' عائشہ نے اپنا چہرہ جھکایا تو آنکھ سے ایک موتی پھسل کر مٹی پر گرا اور بے مول ہو گیا۔

''تائی روتی تھی اور کہتی تھی کہ میں نے اپنا بیٹا محاذ جنگ پر تو نہ بھیجا تھا۔'' اس کی آنکھ سے سچے موتیوں کی جھڑی لگ گئی تھی۔

''دشمن کے خلاف جنگ ہوتی تو میں کہتی میرا بیٹا شہید ہو گیا ہے۔ مگر اب کیا نام دوں؟ اپنے بیٹے کی موت کو کیا کہوں کہ بھائی بھائی سے لڑتا ہوا مارا گیا۔'' روتی ہوئی اس لڑکی کے آنسو قطرہ قطرہ تیزاب کی صورت میں عمر فاروق کے دل پر گر رہے تھے۔ عائشہ نے اپنے ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو صاف کیے اور بولی۔

''مجھے لگتا ہے تائی زندہ نہیں رہیں گی۔ میں انہیں روک بھی تو نہیں سکتی۔ میں تو کبھی کسی کو نہ روک سکی۔ نہ اپنی ماں کو نہ اپنے باپ کو اور نہ ہی کیپٹن عبداللہ کو۔ اب مجھے لگتا ہے کہ تائی بھی زندہ نہیں رہیں گی۔ تمہیں کیا لگتا ہے میری تائی زندہ رہیں گی؟'' اس نے اچانک عمر فاروق سے سوال کیا۔ وہ

اس کو تسلی کے لیے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر وہ ایسا نہ کر پایا اس نے صرف اثبات میں سر ہلایا۔

وہ مطمئن سی ہو کر سامنے دیکھنے لگی۔ وہ کچھ دیر بیٹھی پھر اٹھی اور اسپتال کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئی۔ عمر فاروق اس کے جانے کے بعد کتنی دیر اسی طرح بیٹھا رہا۔ اس کا ذہن کچھ بھی سوچنے کے قابل نہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بوجھل دل لیے اندر چلا گیا۔

☆......☆......☆

''کہاں تھے میاں تم؟ میں کب سے آیا بیٹھا ہوں۔'' چچا پھلوں کے شاپر لیے عثمان کے بیڈ پر بیٹھے تھے۔ عثمان نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو پکڑے گئے نا بچو!''

''کہیں نہیں چچا! بس ذرا باہر تازہ ہوا کھانے گیا تھا۔'' اس نے صفائی دی۔

''پھر تو لگتا ہے ساری ہی کھا کر آئے ہو گے۔'' انہوں نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا عمر فاروق کھسیانا ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''وہ لڑکی کون بیٹھی تھی تمہارے ساتھ؟'' چچا نے پوچھا تو عثمان کی آنکھیں اُبل کر گرنے والی ہو گئی تھیں۔

''یہاں اس کی تائی ایڈمٹ ہے۔'' عمر نے جواب دیا۔

''تمہارے ساتھ بیٹھی کیا کر رہی تھی؟'' چچا نے دوسرا سوال داغا۔

''ایک تو ٹانگیں تڑوا کر پڑا ہے مجھے لگتا ہے تمہارا بھی کچھ ایسا ہی پروگرام ہے۔''

''چچا آپ پریشان نہ ہوں، میرا ایسا کوئی پروگرام نہیں ہے۔'' اس نے انہیں تسلی دی پھر چچا کے جانے کے بعد عثمان نے سوالوں کی بھر مار کر دی۔

''یہ ابا کیا کہہ رہے ہیں۔ کون تھی وہ لڑکی؟ تیرے ساتھ بیٹھی کیا کر رہی تھی۔ اور شکل سے تو تُو ایسا نہیں لگتا اور یہ بھی مشکل ہے کہ کوئی لڑکی تجھے لفٹ کرا دے...... سچ بتا! آخر ماجرا کیا ہے؟''

عمر فاروق گُپ چُپ اسے دیکھ رہا تھا۔ عثمان گھنٹہ بھر اس سے سر پھوڑتا رہا۔ مگر عمر کی ظاہری حالت میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس کے سامنے پھلوں سے بھرا شاپر پڑا تھا مگر اس نے اس کو نظر بھر کر بھی نہ دیکھا کبھی کبھی کیسے چیزیں اپنی اہمیت کھو دیتی ہیں۔ وہ چشمِ تصور سے کیپٹن عبداللہ کی پورے اعزاز کے ساتھ کی جانے والی تدفین دیکھ رہا تھا۔

☆☆......☆☆......☆☆

صبح نہ جانے کب اس کی آنکھ کھلی شاید صبح کی پہلی کرن سے بھی پہلے مگر وہ یونہی آنکھیں بند کیے پڑا رہا اور ابھی وہ اٹھنا نہ چاہتا تھا مگر عثمان نے اسے آوازیں دے دے کر اس کی ناک میں دم کر رکھا تھا۔

''میری بھوک سے جان نکل رہی ہے۔ مجھے جلدی سے کھانے کے لیے کچھ لا کر دو۔'' عمر کو اٹھتا دیکھ کر عثمان نے حکم صادر فرمایا۔ عمر فاروق نے پھلوں کا شاپر اس کے آگے رکھا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ کمرے کے اندر عثمان غصے سے تلملا رہا تھا۔ عمر کپڑوں کو ٹھیک کرتا بڑے ہال کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے اپنے بالوں میں انگلیاں چلا کر بال درست کیے اور کمرہ نمبر تیس کے دروازے پر دستک دی۔

ایک نوجوان نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور پھر پورا دروازہ کھول کر بولا۔

''جی فرمایئے۔'' کمرے کے اندر ایک ادھیڑ عمر آدمی لیٹا ہوا تھا اور اسے تقریباً وہی آلات لگے ہوئے تھے جو کہ عائشہ کی تائی کو لگے ہوئے تھے۔ عمر فاروق پریشانی سے بولا۔

''یہاں ایک مریضہ خاتون تھیں وہ کہاں گئیں؟''

''مجھے خبر نہیں! ہم تو آج صبح ہی اس کمرے میں شفٹ ہوئے ہیں۔ آپ کسی نرس سے پوچھ لیں۔'' لڑکے نے جواب دیا۔ عمر فاروق پلٹا۔ دو نرسیں ہال میں کسی بات پر ہنستی ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ دوڑ کر اُن کی طرف گیا۔

''بات سنیں۔''

''جی۔'' وہ رُک گئیں۔

''جی وہ کمرہ نمبر تیس میں ایک مریضہ تھیں۔ وہ کہاں گئیں۔'' ان دونوں میں سے جو بڑی تھی اس نے سوال کیا۔

''آپ ان کے رشتے دار ہیں؟''

''جی! یہی سمجھ لیں۔'' عمر نے جواب دیا۔

''ان کی تو رات کو ڈیتھ ہوگئی تھی۔ ان کے ساتھ جو لڑکی تھی وہ اُن کی ڈیڈ باڈی لے کر چلی گئی۔''

عمر فاروق نے حیرت سے دہرایا جبکہ وہ دونوں باتیں کرتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔

کتنی ہی دیر وہ ہال میں اسی جگہ کھڑا رہا۔ کتنے ہی لوگ اس کے پاس سے گزرتے رہے مگر اس کے ذہن میں ایک ہی جملے کی تکرار ہوتی رہی، چلی گئی۔

یک دم اسے کسی نے پکارا۔ چچا ہاتھ میں ٹفن لیے کھڑے تھے۔

''تم یہاں اس طرح کیوں کھڑے ہو؟''

''ویسے ہی۔'' اس نے ٹالتے ہوئے کہا۔

''کمرے میں آؤ۔'' وہ حکم صادر کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

عمر فاروق اُن کے پیچھے جانے کی بجائے باہر لان میں آ گیا۔ وہ درخت کے نیچے اسی بینچ پر بیٹھ گیا۔ جہاں اس نے عائشہ کے ساتھ کچھ پل گزارے تھے۔

☆☆......☆☆......☆☆

ناولٹ

فوزیہ احسان رانا

لمحوں نے خطا کی تھی

رحمٰن چیک لکھ لکھ کر دیتا جارہا تھا۔ وہ اپنی پسند کی رقم لکھتی جارہی تھی۔ بلکہ دوسرے لفظوں میں رقم اریز اپنی مرضی سے لکھتا تھا۔ فروا اور اریز ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہوچکے تھے۔ بغیر نکاح کے ایک دوسرے کے ہوگئے تھے۔ فروا کو کبھی کبھی......

اُس دوشیزہ کی کتھا، جس کی ایک لمحے کی خطا نے اُس کی ساری زندگی کو مجسم خطا بنا ڈالا تھا **چھٹی کڑی**

نایاب لودھی کو کالج سے نکال دیا گیا تھا کیونکہ اُس نے کالج میں بنائے گئے قوانین کی خلاف ورزی کی تھی اور بجائے شرمندہ ہوکر اپنے اساتذہ کی بات ماننے کے، اوپر سے بدتمیزی کی، کالج میں ہنگامہ کیا۔

اگلے دن وہ دیدہ دلیری سے پھر چلا آیا مگر اسے کلاس میں گھسنے نہیں دیا گیا تو وہ ہاتھا پائی پر اُتر آیا۔ وہ زبردستی کلاس میں بیٹھنا چاہ رہا تھا، کوئی حد تھی ڈھٹائی کی بھلا۔ کوئی لحاظ ومروت نہیں۔ کوئی احترام نہیں، منہ پھاڑے جو دل میں آتا، کہے جارہا تھا۔ اُس کے گھر پرنسپل نے فون کیا تھا اور پھر نایاب کی ماں کالج آئی تھی اور آتے ہی گلا پھاڑ پھاڑ کر جو اُس نے بددعائیں اور کوسنے دینے شروع کیے سب ٹیچرز حیرت سے اُس آدھی تیتر آدھی بٹیر عورت کو دیکھنے لگے۔ جسے تمیز وتہذیب چھو کر بھی نہیں گزرے تھے۔

موٹی بھدی عورت دوپٹے سے بے نیاز تنگ کپڑوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ ماڈرن بننے کی کوشش میں وہ کیسی مضحکہ خیز چیز بن گئی تھی، وہ یقیناً قطعی بے خبر تھی...... یا اُسے پروا نہیں تھی۔

وہ جاہل عورتوں کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر اپنی امارت کا مظاہرہ کررہی تھی۔ چیخ چیخ کر بتارہی تھی کہ اُن کے کتنے مربعے زمین ہے اور یہ کہ اُن لوگوں کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ نایاب کو کالج سے نکالنے کی صورت میں پرنسپل اور کالج کے متعلقہ عملے کے ساتھ کیا کیا کروایا جاسکتا ہے۔

'جیسی کوکو...... ویسے بچے......' سب کو سمجھ آچکی تھی۔ نایاب شتر بے مہار تھا اور کیوں تھا اب اُس کی 'ماڈرن' مما کو دیکھ کر اساتذہ ہی نہیں گرلز و بوائز بھی اچھی طرح جان چکے تھے۔ سب لڑکیاں ہونٹوں پر ہاتھ جمائے جھینپی جھینپی ہنسی ہنس رہی تھیں اور عروہ کی ہنسی تو رُک ہی نہیں رہی تھی۔

نایاب کی مما کی حرکتیں ایسی تھیں کہ عروہ کے اندر سے قہقہوں کے فوارے پھوٹ رہے تھے۔

مگر ضویا کے ٹہوکے اور مسلسل گھوریاں عروہ کو خود پر ضبط رکھنے پر مجبور کر رہے تھے۔

جیسے ہی نایاب اور اُس کی ماں کی گاڑی کالج گیٹ سے باہر نکلی تو سب نے جیسے جھرجھری سی لی۔ سارے مجمع پر سناٹا سا چھایا رہا تھا۔ اب سارا ہجوم منتشر ہو گیا، اساتذہ کے وہاں سے ہٹتے ہی سب بولنے لگے۔ کوئی کچھ کہہ رہا تھا کوئی کچھ۔ عروہ بس دل کھول کر ہنسے جا رہی تھی۔ ہنستے ہوئے سر آگے کی جانب جھکائے بے حال ہو رہی تھی۔

''بس کرو یار، کیا ہو گیا ہے، پاگل ہو گیا۔'' ضویا نے خفگی سے عروہ کو دیکھا جس کی آنکھیں پانیوں سے لبریز ہو کر چھلک رہی تھیں۔ وہ تا حال ہنسے جا رہی تھی۔

''وہ نایاب کی مما...... اُووف...... اپنے آپ کو دنیا کی امیر ترین ہستی سمجھ رہی تھی۔ اُن کو ہم سب، ہمارے اساتذہ اپنے سامنے کیڑے مکوڑے لگ رہے تھے۔''

''اور لگ کیسی رہی تھیں، مما تو لگ ہی نہیں رہی تھیں۔ ضویا بولی۔

''مطلب! مما نہیں لگ رہی تھیں۔'' عروہ نے سوالیہ نگاہیں ضویا پر جما دیں۔

''کرائے پر خریدی ہوئی نقلی مما لگ رہی تھیں، جیسے فلموں میں ہیرو کسی بھی ایمر جنسی کی صورت میں ایک عدد مما رینٹ پر لے لیتا ہے، جو اپنا کردار نبھا کر چلی جاتی ہے۔''

''وری فنی۔'' عروہ نے ہاتھوں کی پشت سے اپنی گیلی آنکھیں رگڑیں۔

''اور کیا ماں تو سادہ سی اچھی لگتی ہیں، اپنے بچوں کو غلط کاموں پر سرزنش کرنے والی روکنے والی، نہ کہ نایاب کی مما کی طرح بڑھ چڑھ کر حمایت کرنے والی، ایسی مائیں قابلِ نفرت ہوتی ہیں جو بچوں کی اصلاح کی بجائے اُن کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔'' ضویا کو حقیقتاً دکھ ہوا تھا اور ایسی ماں کو دیکھنا بھی اُس کی زندگی کا پہلا اتفاق تھا۔

''ویسے ضویا ایک بات ہے، نایاب کی مما اِس وقت بہت خوش ہوں گی، اور اپنی خوشی کا اظہار بہت ہی زعم بھرے انداز میں اپنے افرادِ خانہ کے سامنے کر رہی ہوں گی، مثلاً وہ کہہ رہی ہوں گی ارے میں نے بھی کالج والوں کو ایسی بے نقط سنائی ایسی...... ایسی کہ مانو سب کو سانپ ہی سونگھ گیا۔ بولتی بند ہو گئی۔ پورے کالج پر سناٹا چھا گیا۔ کسی کی ہمت ہی نہیں ہوئی کہ کوئی چوں چرا کر سکے۔'' عروہ نے چہرے کے زاویے بگاڑ بگاڑ کر اُس عورت کی نقالی کرنے کی کوشش کی، ضویا بے ساختہ ہنسی عروہ کی اس حرکت پر۔

''ہاں خوش فہمی میں مبتلا ہوں گی وہ محترمہ کہ اُن کے رعب حسن سے مرعوب ہو کر سب گونگے کا گڑ کھا کر کھڑے اُن کا منہ تکتے رہے اور اُن کی فصیح و بلیغ گفتگو سنتے رہے۔''

''اور وہ اپنی زمینوں کی مربعوں کی یوں بڑھکیں مار رہی تھیں جیسے کھڑے کھڑے سارے اساتذہ کو خرید کر اپنا غلام بنا سکتی ہیں، اُن کو ایک بار بھی ندامت محسوس نہیں ہوئی۔ انہوں نے ایک بار بھی اپنے بیٹے کی غلطی نہیں مانی، ایسی ماؤں کا اپنی اولاد کو خراب کرنے میں بہت ہاتھ ہوتا ہے ناعاقبت اندیش عورت۔''

ایسی بات ضویا ہی کر سکتی تھی۔ عروہ کے بس کی بات کہاں ایسی گفتگو کرنا، اُس کے تو اپنے گھر میں بہت بدنظمی تھی۔ سب اپنی اپنی من پسند زندگی گزار رہے تھے۔ سب نے یہ موٹو اپنا رکھا تھا 'جیسے چاہو جیو' اور گھر کی سرپرست ماں ہی جب حد درجہ

لاپروا اور بے خبر ہو گھریلو ذمہ داریوں سے۔ تو اولاد کے تو پھر کیا کہنے۔

کالج کے اساتذہ عجیب تناؤ کا شکار ہو کر رہ گئے تھے۔ ایسی اول فول بکتی عورت کو وہ جواباً کیا کہتے جبکہ وہ کچھ سننے پر آمادہ بھی نہیں، اپنی اونچی آواز میں اپنا ہی راگ الاپ کر چلی گئیں، ہوا تو کچھ بھی نہیں، بات وہیں کی وہیں تھی نایاب کو کالج سے نکال دیا گیا تھا۔

☆......☆......☆

لبنیٰ گھر آ گئی تھی۔ اُس کی طبیعت اب بہتر تھی مگر ایک چپ اُس کے ہونٹوں پر قفل کی مانند لگ چکی تھی۔ بستر پر لیٹی چھت کو تکتی رہتی، آنکھیں ہر ایک کو بے گانگی سے دیکھتیں، ایسا لگتا تھا جیسے لبنیٰ کی آنکھیں پہچان کے سارے رنگ کھو چکی ہوں بے تاثر، بے رنگ آنکھیں۔ فاخرہ لبنیٰ کا خیال رکھتی تھی، کبھی کبھی گھر کا چکر بھی لگا لیتی تھی۔

امن لبنیٰ کے سامنے نہیں جاتی تھی۔ ندامت اُس کے قدم جکڑ لیتی، احساسِ زیاں اُسے ہمہ وقت کچو کے لگاتا رہتا۔ زندگی ساکن جھیل کی مانند ہو گئی تھی، رُکی ہوئی ٹھہری ہوئی۔

امن کی ذہنی حالت ابتری کا شکار تھی۔ وہ نظریں جھکائے فرقان کے سامنے جاتی تھی۔ کوشش کے باوجود وہ نظریں اُٹھا نہیں پاتی تھی، نظریں ملانے کے قابل نہیں رہی تھی وہ۔

ڈاکٹر نے بغیر گھی کھانا دینے کی ہدایت کی تھی اس وقت دوپہر کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ فاخرہ کھانا تیار کر چکی تھی۔ اب لبنیٰ کے لیے الگ سے بغیر گھی اور مرچ مرغی کا سالن بنا رہی تھی تبھی امن اُس کے پاس آن کھڑی ہوئی۔

''آنٹی میں مدد کراؤں۔'' اُس نے دھیرے سے کہا فاخرہ نے ایک نظر امن کو دیکھا۔

''نہیں بیٹا، سب کام ہو گیا، تم لبنیٰ کے پاس جا کر بیٹھا کرو۔''

''نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولی چہرے پر ہراس پھیل گیا۔

''بیٹا، ایسا نہیں کہتے، لبنیٰ بیمار ہے خیال رکھو اُس کا، ماں ہے وہ۔''

''مجھے بہت شرم آتی ہے، میں اُن کا سامنا کس منہ سے کروں۔'' امن رو دی۔ چند ثانیے فاخرہ چپ کی چپ رہ گئی، کچھ بول ہی نہیں سکی۔

''ماں کا دل بہت نرم و گداز ہوتا ہے، اپنی ماں سے معافی مانگ لو، وہ تمہیں معاف کر دیں گی۔'' فاخرہ کا لہجہ بھرا کر رہ گیا اُس کی آواز میں بہت سے درد جھلک رہے تھے۔

''مما مجھے کبھی معاف نہیں کریں گی آنٹی، میرا دل کہتا ہے۔''

''مجھے بھی معاف نہیں کیا تھا، مجھے سزا دی تھی لمبی، طویل کبھی نہ ختم ہونے والی۔'' فاخرہ بڑبڑائی جیسے کوئی خود کلامی کرتا ہے مگر امن سن چکی تھی۔

''آنٹی آپ نے کیا کیا تھا؟'' امن نے ذرا تامل کیا اور جھجک کر پوچھا۔

''ہاں میرا جرم بھی محبت ہے اور جرم کی سزا تو کڑی ہی ملا کرتی ہے۔''

''کیا ہوا تھا ایسا......'' امن اٹکی۔

''بتاؤں گی۔''

''آنٹی میں تو سجاد سے محبت کرنے لگی تھی۔ اُس کی خوبروئی کی ایسی اسیر ہوئی کہ اُس کے سامنے میں اندھی ہو جاتی تھی۔ مجھے اُس کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ ہر طرف وہی دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اُس کی ظاہری ساحرانہ کشش دیکھی، مرعوب ہو کر اپنا آپ بھلا بیٹھی۔'' امن کی آنکھوں کی سطح پر بے بسی کے شدید احساس کے

ہمراہ نمی چمکنے لگی۔ اُس نے ضبط کی کوشش میں اپنے لب کچل ڈالے۔

''بس بیٹا محبت ایسا ہی بے اختیاری جذبہ ہے محبت بہت طاقتور جذبہ ہے محبت خدا کا دوسرا روپ ہے۔ دلوں کے رابطے چپکے سے بندھ جاتے ہیں ہم بے خبری میں یارے جاتے ہیں۔ محبت سکون ہوتی ہے اُجالا ہوتی ہے مگر بربادی اور بے سکونی کی ابتدا تب ہوتی ہے جب محبت میں ہوس آن گھستی ہے۔'' فاخرہ نے طویل سرد آہ بھری اور کچھ ثانیے خاموش ہوگئی۔ دونوں کے درمیان اضطراب بھری خاموشی کا تاثر رینگنے لگا۔

''میں اُسے مسیحا سمجھی تھی محافظ سمجھی تھی مگر وہ اتنا چالباز اور مکار ہوسکتا ہے مجھے ایسا خیال بھی چھو کر بھی نہیں گزرا۔ اُس نے بہروپ بھر کر مجھے دھوکا دیا۔ بھیس بدل کر مجھے لوٹ لیا۔ میں اُس کی فطرت اور عزائم سے آگاہ نہیں تھی۔ میں نے اپنی آبرو کھودی۔ میں نے اپنی زندگی کے قیمتی خزانے کھودیے۔ کاش میں اُس دن اُس کے ساتھ نہ جاتی، میں غفلت میں خوار ہو کر رہ گئی۔ مجھے لگتا ہے مجھے مرجانا چاہیے۔''

اُس کی سانس تیز ہونے لگی۔ وہ اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ فاخرہ نے آگے بڑھ کر اُسے ساتھ لگالیا۔ فاخرہ اُس کی درد آشنا تھی، جانتی تھی کہ امن کی آنکھوں نے ابھی بہت خون رونا ہے۔ وہ اُسے کیسے دلاسا دیتی، کیسے صبر کی تلقین کرتی۔

کوئی اپنا پیارا مرجائے تب بھی صبر آنے میں بہت وقت لگتا ہے اور کھو جانا تو برسوں کرب و اذیت میں مبتلا رکھ کر ٹیسیں دیتا ہے۔ اُس نے تو بہت انمول چیز کھوئی تھی پھر صبر جیسا لفظ امن کی وحشتوں کے آگے کتنا بے معنی اور حقیر ہوتا۔

امن نے اعتبار کھویا تھا، عزت کھوئی تھی پھر...... پھر...... فاخرہ اُسے کن لفظوں میں مایوسی سے نکلنے کا راستہ بتاتی۔ کیسے حرفوں میں اُس کی ہمت باندھتی کہ امن کا ملال ڈھل جاتا۔

اُس کا نقصان ناقابلِ تلافی تھا۔ دنیا کے ہزار اچھوتے جملے بھی اُس کا خسارہ مٹا نہیں سکتے تھے۔ پورا نہیں کر سکتے تھے بھلا نقصان وہ بھی ایسا جان لیوا کیسے درد کیسی وحشت میں مبتلا کرتا ہے یہ واضح بتانے کی بات تو نہیں ہے۔

☆......☆......☆

نجانے رات کا کون سا پہر تھا جب سیل فون کی مسلسل بجتی بیل پر امن کی آنکھ کھلی تھی۔ کچھ دیر تو وہ سوئی جاگی کیفیت میں رہی۔ اُس کے حواس ماؤف تھے تبھی فون پھر آنے لگا۔ 'سجاد بلوچ'۔

امن کے خوابیدہ حواس جاگ گئے اُس نے چور نظروں سے کمرے میں دیکھا۔ حذیفہ اور ہنزلا سوئے ہوئے تھے، امن کا دل خوفزدہ و سراسیمہ ساپتے کی مانند لرزنے لگا۔ اُس کے چہرے پر تاریک سا سایہ لہرانے لگا۔ اُس نے ڈر سے لرزیدہ ہاتھ کا انگوٹھا بٹن پر رکھ کر کال کاٹ دی۔

اُس کا بدن پسینے میں شرابور تھر تھر کانپ رہا تھا، تبھی فون پھر آنے لگا۔

وہ ساکت و صامت سیل فون کی اسکرین کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ اُس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ اُس درندے سے بات کرسکتی۔ جس نے اُس کا خون چوس لیا تھا۔ جس نے اُسے کسی سے نظریں ملانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ امن کی نگاہوں میں شرمندگی اور پچھتاوے بھر دیے تھے۔

طیش کی ایک بھرپور لہر امن کے اندر سے

اُمڈی اور غیظ وغضب نے اُس کے تن بدن میں سلگتا ہوا قہر بھر دیا۔ مارے اشتعال کے امن نے پوری قوت سے سیل فون دیوار پر دے مارا۔

ایک ہلکا سا ارتعاش کمرے کی فضا میں ابھرا اور ایک چھناکے سے سیل فون فرش پر گرا اور ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ امن کی سانس دھونکنی کی مانند چل رہی تھی۔ ایسے ہی تو اُس کی ہستی کے ٹکڑے ہوئے تھے۔ وہ مرتد بنادی گئی تھی۔ اُس کی نس نس زہر آلود تھی۔

وہ کڑی آزمائش سے گزر رہی تھی۔ وہ اضطرابی انداز میں ہاتھ مسل رہی تھی۔ اُس کے لب کپکپا رہے تھے۔ اُس کا نازک دل مسلسل بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ اُس پر قیامت بیتی تھی اور چاہ کر بھی وہ بھول نہیں پا رہی تھی۔ وہ سجاد بلوچ اور اُس سے منسوب ہر تلخ وشیریں یاد کو اپنے دل و ذہن سے کھرچ کر پھینک دینا چاہتی تھی مگر اُس کی ہر سعی لاحاصل ثابت ہو رہی تھی۔

امن کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا اور وہ اپنا سر تکیے پر پٹخ رہی تھی اب اُسے تمام رات یوں ہی تڑپنا تھا۔

☆......☆......☆

اگلی صبح لبنیٰ بہت سویرے اٹھی تھی۔ فجر کی نماز کے بعد جائے نماز پر بیٹھی تادیر وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں دعائیں مانگتی رہی۔ اُس کے آنسو جیسے آگ کے آنسو تھے۔ جو لبنیٰ کو جلا رہے تھے۔ اُس کے دل میں لگی آگ کی تپش کو بڑھا رہے تھے۔ آنسو رونے سے درد کہاں کم ہوتے ہیں۔

''شکر الحمدللہ'' فرقان مسجد سے نماز پڑھ کر آیا تو لبنیٰ کو نماز پڑھتے دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا۔ پچھلے بہت سے دنوں میں فرقان کے اعصاب بہت کشیدہ رہے تھے۔ وجہ لبنیٰ کی بیماری تھی۔ وہ لبنیٰ کو دیکھتے دل گرفتہ و اُداس ہو جاتا آج فرقان کا دل قدرے اطمینان پا گیا کہ لبنیٰ اب زندگی کی طرف لوٹ رہی تھی۔ فرقان تو بے خبر تھا کہ لبنیٰ کی آنکھوں نے جو دیکھا وہ اُس کا دل سہار نہیں سکا۔ بیماری تو بہانہ بن گئی ورنہ تو معاملہ ہی کوئی اور تھا جس نے اُس کی کمر توڑ ڈالی تھی۔ دل اَدھ موا کر ڈالا تھا۔ وہ ڈھے گئی، اُس کے اندر کیا کیا پکتا، اُبلتا سا لاوا تھا جو اُسے کسی کل چین نہیں لینے دیتا تھا۔

فرقان سبزی منڈی سے تازہ سبزی لینے چلا گیا۔ فاخرہ کچن میں آٹا گوندھ رہی تھی۔ تبھی امن سو کر اپنے کمرے سے نکلی۔ سامنے ہی اُس نے لبنیٰ کو جائے نماز پر بیٹھے دیکھا تو لپک کر آگے بڑھی اور جا کر لبنیٰ کے پاؤں اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے۔

''مما مجھے معاف کر دیں۔'' امن سسکی۔

''مما میں بہت بری ہوں مجھے ماریں مجھے مار ڈالیں مگر چپ مت رہیں۔ ایسے مت کریں۔ مجھے سزا دیں مما۔'' امن کا سر لبنیٰ کے پیروں پر جھک گیا اور وہ تڑپنے لگی۔

''مما...... بابا بہت کم بات کرتے ہیں۔ بہت کم کھاتے ہیں۔ اُداس سے رہتے ہیں۔ اُن کا ہنسنا بولنا ختم ہو گیا ہے۔ پلیز مما میرا نہیں تو بابا کا ہی خیال کر لیں۔ میری غلطی کی سزا سب کو مت دیں۔ مما ہنزلا اور حذیفہ بھی کملا کر رہ گئے ہیں مما...... مما مجھے معاف کر دیں۔ بہت بری ہوں میں۔'' اُس کی آہ وزاری اُس کا رنج والم میں ڈوبا انداز اُس کے آنسو سب بے کار گئے۔ لبنیٰ نے اپنے پاؤں ہٹا لیے اور اُٹھ کھڑی ہوئی امن کو دھچکا سا لگا۔ وہ بھی بے دردی سے اپنے آنسو رگڑتی اُٹھ کھڑی ہوئی لبنیٰ اپنے کمرے میں جا رہی

تھی۔ امن بھی پیچھے ہولی۔ جیسے ہی لبنیٰ کمرے میں جا کر صوفے پر بیٹھی امن نے پھر اُس کے پاؤں پکڑ لیے اور زاروقطار رونے لگی۔

''مما مجھے معاف کردیں، میرے دل پر بہت بوجھ ہے میرا دل درد سے پھٹ جائے گا۔'' لبنیٰ نے روتی بلکتی امن کو دیکھا اور اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُس کا سر پیچھے جھٹک دیا۔

'' کیوں کردوں میں تمہیں معاف، بتاؤ کیوں کروں معاف! میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ دفع ہوجاؤ، میری نظروں سے دور ہوجاؤ۔'' کیسی کاٹ تھی کیسا درد تھا۔

''مما مجھے معاف کردیں بابا کی خاطر۔''

''تمہیں اتنی فکر ہوتی بابا کی، اپنے بھائیوں کی، اس گھر کی عزت کی تو تم ایسی حرکت کبھی نہ کرتیں۔ کیا تمہارا ایک لفظ معافی میرے دل میں پڑی دراڑوں کو پُر کرسکتا ہے کبھی نہیں۔''

''مما......''

''جاؤ دور ہوجاؤ، چلی جاؤ ورنہ میں خود کو مار ڈالوں گی۔'' لبنیٰ کی آواز تیز ہوگئی۔ اُس کا فشار خون بلند ہونے لگا۔ فاخرہ لبنیٰ کی تیز آواز سُن کر اندر آئی اور امن کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ امن وہیں ڈھیٹائی سے کھڑی۔ رہی لبنیٰ کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔

''امن جاؤ بیٹا باہر جاؤ۔'' فاخرہ نے سختی سے کہا تو امن بے چارگی سے باری باری دونوں کو دیکھتی باہر چلی گئی۔ فاخرہ نے لبنیٰ کو پانی پلایا اور سہارا دے کر لٹا دیا۔

فاخرہ امن کے حوالے سے لبنیٰ کے ساتھ کوئی بات کر کے اُس کی خودی کا بھرم نہیں توڑ سکتی تھی، وہ خود کوئی بات کرے تو کرے۔ فاخرہ لبنیٰ کی آنکھوں سے بہتے اشک دیکھ کر اُس کی اذیت سمجھ رہی تھی۔

☆......☆......☆

صبا نے نیہات ضمیر کے کوچنگ سینٹر میں پڑھانا شروع کردیا تھا۔ وہ اسکول جانے سے پہلے بشیراں کے ساتھ مل کر ناشتا بناتی، فضا اسوہ اور اسد کو اسکول کی تیاری کرواتی پھر سارے بہن بھائی اسکول چلے جاتے بشیراں کے منع کرنے کے باوجود صبا جاتے جاتے ناشتے کے برتن دھو جاتی۔

بشیراں اور زمان گھر میں اکیلے رہ جاتے۔ زمان چپ چاپ لیٹا رہتا ناشتا کرتا پھر لیٹ جاتا۔ بشیراں دوپہر کا کھانا بنانے لگ جاتی۔ اسکول سے آنے کے بعد صبا اور فضا مل کر گھر کی صفائی کرتیں۔ کھانا کھانے کے بعد برتن دھو کر کوچنگ سینٹر وہ چاروں بہن بھائی چلے جاتے تھے۔ ضویا اور صبا چھوٹی کلاسز کے بچوں کو پڑھاتی تھیں۔ جب کہ نیہات نویں اور دسویں کے بچوں کو پڑھاتا تھا۔

صبا کو اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوا تھا کہ وہ اپنے بہن بھائیوں پر نظر رکھ سکتی تھی۔ اپنی نگرانی میں اُن کا ہوم ورک چیک کرتی تھی۔ دوسرا نیہات نے اُس کو ایک مناسب سی رقم بھی پے کے طور پر دینے کا وعدہ کیا تھا اور اس میں تو کوئی شک نہیں تھا کہ نیہات ضمیر اپنے عمل میں باعمل لڑکا تھا اچھا سچا اور کھرا انسان۔

''میرے ساتھ کوئی تمہیں ملنے آیا ہے صبا۔'' ضویا نے اپنے ساتھ کھڑی عروہ کی طرف اشارہ کیا صبا کی آنکھوں میں شناسائی کی ہلکی سی چمک اُبھری۔

''عروہ ہیں نا آپ۔'' صبا نے جھٹ سے کہا۔

''ہاں...... مگر تمہیں کیسے پتا...... آئی تھنک ہم باقاعدہ ملے تو نہیں۔''

''مگر مجھے پتا ہے، میں نے آپ کو دیکھا ہے۔'' صبا اپنی جگہ سے اٹھی اور عروہ سے گلے ملی اس وقت وہ نیہات کے کوچنگ سینٹر میں تھیں۔ عروہ بہت پُرجوش تھی صبا سے ملنے کے لیے۔ نیہات نے کولڈ ڈرنکس منگوالی تھیں۔ صبا نے فضا اسوہ اور اسد سے بھی عروہ کو ملوایا۔ خوبصورت مؤدب سے سارے بہن بھائی بلا کے پُراعتماد تھے۔

عروہ کی نظریں صبا کے چہرے سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔ وہ باتیں کم کر رہی تھیں اور ایک دوسرے کو تکے جا رہی تھیں۔ باتیں وہ کیا کر سکتی تھیں۔ کزنوں والی مخصوص بے تکلفی مفقود تھی۔ باتوں کے درمیان امن کا ذکر نکل آیا۔

''صبا امن بہت دنوں سے کالج نہیں آ رہی، کچھ پتا ہے۔'' عروہ کے اشارہ کرنے پر ضویا نے پوچھا۔

''لبنیٰ آنٹی بیمار ہیں اس وجہ سے امن آپی بہت پریشان ہیں۔''

''ارے کیا ہوا آنٹی کو، ایک دم سے کیسے بیمار پڑ گئیں۔'' ضویا فکرمند ہو گئی۔

''پتا نہیں، یک دم دل میں درد اٹھا تھا پھر چاچو اُن کو ہاسپٹل لے گئے تھے۔ اُن کی حالت کافی خراب تھی، ہم سب گئے تھے۔ میری مما ابھی بھی اُدھر ہی ہیں۔''

''اوہ نو، عروہ کیا تم لوگ اتنے بے خبر ہو کہ پڑوس میں رہنے کے باوجود تم اور تمہاری فیملی کے لوگ نہیں جانتے کہ امن کی مما اتنی بیمار رہی ہیں۔ ویری سیڈ۔'' ضویا نے تاسف سے عروہ کو کہا۔ عروہ نے واضح نظریں چرائی تھیں۔

وہ باخبر تھی مگر رحمان نے سختی سے منع کر رکھا تھا۔ وہ کیا بتاتی۔ اور اب اُسے احساس ہو رہا تھا اور شرمندگی بھی...... ضویا امن کا نمبر ملا رہی تھی۔

''امن کا نمبر بند جا رہا ہے......'' ضویا نے تاسف سے سر ہلایا۔

''مجھے ملنا ہے امن سے، اوہ میرے خدا امن اتنی پریشان رہی اور ہم...... دوستی کا دعویٰ کرنے والے۔'' ضویا کا ملال کم ہی نہیں ہو رہا تھا۔

''آپ ضرور جائیے گا ضویا آپی، دکھ درد میں اپنوں کو اپنے ہونے کا احساس ضرور دلانا چاہیے۔ دوستی دکھ درد بانٹ لینے کا ہی نام ہے۔ دوستوں کو آپ کی ضرورت ہوتی ہے، محبت بھرے اپنائیت سے بھرپور لفظ زخموں پر مرہم کا کام کرتے ہیں۔'' صبا رسانیت سے کہہ رہی تھی عروہ خاموش تھی اور حیرت زدہ بھی کہ صبا چھوٹی سی لڑکی اتنی گہری باتیں کیسے کر رہی ہے۔

''کیا ہوا امن کو......'' نیہات کے کانوں تک بھی بات پہنچی تھی، وہ بھی امن کے کالج نہ آنے کی وجہ سے پریشان تھا مگر کس سے پوچھتا...... صبا سے پوچھتے جھجک مانع آتی۔

''عروہ جائے نہ جائے اِن کا ذاتی معاملہ ہے مگر صبا میں اُن کے گھر جانا چاہتی ہوں۔ تم چلو گی میرے ساتھ۔''

''میں لے چلوں گا تم لوگوں کو......'' نیہات نے دھیرے سے کہا۔

''ریئلی......'' صبا اور ضویا یک زبان بولیں۔ اُن کی خوشی دیدنی تھی کہ نیہات اُن کو لے کر جائے گا۔ عروہ کا امن سے اور اُس کی فیملی سے خون کا رشتہ تھا۔ وہ کیا اتنی تابعدار تھی ماں باپ کی کہ انہوں نے روکا وہ رُک گئی۔ طبیعت پوچھنے ہی تو جانا تھا کون سا کوئی فلم دیکھنے۔

''ضویا جب تم امن کے گھر پہنچو تو مجھے بھی میسج کر دینا میں بھی آ جاؤں گی۔'' عروہ نے ابھی فیصلہ کیا تھا۔

''مگر تمہارے بابا......'' ضویا نے شا کی نگاہ سے عروہ کو دیکھا۔

''یہ میرا مسئلہ ہے۔''

''عروہ شکر ہے تمہیں احساس تو ہوا، اچھے کاموں کے لیے آگے قدم بڑھانے میں کبھی دیر نہیں کرنی چاہیے ورنہ کبھی کبھی بہت دیر بھی ہو جایا کرتی ہے۔'' نیہات نے در پردہ اُسے کچھ سمجھایا تھا۔ وہ سمجھی کہ نہیں...... یہ آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا۔

☆......☆......☆

امن اور فروا دونوں نے ایک جیسی غلطی کی تھی۔ فروا گناہوں کی دلدل میں دھنس چکی تھی اور اُسے چنداں احساس اور پروا نہیں تھی۔ وہ اپنے نفس کی غلام بن کر رہ گئی تھی اور اُسے اپنے آپ کو کوئی توجیہہ پیش کر کے مطمئن کرنے کی قطعی ضرورت نہ تھی۔ وہ ہمیشہ سے بے حس و خود غرض تھی۔ ہاں امن کی بات اور تھی۔

فروا نے اپنا نیا موبائل لے لیا تھا اور سب سے پہلی کال اریز کو ہی کی تھی۔ آج کل وہ اپنا سیلون ملتان میں کھولنے کی تیاریوں میں گم تھی۔ دوسرے شہر میں سیلون کی کوئی تک نہیں بنتی تھی۔ رحمان کو بھی اعتراض تھا۔ اُسے بھی فروا کی یہ منطق سمجھ میں نہیں آئی تھی مگر فروا کے اٹل ارادے اور ہٹیلے پن کے آگے رحمان بھی مجبور ہو گیا تھا۔ اُس کی پس و پیش دھری کی دھری رہ گئی۔

اریز کا فروا کے پیچھے مضبوط ہاتھ تھا۔ وہ اُسے مسلسل اپنے حصار میں رکھے ہوئے تھا۔ وہ جو بھی اریز سے شادی کی خواہاں تھی۔ آہستہ آہستہ اریز اُس کا مائنڈ سیٹ کر چکا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے ہی ہیں۔ ہم ایک ساتھ ہیں، ایک ساتھ رہتے ہیں، پہلا پہلا پیار ہو تم میرا...... شادی 'بھی' ضرور کریں گے مگر پہلے کچھ بن تو جائیں۔ اور جتنا بھی اختلاف کرتی وہ اُسے قائل کر ہی لیتا تھا۔

ملتان کے پوش ایریے میں رحمان کا گھر تھا۔ اچھا بنا ہوا تھا۔ یہ فروا کے نام تھا اور اچھے رینٹ پر دیا ہوا تھا۔ اب اریز کے مشورے پر فروا اُس مکان میں شفٹ ہو گئی تھی۔ گھر کی بالائی منزل پر سیلون بنانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ فروا اپنی من مانی کرتی جا رہی تھی۔ رحمان دل سے ناخوش تھا مگر وہ کب سنتی اور مانتی تھی۔

رحمن چیک لکھ لکھ کر دیتا جا رہا تھا۔ وہ اپنی پسند کی رقم لکھتی جا رہی تھی۔ بلکہ دوسرے لفظوں میں رقم اریز اپنی مرضی سے لکھتا تھا۔ فروا اور اریز ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو چکے تھے۔ بغیر نکاح کے ایک دوسرے کے ہو گئے تھے۔ فروا کو کبھی کبھی اندر سے کوئی چیز کاٹتی تھی۔ چبھن دیتی تھی، کسک جگاتی تھی اور اُسے یاد آتا تھا کہ وہ گناہ آلود زندگی گزار رہی ہے۔ اریز کے ساتھ اُس کا جائز اور شرعی رشتہ نہیں ہے۔ دنیا کی نظر میں اریز اُس کا کوئی نہیں ہے۔ وہ دونوں لاکھ خود کو تاویلیں دے کر مطمئن کر لیں مگر وہ اریز کی کون تھی، کیا تھی، کیا مقام تھا اُس کا۔

جب وہ اس طرح کی کیفیات میں مبتلا ہوتی تب اُس کا من اُچاٹ ہو جاتا۔ وہ پہروں اُداس رہتی، بولائی بولائی پھرتی مگر...... مگر وہ بھی اریز چوہدری تھا۔ چرب زبان، ہر فن مولا، اُسے قائل کر ہی لیتا...... اور وہ ہو بھی جاتی تھی۔ شاید اور

کوئی راہ بھی تو نہیں تھی۔

☆......☆......☆

اریز چوہدری بہت دنوں 'فرماں برداری' کا روپ بلے کرتے کرتے اُوب گیا تھا۔ ایک جگہ ٹک کر رہنا کسی ایک حسینہ کے پلو سے بندھ کر رہنا اُس کی سرشت میں شامل نہیں تھا۔ بیا ہمدانی اُس سے کافی ناراض تھی اور وہ ملتان میں فروا کے کاموں میں ہی پھنسا ہوا تھا۔ وہ سائے کی مانند فروا کے ساتھ تھا۔ دو چیک رحمان نے فروا کے حوالے کیے تھے اور فروا نے بغیر کچھ سوچے اریز کو دے دیے تھے۔ محبت اندھی ہوتی ہے اور آنکھیں نہ ہوں تو انسان کہیں نہ کہیں اُوندھے منہ گرتا ضرور ہے جلد یا بدیر، گرنے کی جگہ گہری کھائی بھی ہوسکتی ہے یا ہمارے اعمال کے مطابق کوئی پاتال بھی۔

اریز نے فروا کے ہاتھ سے بے توجہی سے چیک پکڑے تھے۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے اُسے کوئی دلچسپی ہی نہ ہو۔ جیسے ہی فروا اُس کے پاس سے اُٹھ کر گئی اریز کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک اُبھری۔ اُس نے ایک چیک کو اپنے لبوں سے چھوا اور اپنا والٹ کھول کر والٹ کے خفیہ خانے میں وہ خالی چیک رکھ لیا۔ اور دوسرے چیک پر اپنی مطلوبہ رقم لکھی۔ پھر وہ ہنسا...... تمسخر سے سر جھٹکا، اریز کو یہ چیک آج ہی کیش کروانا تھا، پھر سیلون سے متعلق چیزیں فروا کے ساتھ خریدنے جانا تھا۔ ابھی اُسے چند دن اور فروا پر محنت کرنی تھی۔ وہ اندر سے اوب رہا تھا۔ فرار چاہتا تھا مگر وہ اپنے کسی عمل یا رویے سے فروا پر ظاہر نہیں کرسکتا تھا۔

اگلی صبح سب سے پہلے چیک کیش کروا کر وہ دونوں شوروم گئے تھے۔ اُن کو کنوینس کا بہت مسئلہ تھا اس لیے اپنی گاڑی ہونا تو بے حد ضروری تھا۔ آنے جانے میں دقت ہوتی تھی۔

سب سے پہلا کام انہوں نے یہی کیا تھا، پھر اپنی لاکھوں کی مالیت کی گاڑی میں سارا شہر گھومے۔ سیلون کے لیے تمام ضرورت کی چیزیں لی تھیں۔ دونوں نے اپنی اپنی ذاتی ضرورت کی اشیاء بھی خریدی تھیں۔ ملازمہ (کوثر) کے لیے کپڑے وغیرہ بھی لیے تھے، جو رحمان نے اپنے دل کی تسلی کی خاطر زبردستی فروا کے ساتھ بھیجی تھی، حفاظت کے لیے شاید۔

بہت اچھا دن گزار کر، رات کا کھانا کھا کر ہی وہ دونوں واپس گھر لوٹے تھے۔

☆......☆......☆

نیہات، ضویا، صبا اور اس کے باقی بہن بھائی سیدھے صبا کے گھر آئے تھے وہاں سے خالہ بشیراں کو بتا کر اور فضا، اسد اور اسوہ کو گھر چھوڑ کر وہ تینوں پیدل ہی امن کے گھر کی طرف چل پڑے تھے۔ امن کے گھر کے قریب پہنچ کر ضویا نے عروہ کو میسج کیا تھا۔

ضویا اور صبا اندر چلی گئی تھیں جبکہ نیہات باہر ہی کھڑا تھا۔ سب سے پہلے فاخرہ سے ہی اُن کی مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ فاخرہ کو ضویا یہاں دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔

''آنٹی آپ کیسی ہیں؟'' ضویا فاخرہ کے گلے لگ گئی۔

''میں ٹھیک ہوں بیٹا۔ کس کے ساتھ آئے ہو تم دونوں۔''

''وہ نیہات بھیا۔'' صبا نے دروازے کے پار ہاتھ سے اشارہ کیا۔ فاخرہ نے تاسف سے سر ہلایا اور دروازے سے باہر کھڑے نیہات کو اندر بلانے کے لیے باہر کی طرف قدم بڑھائے

پھر کچھ خیال آنے پر رُک گئی۔
''کہیں فرقان بھیا برا نہ مان جائیں۔'' وہ واپس پلٹی اور کچن میں چائے کا انتظام کرنے لگی۔ ضویا کے گلے لگ کر امن بے دریغ آنسو بہا رہی تھی، عروہ بھی آ گئی تھی۔
''امن یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔'' عروہ اور ضویا نے کہا۔ امن سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکی تھی۔ رنگت سیاہ آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے اُس کے رتجگوں کے گواہ تھے۔
''مما کی وجہ سے......'' امن اور کیا کہتی اُسے کچھ اور سوجھا ہی نہیں۔
''آنٹی ٹھیک ہو جائیں گی تم خود کو یوں ہلکان مت کرو۔'' ضویا نے اُس کے آنسو صاف کیے۔
''بیٹا چائے۔'' تبھی فاخرہ چائے بسکٹ لے کر آ گئیں۔
''مما ہم نے تو کھانا بھی نہیں کھایا۔'' صبا نے کہا۔
''میں تو کھانا کھاؤں گی ضویا آپی آپ کھاؤ گی اور مما وہ نہبات بھیا......'' فاخرہ نے اُسے سر سے مبہم سا اشارہ کر کے سمجھایا کہ یہ ہمارا گھر نہیں ہے اس لیے ہم اُسے گھر کے اندر لانے کا اختیار نہیں رکھتے۔ صبا سمجھ گئی دوبارہ نہبات کا نام بھی نہیں لیا۔ چائے کے بعد وہ سب لُبنٰی کے کمرے میں چلی گئیں، باتیں ہوتی رہیں۔ عروہ اور ضویا امن کو حوصلہ دیتی رہیں دلاسا دیتی رہیں۔
''امن کالج کا بہت حرج ہو گیا ہے اب تم آنا شروع کرو۔'' ضویا نے کہا تو امن نے بے ساختہ نظریں اِدھر اُدھر کر لی تھیں جیسے وہ اس موضوع پر بات نہ کرنا چاہتی ہو۔
''آنٹی کچھ اور بہتر ہو جائیں تب امن آپی کالج جوائن کر لیں گی۔'' صبا نے جواب دیا۔

نہبات کی مس کالز آ رہی تھیں پھر اُس نے ضویا کو میسج کیا تھا کہ آ جاؤ۔
''اچھا آنٹی اجازت، اللہ آپ کو صحت دے۔'' ضویا باری باری فاخرہ اور لُبنٰی سے ملی تھی۔ صبا، عروہ اور امن ضویا کو دروازے تک چھوڑنے آئی تھیں اور نہبات ضمیر جو اتنی دیر سے کھڑا اکڑ گیا تھا کہ شاید امن کی ایک جھلک دیکھنے کو مل جائے، وہ خواہش پوری ہو گئی، مگر امن کو دیکھ کر نہبات ششدر رہ گیا اتنی شکستہ حالت۔
''اچھا بائے اپنا خیال رکھنا امن، اور کالج آنے کو یقینی بناؤ۔'' ضویا نے اُسے ساتھ لگایا۔
''خدا حافظ۔'' عروہ اور صبا نے بھی جواباً کہا امن سر جھکائے کھڑی تھی۔
''یہ امن کو کیا ہوا ہے؟'' نہبات بولا۔
''پتا نہیں بہت کمزور ہو گئی ہے اور گم صم سی بھی، اپنی مما کی وجہ سے رنجیدہ اور سوگوار ہے۔''
''مگر اتنی مخدوش حالت، کوئی اور مسئلہ نہ ہو۔''
''اور بھلا کیا مسئلہ ہو سکتا ہے بس لڑکیاں اپنی ماؤں کے ساتھ بہت اٹیچ ہوتی ہیں نا تو اس لیے اثر بھی زیادہ لیتی ہیں۔''
''ہاں شاید، اچھا یہاں سے رکشہ نہ لے لیں۔''
''لے لیتے ہیں۔'' نہبات نے دور سے آتے رکشے کو دیکھ کر کہا۔

☆......☆......☆

مگر ہوا کیا...... اس سے پہلے کہ رکشے والا رُکتا ایک گلی سے چار پانچ لڑکے نکلے اُن کے ہاتھ میں ہاکیاں اور بلے تھے۔ وہ کسی انہونی اُفتاد کی طرح نہبات پر پل پڑے۔ سب کچھ اتنی جلدی اور اچانک ہوا کہ وہ بوکھلا کر رہ گئے۔ ضویا

حواس باختہ سی بچاؤ...... بچاؤ پکارتی رہی اور وہ نیہات کو مارتے رہے۔ انتہائی ضبط کے باوجود بھی نیہات کی فلک شگاف چیخیں نکل رہی تھیں۔ اُس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اپنے پیارے بھائی کا خون دیکھ کر وہ چلانے لگی۔ اُس کی کوئی نہیں سن رہا تھا۔ وہ اپنی سدھ بدھ کھو رہی تھی پھر اُس کو کچھ اور سجھائی نہیں دیا تو وہ دوبارہ امن کے گھر کی طرف بھاگی تھی اور سب کو روتے ساری بات بتائی وہ سب اُس کے ساتھ بھاگے۔ گھر سے نکلتے ہوئے فاخرہ نے پولیس کو بھی اس ہنگامے کی اطلاع کر دی تھی۔

جب تک وہ وہاں پہنچے نیہات خون میں لت پت بے ہوش پڑا تھا اور وہ لڑکے فرار ہو چکے تھے۔

ضویا کا رو رو کر بُرا حال تھا۔ پولیس والوں نے ضویا سے سوالات پوچھ پوچھ کر الگ پریشان کر رکھا تھا۔ ضویا کا دل انجانے وہموں اور لاتعداد اندیشوں سے اٹا پڑا تھا۔ نیہات کی حالت نے ضویا کے حواس معطل کر دیے تھے۔ انتہائی افراتفری کی صورتِ حال تھی ایسے میں فاخرہ نے ہی سارے معاملات ہینڈل کیے تھے۔ پولیس کو بھی نپٹایا اور نیہات کو بھی ہاسپٹل پہنچایا۔

نیہات کے زخم صاف کر کے پٹیاں کر دی گئی تھیں مگر ابھی تک وہ ہوش میں نہیں آیا تھا۔ اُس کا سر دو جگہ سے پھٹا تھا۔ سارا بدن خراشوں سے بھرا ہوا تھا۔ جگہ جگہ سے خون رس رہا تھا۔ اُس کی غیر ہوتی حالت ضوفیا سے دیکھی نہیں جا رہی تھی وہ کرلائے جا رہی تھی تبھی ضویا کا فون بجنے لگا۔ وہ چونکی صغریٰ کی کال تھی ضویا نے فاخرہ کو دیکھا۔

''آنٹی مما فون کر رہی ہیں کیا کروں۔''

''بات کر لو بیٹا۔''

''اُن کو بتا دوں کیا۔'' تبھی کال پھر آنے لگی ضویا نے کال پک کی۔

''بیٹا میرا دل گھبرا رہا ہے ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے میں ذرا ستانے کو لیٹی تو مجھے یوں لگا کہ جیسے مجھے کوئی مار رہا ہے۔ بے دردی سے کوڑے برسا رہا ہے۔ میں رو رہی ہوں چلا رہی ہوں مگر وہ تعداد میں بہت تھے۔ انہوں نے مجھے بہت پیٹا، میں زخمی لہولہان ہوگئی، یہ خواب تھا بیٹا مگر میرا جسم پسینے میں شرابور ہوگیا، الٰہی خیر کہتی میں اُٹھ بیٹھی۔ سب ٹھیک ہے نا بیٹا۔'' ضویا شاک میں تھی کہ مما کو خود بخود ہی پتا چل گیا۔

''مما وہ نیہات بھائی کا چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ نہیں نہیں مما فکر کی کوئی بات نہیں۔ معمولی چوٹیں ہیں۔ نیہات بھیا دواؤں کے زیر اثر سو رہے ہیں۔ آپ دعا کریں۔ ماؤں کی دعائیں اللہ جلد سنتا ہے۔ جی جی مما وہ ٹھیک ہیں۔ یہ لیں آنٹی فاخرہ سے بات کر لیں۔'' ضویا نے فون فاخرہ کو دے دیا۔ فاخرہ صغریٰ کو اطمینان دلاتی رہی، نیہات کے ٹھیک ہونے کا یقین دلاتی رہی۔

''آنٹی مما کو تو خواب میں پتا چل گیا تھا مجھے کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔''

''بس بیٹا ماں کا دل ایسا ہی ہوتا ہے آگہی پا جاتا ہے۔''

''مگر مما بہت بے چین ہوگئی ہیں اب ساری رات کروٹیں بدلتی رہیں گی دعائیں مانگیں گی۔ صحن میں چکر کاٹتی رہیں گی۔'' ابھی وہ یہ بات کر ہی رہی تھی کہ صغریٰ کا پھر فون آ گیا ضویا سمجھ رہی تھی اس لیے اب کی بار تا دیر بات کرتی رہی اُسے پتا تھا کہ مما کو نیند نہیں آنی۔

☆......☆......☆

جاگنگ سے ابھی وہ لوٹی تھی۔ اس وقت وہ ٹریک سوٹ میں تھی اور اس وقت لان میں ایکسر سائز کر رہی تھی۔ ایکسر سائز کرتا اُس کا متحرک کامنی سا وجود پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ اُس کے کالے گھنے سیاہ بالوں کی پونی ہوا میں مختلف زاویوں سے لہرا رہی تھی۔

جیسے جیسے وہ ایکسر سائز کے اسٹیپس بدلتی اُسی انداز میں اُس کی پونی ٹیل دائیں سے بائیں اوپر سے نیچے، نیچے سے اوپر لہرا رہی تھی۔ اُس کی پھرتی، اُس کا جوش دیدنی تھا۔

''زرینہ۔'' اُس نے آواز دی اُسی کی ہم عمر لڑکی پہلے سے جیسے الرٹ کھڑی تھی۔ تولیہ اور پانی کی بوتل لیے حاضر تھی۔ اُس نے زرینہ کے ہاتھ سے تولیہ لے کر اپنی گردن، چہرہ اور پیشانی کو اچھی طرح سے صاف کر کے تولیہ ایک ہاتھ سے واپس زرینہ کو پکڑا کر دوسرے ہاتھ سے پانی والی بوتل پکڑ کر ہونٹوں سے لگا کر پانی پینے لگی۔ زرینہ خالی بوتل لے کر واپس چلی گئی۔

اب وہ مالی عرفان کے سر پر کھڑی اُس کی سانس خشک کر چکی تھی۔ عرفان اندر ہی اندر اُس سے خار کھاتا تھا۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ اُسے باغبانی کا شوق تھا۔ شوق تو اُسے اور بھی بہت سارے کاموں کے تھے مگر باغبانی کا تو جیسے جنون تھا۔ اپنے گھر کے وسیع و عریض لان کی خوبصورتی، ہریالی اور شادابی اُسے بہت عزیز تھی اور وہ لان کی خوشنمائی کے لیے خود اپنے ہاتھوں سے محنت کرنا بھی پسند کرتی تھی۔ اُسے کوئی عار یا کوئی خفت نہیں محسوس ہوتی تھی۔ وہ خود گوڈی کر لیتی تھی۔ پودوں میں سے گلے سڑے پتے نکالتی تھی۔ اُسے پودوں، پھولوں اور درختوں سے محبت تھی۔ نجانے کیوں اُسے گمان ہوتا تھا کہ پھول محبت کی زبان سمجھتے ہیں۔ وہ پودوں کی کاٹ چھانٹ میں لگی رہتی تھی۔ وہ کسی کیاری، کسی گملے کو نظر انداز نہیں کرتی تھی۔

''عرفان۔'' وہ جو قریب ہی گھاس کو مشین سے کاٹ رہا تھا دوڑا چلا آیا۔

''جی میم۔'' وہ مؤدب سا سینے پر ہاتھ باندھے نظریں جھکائے کھڑا تھا۔

''سردیوں کا موسم رخصت ہو رہا ہے اندر جتنے بھی کیکٹس کے گملے رکھے ہیں اُن کو باہر رکھو تاکہ اُن کو دھوپ لگ سکے۔''

''جی......'' وہ ہنوز اُسی مؤدبانہ پوزیشن میں کھڑا تھا۔

''اور ہاں یاد رہے فینسی گملے چھاؤں میں ٹھیک رہتے ہیں خیال رکھنا، شام کو نئے پودے لینے نرسری جانا ہے، تیاری رکھنا۔ میں گارڈن کے لینڈ اسکیپ میں بھی کچھ نیا کرنا چاہ رہی ہوں اوکے۔''

عرفان کافی دیر سے دم سادھے کھڑا تھا جیسے ہی وہ گارڈن سے نکلی عرفان نے ایک آسودہ سانس بھری۔ نجانے کیوں اُس کے سامنے عرفان کی گھگی بندھ جاتی تھی ویسے تو وہ پٹر پٹر بولتا رہتا تھا۔ مگر اُس کے سامنے گویا زبان تالو سے چپک جاتی تھی۔

وہ کون تھی!! خوبصورت جذبات سے گندھی، اُمید بھرا دل، خواب دیکھتی آنکھوں والی، کچھ کر گزرنے کا عزم رکھنے والی، کچھ پانے کی جستجو میں مگن، محبت کی تعبیر تھی وہ، محبتیں تقسیم کرتی دلوں کی دھڑکن، ابو نے تو اُس کا نام کچھ اور رکھا تھا مگر وہ اُجالا تھی۔ سعد مرتضیٰ کی اُجالا، پُر جوش لہجہ، عزم کی پختگی، کامیابیاں سمیٹنے کی لگن۔

تقریری مقابلوں میں جیتی ہوئی درجنوں

ٹرافیاں۔

بیت بازی، کوئز کے مقابلوں میں جیتی ہوئی لاتعداد شیلڈز، اُس کی کارکردگی کا ثبوت تھیں۔ اُجالا ہونہار طالبہ، تعلیمی میدان کا چمکتا ستارہ۔ تتلیاں، پھول، جگنو اُس کی زندگی کا اثاثہ، بڑی بڑی سیاہ چمکتی آنکھیں، صحت مند گورے گال جن میں گلابیاں گھلی ہوئی تھیں۔ گلابی بھرے بھرے ہونٹ، زندگی کی تمام تر رعنائیوں سے لبالب بھری لڑکی، شوخ و چنچل پھرتیلی، انسان دوست، جلد بھروسا کرلینے والی، انسان دوست۔

ڈاکٹر سعد مرتضیٰ اُس کے بڑے بھائی تھے۔ وہ ہارٹ اسپیشلسٹ تھے۔ اُن کا اپنا پرائیویٹ ہاسپٹل تھا۔ وہ دو ہی بہن بھائی تھے۔ اُن کی امی تب فوت ہوئیں جب وہ بہت چھوٹی تھی۔ ابو نے اُن دونوں بہن بھائی کو خصوصی توجہ اور محبت دی مگر جب وہ بھی چل بسے تو سعد نے اُجالا پر گویا محبتوں کی بارش کر ڈالی، محبت والتفات، لاڈ، گہرا دلگاؤ اُن دونوں کے بیچ پروان چڑھنے لگا۔

☆......☆......☆

سرکاری ہاسپٹل میں مخصوص قسم کی ادویات کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ بوسیدہ حال زنگ آلود پنکھے گھرر گھرر کررہے تھے۔ ساری رات اونگھتے، لڑھکتے گزر گئی تھی۔ تھکن سے اُن کے اعصاب شل تھے، بدن تھکن سے چور اور رتجگے کے باعث آنکھیں سوجی سوجی تھیں۔

''آنٹی دیکھیں، دیکھیں۔'' نیہات کے بدن میں ذرا سی جنبش ہوئی تھی اور اُس کی آنکھوں کی ساکت پتلیوں میں حرکت ہوئی تھی۔

''مجھے لگتا ہے اِسے ہوش آرہا ہے، شکر ہے خدا کا۔'' فاخرہ نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر نیہات کے قریب آکر کہا۔ اُن کا لہجہ بلا کی اپنائیت اور مٹھاس اپنے اندر سموئے ہوئے تھا۔ تبھی نیہات نے آنکھیں کھول دیں، چند لمحے وہ اجنبی تاثر آنکھوں میں لیے کسی نادیدہ نقطے کو گھورتا رہا۔ ضویا اور فاخرہ نے خوشی سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر دوبارہ نیہات کو۔ وہ اب ہلکا سا سر گھما کر اِدرگرد دیکھ رہا تھا۔ پھر درد کی ایک ہلکی سی لہر اُسے اپنے سر سے اُٹھتی محسوس ہوئی۔ اُس نے دوبارہ آنکھیں موندلیں اُس کے چہرے پر کرب پھیل گیا تھا۔ ضویا نرس کو بلانے بھاگی تھی۔

فاخرہ نے دیکھا گلاس وال کے پار صغریٰ ہاتھ میں بہت سے شاپرز پکڑے آرہی تھی۔ فاخرہ کو خطرہ محسوس ہوا۔ مبادا صغریٰ یہاں رونا پیٹنا نہ ڈال دے آکر، اس لیے وہ جلدی سے باہر نکلی صغریٰ اُسے دیکھ کر رونے لگی۔

''نیہات ٹھیک ہے خدا کا شکر ادا کریں۔ ایکسیڈنٹ میں جان بچ گئی، اُس کے سامنے رونا نہیں پلیز، ورنہ وہ بھی حوصلہ چھوڑ دے گا۔'' فاخرہ اُسے اپنے ساتھ لگائے ہولے ہولے کافی دیر سمجھانے میں لگی رہی۔ ضویا اور فاخرہ نے جان بوجھ کر اُس سے چھپایا تھا کہ لڑکوں نے مارا ہے ورنہ ایک ماں کا دل کہاں برداشت کرتا ہے کہ اُس کی اولاد کو کوئی ایک تھپڑ بھی مارے کجا کہ یوں مار مار کر بھرکس نکال دینا، اس لیے اُس سے مخفی رکھنا لازمی تھا۔

فاخرہ کے اتنا سمجھانے کے باوجود جب صغریٰ نے پٹیوں میں جکڑا نیہات کا وجود دیکھا تو صبر کا یارا نہ رہا اور وہ رودی اور فاخرہ باوجود کوشش کے بھی اُسے منع نہ کرسکی۔

☆......☆......☆

اُداسی آنکھ میں ٹھہری ہوئی ہے
جدائی دور تک پھیلی ہوئی ہے

مرے تیرے بچھڑنے کی کہانی
یہاں پر ہر طرف لکھی ہوئی ہے

محبت تو امن نے بھی کی تھی مگر ہاتھ کیا آیا نارسائی، ناامیدی اور سب سے بڑھ کر ذلت، پچھتاوا ندامت اور کھو دینے کا جاں گسل احساس۔ اعتماد کھو یا یاں کی نفرت کا سامنا تھا۔ اُس کی محبت جنوں خیز تھی۔ اب نہ کوئی آس تھی نہ پیار بھری سرگوشیاں۔ نارسائی اور توہین کا احساس اُسے ہر وقت بھڑکتے الاؤ میں جلاتا تھا۔ گھٹن و تپش اتنی کہ وہ اَدھ موئی ہوجاتی کوئی راہ فرار نہیں، کوئی اچھی یاد زادِ راہ نہیں۔

''بیٹا اب آپ کالج جانا شروع کرو۔'' اُس کے قریب سے آواز ابھری تھی۔ امن نے یک بارگی آنکھیں کھولیں۔ اُسے خبر ہی نہیں ہوئی کہ وہ کب سے یہاں بدحال سی بیٹھی ہوئی تھی۔

''جی بابا۔'' کالج کے نام پر امن کی سانس رُکنے لگتی تھی۔

''بیٹا اب تمہاری مما ٹھیک ہیں۔ گھر کے کاموں میں بھی دلچسپی لے رہی ہیں۔ تم بھی اس سوگوار کیفیت سے نکلو، روٹین کی زندگی شروع کرو۔''

''جی بابا۔'' وہ سر جھکائے اپنے ہاتھوں کے ناخن دیکھتی رہی۔ وہ بابا سے نظریں نہیں ملا رہی تھی۔

''یہاں کیوں بیٹھی ہو بیٹا۔'' فرقان نے امن کی اُداسی دل سے محسوس کی تھی۔

''کہاں بیٹھوں بابا۔'' وہ منہ ہی منہ میں بدبدائی۔ وہ چھت پر لوہے کی گرل سے ٹیک لگائے نجانے کب سے بیٹھی سود و زیاں کے حساب کررہی تھی، حاصل جمع زیاں ہی زیاں تھا۔

''بیٹا آجاؤ نیچے، سردی ہے، بیمار پڑجاؤ گی۔'' وہی مشفق محبت سے بھرپور لہجہ، وہ چلے گئے امن وہیں گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے سوچوں میں بدغم بیٹھی رہی۔ وہ ایسے ہی منہ چھپاتی پھر رہی تھی۔ لبنیٰ کا سامنا کرنے سے کتراتی تھی۔ بھلا کونوں کھدروں میں بھی کبھی پناہ ملتی ہے اور پناہ ملے بھی کیسے۔ سارے ماحول میں ایک نامعلوم سوز بھری اُداسی سرسرا رہی تھی۔ شفق پر سرخی پھیل رہی تھی۔ گھروں سے دھوئیں کے مرغولے فضا میں تیر رہے تھے۔

''کاش رنگوں سے کھیلنے اور تتلیوں کو پکڑنے کا معصوم دور کبھی ختم نہ ہوتا۔ تتلی، جگنو، پنسل، شاپنرز، ہوم ورک ماں باپ کی محبتیں، کاش میں کبھی بڑی نہ ہوتی، میری کل کائنات میری گڑیا، میرے کھلونے، میرا بچپن۔''

اس کے لہجے کی تیزی طراری مدھم ہوکر ختم ہوچکی تھی۔ زندگی کے رنگ پھیکے پڑچکے تھے۔ بس بیزاری کا رنگ غالب تھا۔ اور یہ رنگ آج کل اُس کی ذات پر حاوی ہوچکا تھا۔

☆......☆......☆

اُجالا تیزی سے شاور لے کر نکلی تھی۔ سفید یونیفارم پنک دوپٹا اوڑھے وہ معصوم سی گڑیا لگ رہی تھی۔ سعد مرتضیٰ سیاہ رنگ کا زبردست سوٹ پہنے ڈیزائنر سلک ٹائی، قیمتی ٹائی پن اور کف لنکس، بازو پر بندھی بیش قیمت گھڑی، ڈاکٹر سعد مرتضیٰ فخر سے سرتانے گلاس وال کا ڈور دھکیلتا باہر نکلا تھا۔ اُس کے قدموں میں تیزی تھی۔ وہ اپنی شخصیت کی اثر انگیزی سے مکمل آگاہ تھا۔ اپنے مقام اور مرتبے سے واقف۔

''گڈ مارننگ اُجالا۔''

''گڈ مارننگ سعد مرتضیٰ۔'' وہ ہمیشہ ایسے ہی کہتی تھی۔

شیشے کی گول میز کے اطراف دو افراد آمنے سامنے بیٹھے ناشتا کرنے میں مشغول ہوگئے۔

اعلیٰ رتبہ، معاشرے میں باعزت مقام، معاشی خوشحالی، کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ خدا نے بہت نوازا تھا مگر دونوں بہن بھائی ہی عاجزی و انکساری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ وہ ٹوسٹ حلق میں زبردستی ٹھونس رہی تھی۔ چائے کے گھونٹ ایسے پی رہی تھی جیسے بہت کڑوی کسیلی کوئی چیز اُس کے اندر جارہی ہو۔ سعد نے دیکھا اور اُس نے ہلکے سے سر جھٹکا۔ اُجالا نے ناقہمی سے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ سعد کے ہونٹوں کی تراش میں دلفریب سی مسکان پھیل گئی۔

''ڈھنگ سے ناشتا کرو۔'' سعد نے پیار سے ڈانٹا۔

''اوہ، صبح صبح دل نہیں مائل ہوتا۔''

''صبح سے جاگنگ ایکسر سائز، پھر بے چارے عرفان کی شامت آئی۔''

''آپ دیکھ رہے تھے......'' وہ نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولی۔

''ہاں۔'' سعد ناشتے میں صرف جوس لیتا تھا، ہاں موڈ اور موسم کے مطابق فلیور بدلتے رہتے تھے۔ دونوں اکٹھے گھر سے نکلے تھے۔ سعد اُسے اسکول چھوڑ کر خود ہاسپٹل جاتا تھا۔ اُن کا اپنائیت کا رشتہ تھا خون کا، مان کا رشتہ تھا۔ عمروں کا اتنا فرق ہونے کے باوجود اُن کی دوستی تھی۔ گاڑی سے اُترنے سے پہلے سعد نے اُجالا کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اُس کے سر پر اپنے لب رکھے تھے۔ وہ اُس کی بہن ہی نہیں بیٹی بھی تھی۔

اُس کے گلابی روپ پر محبت کا ہر رنگ نچھاور تھا۔ وہ حسن و رعنائی کا پیکر تھی۔ چہرے کا بھولپن اور شرمیلی حیا آلود ادا اُسے سب میں نمایاں کرتی تھی۔ جو دیکھتا بس دیکھتا رہ جاتا۔ وہ بہت دلکش و دلربا دکھائی دیتی تھی۔ سانچے میں ڈھلا وجود، سفید رنگت، ہیرے کی کنی جیسی دمکتی آنکھیں، کھنکتی کانچ جیسی شوخ آواز۔ یہ تھی اُجالا مرتضیٰ۔

☆......☆......☆

اریز چوہدری نے بیوٹی سیلون سے متعلق ساری چیزیں خود خریدی تھیں، چاہے وہ فرنیچر ہو یا کارپٹ، وہ فروا کے ساتھ تھا۔ میک اپ کا کچھ سامان لینے وہ کراچی بھی گئے تھے۔ سارا دن وہ اکٹھے گھومتے رہے، ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے۔ وہ سرکش لڑکی یہ بھول چکی تھی کہ اُس کے ماں باپ ناراض ہیں اور اگر اُسے یاد بھی ہوتا تو پروا کس کو تھی۔

ہنستے مسکراتے قہقہے لگاتے فروا دنیا و مافیہا سے بالکل کٹ کر الگ ہوگئی تھی۔ اُس کے پیچھے لوگ کیسی کیسی باتیں کررہے تھے۔ فروا کا ذکر گھر گھر ہورہا تھا۔ ہر شخص ورطۂ حیرت میں تھا کہ رحمان نے اکیلی جوان جہان لڑکی کو دوسرے شہر کیوں بھیج دیا۔ ایسی بھی کیا بات ہے کہ اُس نے اپنے شہر میں پارلر کھولنے کی بجائے ملتان میں جاکر ٹھکانہ کرلیا۔ کمال ہے۔

لوگوں کی چہ میگوئیاں جاری تھیں۔ رحمان سے ابھی تک کسی نے خیر کچھ پوچھا نہیں تھا۔ کوئی پوچھ بھی لیتا تو وہ کیا جواب دیتا، اُسے تو خود پتا نہیں تھا۔ وہ مجبور ہوگیا تھا اور اُسے فروا پر غصہ بھی بہت تھا۔ فروا نے مشورہ کرنا یا پھر اجازت لینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی۔ بس اُن کو مطلع کیا تھا اور اپنی رائے، اپنی خواہش بتائی تھی۔ رحمان نے روکا بھی، سمجھایا بھی، غصہ بھی ہوا مگر وہ اڑی رہی، ضد اور ہٹ دھرمی دکھاتی رہی۔ یہاں رحمان نے غلطی کی چیک دینے والی غلطی، اور اوپر سے

بلینک چیک، یہ رحمان کا غصہ تھا ناراضی کا اظہار تھا۔ مگر وہاں تو اُن کی گویا لاٹری نکل آئی۔ اریز کے وارے نیارے ہوگئے۔

یہ پہلی گرہ، پہلی دراڑ، پہلا دکھ، پہلی اذیت تھی جو فروا کی طرف سے رحمان کے دل میں جاگی تھی۔ اب پتا نہیں آنے والا وقت اپنی جھولی میں کتنی گرہیں، کتنی دراڑیں اور کتنے دکھ چھپائے بیٹھا تھا۔ یا دوسری صورت میں فروا کو اپنی غلطی اپنی کوتاہی کا احساس ہوجاتا، وہ لوٹ آتی اور رحمان کے دل سے پہلی گرہ، پہلا دکھ نکال کر ذرا سیا دراڑ پُر کر دیتی مگر مگر یہ غیر متوقع صورتِ حال تھی۔ جس کے دور دور تک کوئی آثار نظر آتے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ فروا بھی کبھی گھر فون کرلیتی تھی مگر وہ ابھی تک گھر آئی نہیں تھی۔

لنچ شیرٹن میں کر کے وہ ہوٹل لوٹے تھے۔ اریز بہت تھک گیا تھا اور کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا۔ وہ آرام کی غرض سے آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔ اُس کا ذہن سکون پانے لگا۔ مگر فروا نے اُسے جگا دیا۔ چند لمحے وہ غیر حاضر دماغی سے اُسے دیکھتا رہا۔

''کیا ہوا، ابھی ذرا سی آنکھ لگی تھی یار۔'' وہ اُکتا رہا تھا مگر اُس نے اپنے لہجے، الفاظ اور تاثرات سے کچھ بھی شو نہیں ہونے دیا لہجہ نارمل سا تھا۔

''مجھے کچھ ہو رہا ہے۔'' وہ آنکھیں بند کیے تیز تیز سانس لے رہی تھی اریز اُٹھ بیٹھا۔

''فروا کیا ہوا ہے۔'' وہ اُس کے اب گال تھپتھپا رہا تھا۔

''دل گھبرا رہا ہے۔'' فروا نے ذرا سے ہونٹ وا کر کے کہا۔ اُس کی آنکھیں اب بھی بند تھیں اور ہونٹ بند، سانس ناک سے خارج ہو رہی تھی۔

''کیا ہوگیا جان، ابھی کچھ دیر پہلے تو تم ٹھیک تھیں۔'' اریز کے دلکش نقوش میں فکرمندی جھلکنے لگی مگر فروا کچھ نہیں بولی وہ کھینچ کھینچ کر سانس لے رہی تھی۔ اُسے سانس لینے میں دقت و دشواری کا سامنا تھا۔ اُس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اُس کی پیشانی عرق آلود تھی۔ بدن سرد ہو رہا تھا۔ اریز صحیح معنوں میں پریشان ہوگیا۔ فروا کا کاجل اُس کے گالوں پر بہتا جا رہا تھا۔ اریز پھرتی سے ایک ہی جست میں بیڈ سے نیچے اُترا اور جوتے پہننے لگا۔ اُس کے انداز میں عجلت اور چستی تھی۔ وہ ڈاکٹر کے پاس فروا کو لے کر جانا چاہتا تھا۔ اُسی دوران فروا نے موندی ہوئی آنکھیں کھولیں اُسے ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔

''شاید تمہارا بی پی لو ہوگیا ہے ڈاکٹر کو یہاں بلواؤں کہ تمہیں وہاں لے کر جاؤں۔''

''آں، آں، آ۔'' فروا ہونٹوں پر ہاتھ رکھے اُبکائی روک رہی تھی پھر وہ اُٹھی اور واش روم میں بھاگ گئی۔ اریز ششدر سا اُسے جاتا دیکھتا رہا۔ ایک خیال اُس کے ذہن میں کسی کوندے کی مانند لپکا۔ وہ جہاں کا تہاں رہ گیا مگر دوسرے ہی لمحے وہ اپنے اُس خیال کو ذہن کے گوشوں سے جھٹک چکا تھا۔ فروا کی اُبکائیوں کی آواز مسلسل باہر آرہی تھی۔ اریز برے برے منہ بنا رہا تھا۔ وہ ذہنی ریلیکس چاہ رہا تھا اور کچھ دن فروا سے دور رہ کر بیا ہمدانی کے ساتھ وقت گزارنا چاہ رہا تھا مگر حالات اسے فروا کے ساتھ باندھے جا رہے تھے۔

فروا کافی دیر واش روم میں لگا کر نکلی تھی۔ اریز نے اُسے آتا دیکھ کر رونے والی شکل بنالی اور سر ایسے جھکالیا جیسے وہ خود کو بولنے کے قابل نہیں

پا رہا۔

''ہم لوگوں نے کچھ ایسا تو کھایا نہیں، جو معدے پر بوجھ بڑھا دے۔'' فروا اب خاصی بہتر تھی۔

''چلو ڈاکٹر سے چیک اپ کرواتے ہیں۔'' اریز نے اُسے ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب کیا اور ایک ہاتھ اُس کے کندھے کے اطراف ایسے رکھا جیسے محبت کا حصار باندھا ہو۔

☆......☆......☆

صبا فضا کو لے کر فاخرہ اسپتال آئی تھی۔ دیسی مرغی کی یخنی نیہات کے لیے اُس نے کالی مرچ ڈال کر بنائی تھی۔ ضویا نیہات کے پاس تھی، اُس کے لیے الگ سے کھانا تھا۔

نیہات خاصا باہمت نوجوان ثابت ہوا تھا یا شاید جوانی کی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے...... جو بھی تھا وہ کچھ دنوں میں ہی خاصا بہتر نظر آ رہا تھا۔ فاخرہ ہاسپٹل، گھر، امن کے گھر گھن چکر بن کر رہ گئی تھی۔ لبنیٰ اب گھر سنبھال چکی تھی۔ طبیعت بھی اُس کی ٹھیک تھی، اس لیے فاخرہ کا اُن کے گھر آنا جانا قدرے کم ہو گیا تھا پھر بھی وہ کبھی کبھار چکر لگا ہی لیتی تھی۔

''صبا اسٹڈی کیسی جا رہی ہے۔'' نیہات نے پوچھا تھا۔

''جی بھیا زبردست، اور آپ کو پتا ہے نا کہ اسکول میں مقابلہ تھا مضمون نویسی کا۔''

''ہاں یاد ہے مجھے تم نے بتایا تھا۔'' وہ کہنی کے بل ذرا سا اوپر ہوا۔

''اور مجھے ملا ہے......'' صبا نے چمکتی آنکھوں سے تجسس پھیلایا۔

''پہلا انعام۔'' ضویا نیہات اور فضا نے یک زبان ہو کر کہا۔

''جی جناب، اور ما بدولت بہت خوش، آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں پھر میں ٹریٹ دوں گی آپ کو۔''

''اوہ...... ہو......صرف اِن کو، اور ہم......'' ضویا نے آنکھیں دکھائیں۔

''آپ کو، امن آپی کو سب کو۔'' صبا اندر سے نیہات کے لیے رنجیدہ و اُداس تھی مگر بظاہر وہ اُس کے سامنے ظاہر نہیں کرنا چاہ رہی تھی اس لیے ایسا موضوع شروع کر دیا تھا۔

''امن سے یاد آیا آنٹی کی طبیعت اب کیسی ہے۔'' ضویا نے فاخرہ سے پوچھا فاخرہ نے باؤل میں یخنی نکال کر نیہات کو باؤل پکڑایا اور ضویا کا کھانا اُس کے سامنے رکھا۔

''لبنیٰ اب ٹھیک ہے، تم کھانا کھالو۔''

''جی آنٹی۔'' صبا نیہات سے باتوں میں مشغول تھی اور فاخرہ کا ذہن امن کی طرف بھٹک رہا تھا۔

☆......☆......☆

اریز کے لب خاموش تھے لیکن ماتھے پر شکنوں کا جال، چہرے پر غصے کی سرخی، بار بار انگلیوں کی پوروں سے سر کو دباتا اریز، یوں لگتا تھا وہ کسی سنگین قسم کی پریشانی میں مبتلا ہے۔

''اریز اتنا ٹینس ہونے کی کیا بات ہے۔'' فروا نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''بس تم ختم کرو یہ سب۔''

''نہیں اریز تم مجھ سے نکاح کرو تا کہ ہم اس بچے کو باعزت طریقے سے دنیا میں لاسکیں۔''

''میں شادی اور بچہ افورڈ نہیں کر سکتا تم سمجھتی کیوں نہیں ہو، میں جب سے کراچی سے آیا ہوں بہت اَپ سیٹ ہوں مگر تمہیں کیا، تمہیں تو ماں بننے کا شوق چڑھا ہے۔''

''اریز جب ہم ایک ساتھ رہیں گے تو ایسے تو ہوگا نا، رہی بات فیوچر کی تو کیا نہیں ہے تمہارے پاس۔ تمہارے والد سنگاپور میں ہوتے ہیں، ہر شہر میں تم لوگوں کے عالیشان گھر ہیں پھر ایسے کیوں کہتے ہو۔''

''وہ سب ڈیڈی کا ہے، اپنی چیز وہی ہوتی ہے جو اپنے نام ہوتی ہے، اپنی ملکیت ہوتی ہے۔''

''ہے تو سب کچھ تم لوگوں کا ہی نا۔'' وہ ہولے سے بولی۔

''ڈیڈی کا اس بارے یہ کہنا ہے کہ اپنا کماؤ کھاؤ، میرے مرنے کے بعد سب تمہارا ہے، ہر کوئی تمہارے بابا جیسا نہیں ہوتا جن کو اپنی اولاد کی کتنی فکر ہے، جب جب تمہارے بابا نے کوئی زمین خریدی کوئی دکان یا مکان خریدا ساتھ کی ساتھ ہی اپنے بچوں کے نام کرواتے گئے۔ تمہارے نام بھی کافی پراپرٹی ہے جبکہ میرے نام تو کچھ نہیں۔ اس لیے میں اپنے زور بازو پر بھروسا کرتے ہوئے کچھ کرنا چاہتا ہوں، مگر سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے ہاتھ باندھے تمہارے ٹکڑوں پر پل رہا ہوں۔ ایک تم ہو کہ ازدواجی زندگی شروع کرنے کے خواب دیکھ رہی ہو۔ اب مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔'' وہ اس وقت بہت مجبور و بے کس نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اریز میرا سب کچھ تمہارا ہی ہے، ایسی باتیں کیوں کرتے ہو۔ تم مجھ سے نکاح کرلو تو میں اپنی ساری جائیداد تمہارے نام کردیتی ہوں۔ پھر تم آہستہ آہستہ اپنی مما سے بات کرلینا جب تمہاری مما مان جائیں تو مجھے گھر لے جانا۔'' وہ خود ہی سارا پلان کیے بیٹھی تھی۔ بات اریز کے دل کو لگی۔

''ٹھیک ہے میری جان تم کہتی ہو تو میں نکاح کرلیتا ہوں۔ میں تمہیں پریشان نہیں دیکھ سکتا۔'' اب وہ جان لٹانے والا عاشق بن چکا تھا۔

''تھینکس اریز تم بہت اچھے ہو۔''

''مگر میں تمہاری پراپرٹی میں سے ایک پائی بھی نہیں لوں گا۔'' وہ ایک بات فروا کے ذہن میں ڈال رہا تھا کہ کہیں وہ بھول نہ جائے اور وہ اُسے مکرنے نہیں دینا چاہتا تھا۔

''نہیں اریز جب ہم میاں بیوی بننے جارہے ہیں تو تیرا میرا کچھ بھی نہیں سب 'ہمارا' ہے۔ جب تم میرے ہو تو پھر مجھے کچھ اور نہیں چاہیے میری ہر چاہ کا خاتمہ تم پر ہوتا ہے۔''

فروا جذباتی ہوکر اُس کے گلے کا ہار بن گئی۔ اور اریز کا ذہن بہت تیزی کے ساتھ کام کررہا تھا بہت آگے کی پلاننگ کررہا تھا مگر وہ سر نیہوڑے افسردہ بیٹھا تھا بظاہر۔

☆......☆......☆

''امن اُٹھو بیٹا تیار ہوجاؤ، کالج جاؤ۔'' فاخرہ آج پھران کے گھر آئی ہوئی تھی۔

''نہیں آنٹی میرا دل نہیں کرتا۔''

''تارک الدنیا ہوجانے سے کیا ہوجائے گا۔ ہمت و حوصلے سے کام لو، نماز پڑھا کرو، اللہ معاف کرنے والا ہے۔'' امن نے پتھرائی ہوئی نظروں سے فاخرہ کو دیکھا۔

''میرا پڑھنے کو اب دل نہیں کرتا، میں حرماں نصیب، سیاہ بخت سب گنوا بیٹھی۔ میرا دل ہر چیز سے اُچاٹ ہوگیا ہے۔''

''اپنا حال دیکھ رہی ہو، کس کو اذیت دے رہی ہو، خود کو تباہ کرکے۔ ہر کوئی تمہاری اس حالت کی بابت پوچھتا ہے۔'' بکھرا حلیہ، ملگجا لباس، سوجے ہوئے پپوٹے، اندر کو دھنسی

آنکھیں۔ فاخرہ نے اُسے جھنجھوڑ دیا۔

''امن تم نے ایک بار بھی اللہ کا شکر ادا نہیں کیا کہ دنیا والوں کے سامنے اللہ نے تمہارا پردہ رکھ لیا ایک بار بھی تم نے سوچا کہ اگر دنیا والوں کو اس منحوس سانحے کی خبر ہو جاتی تو لوگ تمہیں اور تمہارے والدین کو جینے نہیں دیتے۔ ہر ہاتھ میں پتھر ہوتا، لوگ تم پر زبان سے بھی نشتر زنی کرتے اور پتھروں سے سنگ باری بھی، بہت برا ہوا جو بھی ہوا مجھے احساس ہے۔ مگر یوں دنیا سے چھپ جانے سے تمہارا نہ ہی فساد پورا ہوگا نہ ہی ملال، اٹھو بیٹا خدا سے معافی مانگو، جینا تو ہوگا، گھٹ گھٹ کر مرنے سے بہتر ہے کہ 'جی' ہی لیا جائے۔''

''آنٹی مجھے ڈر لگتا ہے۔ گھر سے باہر نکلنے سے خوف آتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ سامنے ہی کھڑا ہوگا وہ مجھ پر ہنسے گا۔ میرا مذاق اڑائے گا میری توہین کرے گا ذلیل کرے گا مجھے۔''

''سب خوف سب اندیشے دل سے نکال دو میری جان، وہ ایک حادثہ تھا اور اُسے ایک بھیانک حادثہ سمجھ کر بھول جاؤ۔'' فاخرہ اسے سمجھا سمجھا کر عاجز آ رہی تھی۔

''اٹھو بیٹا نہاؤ، صاف ستھرے کپڑے پہنو اور ابھی لبنیٰ سے معافی مت مانگنا، تھوڑا وقت لگے گا وہ تمہیں معاف کر دے گی۔ وقت تو لگتا ہی ہے نا، شکر کرو کہ فرقان بھائی کو کسی بات کا نہیں پتا، وہ تم سے پہلے کی طرح ہی محبت کرتے ہیں۔ اللہ معاف کر دیتا ہے دنیا معاف نہیں کرتی اُٹھو بیٹا نہا کر فریش ہو جاؤ اور ہمت و جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جیو، نماز فجر ادا کرو اور اللہ سے معافی مانگو، خیر مانگو اور اللہ کا شکر بھی ادا کرو۔ وہ پاک ذات ہے عیبوں پر پردہ ڈالنے والی۔''

فاخرہ اُٹھی اور وضو کرنے چلی گئی۔ امن کے دل کو فاخرہ کی باتیں لگی تھیں، امن بھی وضو کرنے کے لیے اٹھ گئی۔

فاخرہ نے سلام پھیرا تو دیکھا اُس کے پاس امن بھی نماز پڑھ رہی ہے۔ فاخرہ کو خوشی ہوئی اور اُس کا دل آزردہ بھی ہوا واقعی امن کا درد لامتناہی تھا۔

وہیں بیٹھے بیٹھے فاخرہ کے دل میں ایک بات آئی تھی اور جیسے اُس کے دل میں ڈھیروں سکون اترتا چلا گیا۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ امن کو اپنے گھر لے جائے گی۔ ہر وقت اُس کے ساتھ اُس کی طاقت بن کر رہے گی۔ لبنیٰ کی طبیعت ٹھیک تھی پھر بھی کسی ایمرجنسی کی صورت میں بشیراں کو اُس کے پاس بھیجا جا سکتا تھا۔

''بہت شکریہ بیٹا، اب ایسے ہی روز نماز پڑھا کرنا، دیکھنا خود کو خدا کی پناہوں میں دینا کتنا سکون دیتا ہے۔ سب اُسی سے مانگا، کرو اُسی سے ہم کلام ہوا، کرو اُسی سے راز و نیاز کیا کرو۔''

''جی آنٹی، اب کیا کروں گی۔''

''اب قرآن پاک کی تلاوت کرو پھر تیار ہو جاؤ۔ میں ناشتا بناتی ہوں پھر میں اپنی بیٹی کو خود کالج چھوڑ کر آؤں گی۔ ٹھیک ہے نا۔'' فاخرہ کا شہد آگیں، چاہتوں سے لبریز لب و لہجہ اپنے اندر اثر پذیری رکھتا تھا اور امن پر بھی اثر ہو رہا تھا۔

☆......☆......☆

اُجالا کو نرسری جانا تھا۔ کچھ نئے پودے اُگانے میں بیج اور پنیری کی ضرورت تھی۔ زرینہ شام کی چائے کا انتظام کر رہی تھی تبھی لبنیٰ چلی آئی۔ وہ کلاس فیلو تھیں مگر لبنیٰ سرکاری اسکول میں پڑھتی تھی جبکہ اُجالا سٹی پبلک اسکول میں پڑھتی

تھی۔ پھر بھی دونوں کی دوستی تھی لبنیٰ سے اُس کی بہت بنتی تھی۔ وہ اُس کی کزن تھی۔

''آؤ لبنیٰ، کیسی ہو۔'' اُجالا بہت تپاک سے اُس کے گلے لگی تھی۔ دونوں ہنستی مسکراتی ہوئی۔ باتوں میں مگن ہوگئیں۔ اسٹڈی کی باتیں، اِدھر اُدھر کی۔

''چائے۔'' بھی زرینہ چائے لے کر آ گئی اس وقت وہ اُجالا کی اسٹڈی میں تھیں۔ اُجالا نے خالی چائے دیکھ کر زرینہ سے کہا کہ ساتھ کچھ لے کر آؤ۔ اُجالا نے بازار سے سموسے بھی منگوا لیے تھے زرینہ بھی اسنیکس کے طور پر کافی کچھ لے آئی تھی۔ باتوں میں وقت کے گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا، وہ بھلے روز ملتیں مگر اُن کی باتیں ختم نہیں ہوتی تھیں۔

''کیا کر رہی تھیں میرے آنے سے پہلے۔'' لبنیٰ نے اُس کے اطراف نظر دوڑائی۔

''بس نرسری جانا تھا، پھر تم آ گئیں۔''

''اوہو، میں نے تو وقت ہی ضائع کیا نا، اچھا میں چلتی ہوں۔''

''وقت جتنا بھی قیمتی ہو، کام جتنا بھی اہم ہو، مگر اپنوں سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔''

''مذاق کر رہی ہوں، ویسے ہی، اب چلتی ہوں۔''

''ناراض ہو کے جا رہی ہو۔'' اُجالا نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا ذرا سا نیچے جھک کر۔

''ارے پاگل ہو، ناراضی کیسی میری جان۔'' لبنیٰ نے چٹاچٹ اُس کے گال چوم لیے اُجالا شرما گئی مارے حیا کے اُس کے گال دھکنے لگے۔

''اُف ایک تو یہ تمہارے اناروں جیسے گال، تمہیں تو تمام عمر بلشر لگانے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ اتنے گلوئنگ اور شائننگ گال، ویسے اُجالا کبھی کبھی میرا دل کرتا ہے......''

''کیا......'' اُجالا نے اپنی آنکھیں پھیلائیں۔

''دل کرتا ہے تیرے گال کھرچ کر دیکھوں اور تمہارے گلابی ہونٹ چھید کر دیکھوں کے نیچے سے کیا نکلتا ہے۔ بہت حسرت ہے یہ میرے دل کی۔'' لبنیٰ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر شرارت سے بولی۔

''بس ایک چیز نکلے گی اور بے تحاشا نکلے گی۔ خون بس خون۔'' دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس پڑیں۔ پھر لبنیٰ چلی گئی۔

اُجالا آج نرسری جانا چاہ رہی تھی مگر نہیں جا سکی تھی۔ کوئی بات نہیں کل سہی۔

☆......☆......☆

فروا نے اپنی تمام جائیداد اریز کے نام کر دی تھی۔ اریز اندر سے بہت خوش تھا مگر اُس نے اپنے کسی بھی عمل سے ثابت نہیں ہونے دیا۔ وہ کمال کا اداکار تھا۔ اُسے اپنے تاثرات چھپانے آتے تھے۔

اگلا دن سنڈے کا تھا۔ اُن کا نکاح ہونے کے لیے اریز نے جمعہ کا دن منتخب کیا تھا۔ اُس کے پاس چھ دن تھے جو بھی کرنا تھا بس انہی دنوں میں ہی کرنا تھا اور کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی پھر اُس کی نظر کرم کوثر پر آن ٹھہری۔ اُس نے ایک دن ہی خصوصی التفات برتا تو کوثر اُس کے قدموں میں آن گری۔ لڑکیاں اُس کے لیے بہت آسان ہدف ثابت ہوتی تھیں۔

حرام کھانے والے حرام کرنے والے خوش گمانیوں میں مبتلا رہتے ہیں کہ وہ باکمال ہیں۔ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ حرام چیزیں اُن کو پسند ہیں اور وہ حلال چیز کو بھی حرام کر کے کھانا پسند کرتے ہیں۔ تو ٹھیک ہے اللہ ایسے شرپسندوں کی رسی دراز کرتا ہے اور جب کھینچتا ہے تو ایسے لوگوں کی ساری طراری دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔

اریز نے کوثر سے گٹھ جوڑ کیا۔ کچھ دوائیاں اُسے لا کر دی تھیں جو کوثر کو دو دن کے اندر اندر فروا کو دینی تھیں۔ چائے میں پانی میں، کھانے میں جیسے بھی۔

اور ٹھیک دو دن بعد فروا کی طبیعت بہت خراب ہوگئی اریز محبت لٹاتا اُس کے ساتھ رو رہا تھا۔ وہ اُسے لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ بے ہوشی کی حالت میں اُس کا کام ہوگیا۔ جب اُسے ہوش آیا وہ اپنا بچہ کھو چکی تھی۔ وہ روئی تڑپی بلکی اریز اُسے ساتھ لگائے اپنائیت اور محبت کا مظاہرہ کرتا رہا۔

فروا کا اریز نے بہت خیال رکھا فروٹ، گوشت، دودھ اپنی نگرانی میں پلاتا۔ اریز نے فروا کے اتنے لاڈ کیسے اتنے ناز نخرے اٹھائے کہ حد نہیں، جمعرات کی رات انہوں نے اکٹھے کینڈل لائٹ ڈنر کیا اور جمعہ کی صبح صبح ہی اُسے گھر سے کال آئی تھی۔ اُس کی مما کی طبیعت بہت خراب تھی۔ اریز بہت اپ سیٹ تھا وہ فروا کو بتا کر بہاولپور چلا گیا۔

☆......☆......☆

''السلام وعلیکم سر!'' اریز کا ایک ہاتھ اسٹیرنگ پر تھا جبکہ دوسرے ہاتھ سے اُس نے سیل فون کان سے لگا رکھا تھا۔

''وعلیکم السلام مائی سن، کیسا ہے میرا شیر۔'' بہت پُر جوش آواز تھی۔

''ٹھیک نہیں ہوں سر، بہت تھکا تھکا سا۔''

''اوہ، کیا ہوگیا میرے چیتے کو۔''

''اُس عورت کے ساتھ چیک کر رہا تو خود پر جبر کر کر کے اُکتا سا گیا۔'' اُس نے ہینڈ فری لگالی کیونکہ اُسے اس طرح ایک ہاتھ میں سیل فون پکڑنے سے گاڑی ڈرائیو کرنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔

''واقعی لگتا ہے تم ذہنی طور پر بہت تھک گئے ہو۔'' مقابل بھی ماسٹر مائنڈ تھا اور بچپن سے پالا تھا اُس نے اریز چوہدری کو۔ اُس کا مزاج آشنا تھا۔

''جسمانی اور ذہنی تھکن نے نڈھال کر رکھا ہے، اُس گھٹیا عورت کے ڈراموں نے عاجز کر ڈالا مجھے، ابھی بھی مما کی بیماری کا بہانہ بنا کر نکلا ہوں ورنہ وہ کل نکاح کے لیے تیار بیٹھی تھی۔''

''مما کی بیماری کا بہانہ، کون سی مما ویری فنی۔'' بھرپور مزا لیتے ہوئے قہقہہ لگایا گیا۔

''میرا بہاولپور میں بہت عالیشان گھر ہے سر۔ جس کو دیکھ کر نگاہیں خیرہ ہوجاتی ہیں۔ میرے بابا سنگاپور میں ہوتے ہیں۔ بہن بھائی لندن پڑھنے گئے ہوئے ہیں ہاہاہا۔'' اریز نے اپنے ہی جھوٹے جملوں کا لطف لیا۔

''اب بات کہاں تک پہنچی۔'' مقابل سنجیدہ کام کی بات پر آگیا۔

''رحمان اپنی بیٹی کی ضد پر ہار گیا۔ اُس نے اُسے ملتان میں سیلون کی اجازت دی یا نہیں مگر چیک ضرور دے دیے، وہ بھی خالی۔'' وہ رُکا۔

''گڈ ویری گڈ۔''

''ایک چیک کیش کروایا اور گاڑی خریدی سیلون کا سامان خریدا، کچھ سامان کراچی لینے گئے تو وہاں اُس عورت (واضح رہے کہ اریز حقارت سے فروا کو عورت کہہ رہا تھا) کی طبیعت بگڑ گئی لیڈی ڈاکٹر کے پاس گئے تو پتا چلا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔''

''پھر......'' اریز بعد کی ساری تفصیل اُسے بتانے لگا وہ ساری بات سُن کر خوش ہوگیا۔

''شاباش مائی سن، اب کہاں جا رہے ہو اور آگے کیا پلان ہے۔''

''میں لاہور جا رہا ہوں، کچھ دیر پی سی میں رہوں گا، آرام کروں گا۔ پھر تازہ دم ہو کر آگے کا پلان کریں گے سر، سب کچھ میرے نام ہو چکا ہے۔ فروا رحمان بے کار پرزہ ہوگئی ہے اب

میرے لیے کافی رقم بھی ہے میرے پاس اور خالی چیک بھی۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو اب فروا کو 'باڑے' میں پہنچاؤ گے کہ قبر میں۔''

''سر ابھی کچھ پتا نہیں، جیسے آپ کو مناسب لگے بتا دیجیے گا۔'' اریز نے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ اُسے بہت زوروں کی بھوک لگی تھی۔ وہ لاہور بس پہنچنے ہی والا تھا۔

''اوکے اگلا 'پروجیکٹ' قابل توجہ ہے' بیا ہمدانی پولیس آفیسر کی کزن ہے ذرا بچ کر۔''

''آج تک ہم نے کتنی عورتیں، بچے اٹھائے کیا کرلیا ہمارا پولیس والوں نے۔'' اریز طنزیہ ہنسا۔

''ٹھیک ہے بیٹا اپنا خیال رکھنا اور رابطے میں رہنا، میں کل اسلام آباد سے لاہور ملتا ہوں تم سے، اور ہاں سجاد کی کوئی خیر خبر ہے۔'' اُسے اچانک سے یاد آیا۔

''سر آپ شاید بھول رہے ہیں اُس نے آپ کو بتائی تھی ساری کہانی۔''

''ہاں شاید وہ کسی لڑکی نے دوسری کا نام استعمال کر کے اُسے دھوکا دیا تو سجاد نے طیش میں آ کر اُسے مار ا ذلیل کیا اور......''

''جی جی سجاد بلوچ کو آپ نے رحمان کی دوسری بیٹی عروہ رحمان کا شکار کرنے کا کہا تھا۔ سجاد نے کالج میں امن کو عروہ سمجھ کر بات چیت کی اور امن نے چالاکی کی۔ وہ بھی عروہ بن گئی سیدھی سادی سی لڑکی تھی۔ جب سجاد پہلی بار اُسے ملا تو وہیں میں نے اُسے کال کر کے بتا دیا کہ یہ رحمان کی بیٹی عروہ نہیں ہے بلکہ فرقان کی بیٹی امن ہے جس کا باپ معمولی سے جنرل اسٹور کا مالک ہے۔ بس سجاد تو طیش میں آ گیا......''

''نایاب اُلو کا پٹھا اُسے بتا نہیں سکتا تھا کہ یہ مطلوبہ لڑکی نہیں ہے۔'' سر کو طیش آنے لگا۔

''نایاب کا کوئی دوش نہیں، دراصل وہ دونوں اکٹھی کالج آتی جاتی تھیں۔''

''بھاڑ میں گئی وہ امن شمن۔''

''میں نے اُسے عروہ کا نمبر دے دیا ہے اب وہ بہت جلد عروہ رحمان پر کام کرے گا۔ وہ میرے ساتھ رابطے میں ہے۔''

''چلو ٹھیک اب پھر بات کریں گے بیٹا۔'' وہ محبت بھرے لہجے میں بولا۔

''اوکے سر ٹیک کیئر، ملتے ہیں جلد۔'' اریز نے سیل فون ڈیش بورڈ پر پٹخا اور گاڑی کا رُخ پی سی کی طرف موڑ دیا۔

☆......☆......☆

اُجالا عرفان کے ساتھ نرسری جا کر بہت سارے بیج، گملے اور پنیری لے آئی تھی اور اب صبح سے خود بھی ہلکان ہو رہی تھی اور ساتھ عرفان کو بھی لگا رکھا تھا۔

اُن کے گارڈن میں ایک مصنوعی پہاڑی بھی بنائی گئی تھی۔ وہ اونچائی میں بہت زیادہ نہیں تھی۔ چوڑائی کافی پھیلی ہوئی تھی پہاڑی دیکھنے والوں کو دل لبھاتی تھی اور دیکھنے والا تادیر کھو کر رہ جاتا تھا۔ محبت و محویت کا عالم ہی اور ہوتا تھا۔ اُس کی وجہ پہاڑی پر نصب کیسے مختلف رنگوں کے پتھر اور پتھروں کے درمیان اُگی ہوئی سرسبز شاداب گھاس، کچھ پہاڑی کا مخصوص حصہ مختلف رنگوں کے گلابوں کی بہار دکھا رہا تھا اور سب سے زیادہ توجہ طلب پہاڑی کے بیچوں بیچ بہتا پانی کا جھرنا اتنا دلفریب منظر پیش کرتا تھا کہ بس دیکھنے والا مبہوت سا ہو کر مسمرائز ہو جاتا تھا۔ آبشار کی مانند گرتا پانی تالاب کے صاف شفاف پانی میں شامل ہو جاتا تھا۔

اُجالا کو اگر اپنے گارڈن سے اتنی محبت تھی تو...... ہونی بھی چاہیے تھی۔ گارڈن تھا ہی توجہ کھینچ لینے والا۔ اُجالا عرفان کو مختلف ہدایات دے رہی تھی۔ اُس کے بال بار بار بکھر کر پسینے بھری پیشانی پر چپک جاتے تو اُجالا اپنے مٹی بھرے ہاتھوں سے اپنی لہراتی زلفوں کو کانوں کے پیچھے اُڑس لیتی۔ کھاد مٹی سے اُس کے ہاتھ لتھڑے ہوئے تھے۔ اُس کی بلیو جینس کی پینٹ کیچڑ سے جگہ جگہ بھر چکی تھی کہ اُسے چنداں پروا نہیں تھی وہ جتی ہوئی تھی۔

وہ اتنی مگن تھی کہ اُسے خبر ہی نہیں ہوئی کہ کب سعد مرتضٰی آئے کب چوکیدار نے گیٹ کھولا اور کب سعد نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی وہ عرفان سے سب گملے ترتیب سے رکھوا رہی تھی۔

تبھی سعد مرتضٰی اُسے آوازیں دیتا وہیں چلا آیا۔

''اوہ مائی گاڈ، یہ کون ہے۔'' سعد نے اُس کی حالت دیکھ کر مصنوعی حیرت کا مظاہرہ کیا۔

''اُجالا...... ہوں۔'' وہ لاڈ سے بولی۔

''نو، نو، تو اُجالا نہیں ہوسکتی یہ، میری لاڈلی بہن اُجالا تو جہاں جاتی ہے روشنی سی بکھر جاتی ہے ہر طرف اُجالا ہوجاتا ہے، یہ تو کوئی گندی سندی سی لڑکی ہے۔'' وہ شرارت پر آمادہ تھا۔ اس لیے مسلسل اُسے زچ کررہا تھا۔

''بھیا......'' اُجالا ٹھنکی اور سعد کی طرف لپکی۔

''پیچھے پیچھے! مجھے گندے ہاتھ مت لگانا، چلو نہاؤ جاکر، گندی بچی۔''

''یہ کیا ہے......'' سعد کے ہاتھوں میں تھامے شاپرز پر اُس کا اب دھیان گیا تھا۔

''سرپرائز ہے، پہلے نہا کر اچھا سا تیار ہوجاؤ پھر دکھاؤں گا۔'' سعد نے تجسس پھیلایا۔

اُجالا فریش ہوکر نکلی تو سعد نے ایک شاپر اُسے تھما کر کہا کہ یہ پہنو، اُجالا نے شاپر کھول کر دیکھا بہت اسٹائلش سا پنک کلر کا بوتیک کا سوٹ تھا۔ اُجالا نے سوالیہ نظروں سے سعد کو دیکھا تو انہوں نے اسے فٹافٹ تیار ہونے کا کہا وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

جب وہ تیار ہوکر نکلی تو تیاری کے نام پر اُس نے اپنے لمبے گھنے سیاہ بال کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ آنکھوں میں ہلکی سی کاجل کی دھار تھی، لبوں پر نیچرل لپ اسٹک لگالی تھی، اتنی سی تیاری نے ہی اُس کے معصوم حسن کو دوآتشہ کردیا تھا۔

آج 25 مئی تھی۔ اُجالا کی برتھ ڈے! وہ ہر سال بھول جاتی تھی اور سعد ہر سال یاد رکھتا تھا۔ ابھی بھی اُس نے ہال میں انتظام کروایا تھا۔ بڑی سی گلاس کی ٹیبل پر بہت بڑا چاکلیٹ کیک رکھا تھا۔ سولہ موم بتیاں جلائی گئی تھیں۔ سارا خاندان مدعو تھا۔ مہمان آگئے تھے۔ لبنیٰ اس کے امی ابو اُس کے دو بہن بھائی، خالہ آئی تھیں۔ ان کے بیٹے فرقان اور رحمان بھی آئے تھے۔ خاندان کے اور بھی لوگ تھے۔ اُجالا پہلے تو دنگ رہ گئی اتنے لوگ دیکھ کر، پھر اُسے ساری بات سمجھ میں آگئی تو وہ بے انتہا خوش ہوئی۔

''آؤ اُجالا، یہ سرپرائز تھا میری جان، میری گڑیا۔'' بہت سی نظریں اُجالا کی طرف اٹھی تھیں اور تھوڑی دیر بعد واپس لوٹ آئی تھیں۔ مگر رحمان احمد کی نظریں واپس پلٹنا بھول گئیں۔ رحمان اُن کا کزن تھا اور سعد اور رحمان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ رحمان زیادہ تر سعد کو باہر ہی مل لیتا تھا۔ گھر کم کم ہی آنا ہوتا تھا۔ مگر آج کیا ہوا۔ عجیب سا فیل ہورہا تھا۔ وہ عمر میں اُس سے کافی چھوٹی تھی، مگر دل چرا کرلے گئی تھی۔ خود ہنستی مسکراتی گلے لگی ہوئی تھی سعد کے۔

(اس خوب صورت ناولٹ کی اگلی قسط آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

ناولٹ

اُمِ مناہل

گھنا سایا

جب عاتقہ کو خالہ کی آمد کا مقصد پتا چلا تو اس نے تڑپ کر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر کے امی کو انکار کر دیا اور سفیان کے رشتے پر سمیعہ کے لیے غور کرنے کا مشورہ دیا مگر وہ ماں تھیں، کیا کر سکتی تھیں۔ مرد ایک ساتھ چار رکھ لے کوئی فرق نہیں پڑتا مگر......

زندگی سے نبرد آزما ہوتی دوشیزہ کا زندگی نامہ، ناولٹ کی صورت

بچپن میں اس نے سب سے زیادہ جو کھیل کھیلے تھے وہ گڑیا گڈے کی شادی یا پھر آپا بوجھی تھی۔ یوں تو گڑیوں سے وہ بچپن سے کھیل رہی تھی مگر گڑیا کی شادی کا کھیل اُس نے صرف دس برس کی عمر میں کھیلا تھا۔ جب 5th کلاس میں گڑیا کی شادی کا سبق پڑھا تھا۔ آنگن کے ایک مخصوص سے کونے میں وہ اپنے کھلونے اور چھوٹے بہن بھائیوں کو لے کر بڑے شوق سے اپنے ارمان پورے کیا کرتی تھی۔

اس کونے کے ذرا فاصلے پر نیم کا درخت گرمیوں کی تپتی دھوپ کو کم کرنے کے لیے کافی ہوتا تھا۔ خوبصورتی سے سجا ہوا محبت بھرا گھر اس کی سب سے بڑی کمزوری تھا۔ بڑے سے آنگن کے اس کونے کو خوبصورتی کے ساتھ سجا کر وہ ایک چھوٹے سے گھر کا نقشہ بنا دیتی جہاں ڈائننگ، ڈرائننگ روم، ٹی وی لاؤنج اور کمرے چھوٹے چھوٹے حصوں کی صورت میں موجود ہوتے ایک طرف سے جاتے ہوئے زینے کی سیڑھیاں اس کا کچن قرار پاتیں۔

سردیوں کی دھوپ، بہار کی خوشگوار ہوا، گرمیوں کی تپتی دھوپ میں نیم کی ٹھنڈی چھاؤں اور برسات کے موسم میں بوندوں کی پھوار سے وہ اس وقت بہت لطف اندوز ہوتی جب درخت کے اوپر پرندے اپنی مخصوص بولی میں ''اللہ'' کا ذکر کرتے ہوئے اپنی چہچہاہٹ سے اس کے کانوں میں رس گھول دیتے۔ لیکن خزاں کے آتے ہی وہ پرندے نہ جانے کہاں چلے جاتے اور جاتے جاتے اس کے خوبصورت لمحات اپنے ساتھ لے جا کر اس کو افسردہ کر جاتے۔ پھر وہ بہار کا انتظار کرتی پھر جوں ہی بہار کے موسم کی آمد ہوتی اس کے تمام پرندے دوست واپس آ جاتے۔

☆......☆......☆

اس کے علاوہ اسے بچپن سے ہی فوجی بہت پسند تھے۔ حالانکہ اس کے خاندان میں دور دور تک کوئی فوجی نہیں تھا مگر ان کے جن کارناموں سے پاکستان کی تاریخ بھری ہوئی تھی اس پر اسے بہت فخر

تھا فوج کے حوالے سے وہ ہر پروگرام بہت شوق سے دیکھا کرتی تھی۔

یہاں تک کہ وہ جب گڑیا گڈے کی شادی کرتی تو دولہا ہمیشہ وہ فوجی ہوتے جو کھلونوں کی صورت میں اس کے پاس موجود تھے اور گڑیا کی جگہ اپنے تصور میں اپنے آپ کو دلہن بنے فوجی گڈے کے پہلو میں بیٹھے ہوئے محسوس کرتی تو اس کا سیروں خون بڑھ جاتا۔

اس کے علاوہ سب سے زیادہ دلچسپ منظر وہ ہوتا جب وہ اپنے بابا جان کے ساتھ بازار جاتی تو گڑیا گڈے کے ساتھ ساتھ فوج سے منسلک کھلونے خریدنے پر اس کے بابا جان اس کے شوق کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے۔ پھر یہ بات سارے خاندان میں مشہور ہوگئی۔ اس کے کھلونوں میں مختلف چیزوں کے علاوہ فوجی جیپ، ٹینکر، پستول، بندوق اور چابی سے چلنے والے وہ فوجی گڈے شامل تھے۔ جو اس کے چچا نے اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے بڑے پیار اور خلوص کے ساتھ کوئٹہ سے بھجوائے تھے۔

جب وہ فوجی چلتے تو ایسا تاثر پیش کرتے جیسے ٹریننگ اور جنگ کے وقت ایک فوجی کرتا ہے۔ ان ہی کھیلوں کے درمیان اس کی امورِ خانہ داری میں دلچسپی بڑھتی گئی۔

ماں کے ساتھ کام میں ہاتھ بٹانا تو اس نے بچپن سے ہی شروع کر دیا تھا اور پندرہ سال کی عمر تک وہ ایک ہنر مند، سلیقہ شعار لڑکی کا روپ دھار چکی تھی۔ اس عمر میں آکر وہ اس درخت کے نیچے کھیلتی نہیں بلکہ نماز فجر کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کرتی اس کے بعد چائے بنا کر بابا اور اماں جان کو پیش کرتی اور پھر اسکول جانے کی تیاری کرتی۔ یہ معمولات اس کی روزمرہ کی روٹین میں شامل ہو چکے تھے۔

اس کے علاوہ وطن کی محبت کا جذبہ اس کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ 7th کلاس میں اس نے اسلامیات کے ایک سبق میں ہمارے پیارے نبی ﷺ کی مدینہ کی طرف ہجرت کا واقعہ پڑھا تھا۔ جب ہجرت مدینہ کے وقت رسول اللہ ﷺ نے مکہ کی طرف دیکھ کر فرمایا تھا۔

''اے مکہ مجھے تجھ سے محبت بہت ہے مگر تیرے لوگ مجھے یہاں رہنے نہیں دیں گے۔'' ان لفظوں نے اس کے دل پر اتنا گہرا اثر کیا تھا کہ جو بھی اس کے وطن کے خلاف بات کرتا اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔

اسے اپنے وطن سے دل و جان سے محبت تھی۔ اس کی سب سے بڑی خواہش آرمی میں جا کر وطنِ عزیز کی خدمت کرنا تھی مگر افسوس گھر اور خاندان کے ماحول نے اسے اس بات کی اجازت نہیں دی اور اس کی خواہش دل کے کسی نہاں خانے میں دفن ہوگئی۔

☆......☆......☆

زندگی کے بیس برس گزر جانے کے بعد نہ بہن بھائی وہ رہے تھے۔ جو اس کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔

سب کالج یونیورسٹیوں میں پہنچ کر اپنا مستقبل سنوارنے کی جدوجہد میں لگ گئے تھے اور نہ ہی اس کے پرندے دوست رہے تھے کیونکہ آنگن میں چھوٹی سی بیٹھک بن جانے کی وجہ سے درخت کو کاٹنا پڑا اور درخت کے کٹتے ہی پرندوں کے گھونسلوں کے ساتھ ساتھ اس کی تفریح کا واحد ٹھکانہ بھی ختم ہوگیا۔

درخت کی کٹائی کے وقت اس کی عمر وہ تھی جب انسان لڑکپن کی حدود سے نکل کر جوانی کی

دہلیز پر قدم رکھ رہا ہوتا ہے۔ اس نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دی کہ میں اب گھر کے دوسرے حصے سجاؤں گی مگر جہاں اس نے گھر کو سنوارنے کی کوشش کی۔

بھائیوں کی بدتمیزی سے ہمیشہ اس کی محنت پانی میں مل جاتی اور گھر ایک دفعہ پھر کباڑ خانہ لگتا۔ وہ دل مسوس کر رہ جاتی کیونکہ بھائی بھی اب اس کی ایک آواز پر لبیک کہنے والے نہیں رہے تھے بلکہ خود مختار ہو گئے تھے۔ جنہیں ہر معاملے میں اپنی مرضی چلانی ہوتی ہے۔ ایک دفعہ پھر اس کی آرزو سوچ بن کر رہ جاتی کہ اب میں اپنا صرف وہ گھر سجاؤں گی جو اس کا اپنا ہوگا۔ جس کی زمین اپنی اور چھت اپنا سائبان ہوگی۔ جہاں صرف اس کی اپنی مرضی چلے گی۔ جہاں وہ اپنے ساجن کے ساتھ مستقبل کے حسین خواب دیکھے گی۔ کیونکہ اب وہ عمر کے اس حصے میں تھی۔ جہاں بچپن اور اس سے منسلک چیزیں بہت دور رہ جاتی ہیں۔

☆......☆......☆

اِدھر عمر کا اکیسواں سال لگا۔ اُدھر اس کے رشتے آنا شروع ہو گئے۔ چند رشتے تو خاندان کے ہی موجود تھے کیونکہ اس کا سگھڑاپا پورے خاندان میں مشہور تھا۔ اس کی رشتے دار خاتون اپنی بیٹیوں کو اس کی مثالیں دیا کرتی تھیں۔ سب

سے پہلے پھوپی نے اپنے بڑے بیٹے اور خاندان کے اکلوتے فوجی میجر ولید کا رشتہ دیا پھر خالہ بھی کسی سے پیچھے رہنے والی نہیں تھیں۔ وہ بھی اپنے خوبرو فرمانبردار بیٹے سفیان کا رشتہ لے کر آ گئیں۔

جس کی ابھی حال ہی میں بینک میں جاب لگی تھی اور آگے ترقی کے بہت مواقع تھے۔ اس کے من میں شدت سے خواہش جاگی۔ کاش ولید کا رشتہ قبول کرلیا جائے۔ وجہ نہ ہی اس کے اونچے عہدے کی تھی اور نہ ہی محبت وغیرہ کا کوئی چکر تھا بلکہ وجہ صرف وہی بچپن سے فوجی پسند ہونے کی تھی۔

پھوپی اور خالہ دونوں نے ہی بہت محبت سے اس کا رشتہ دیا تھا۔ مگر اس کے والدین کو فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا اور دونوں میں دن بدن یہ مذاکرات طول پکڑتے جارہے تھے کہ کس کے میکے کی لاج رکھیں کیونکہ دونوں لڑکے ہی اپنی اپنی جگہ وجیہہ شکل، خوشحال، برسر روزگار، پڑھے لکھے اور سب سے بڑھ کر خاندانی دیکھے بھالے تھے۔ پھر خاندان میں ان کی کسی سے اَن بن بھی نہیں تھی۔ جو وہ کسی کو رشتہ دینے میں ہچکچاتے۔ امی نے عاتقہ سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے اپنی مرضی والدین کے سپرد کردی۔

تب دونوں نے ایک دوسرے کی مرضی اور خواہش کا احترام کرتے ہوئے پہلے آنے والے رشتے کو اللہ کی طرف سے تحفہ سمجھتے ہوئے قبول کرلیا۔ دوسری طرف ان کے ذہن میں اپنی بیٹی کے بچپن کی وہ یادیں بھی تھیں۔ جب اسے فوجی اچھے لگتے تھے۔ اس موقع پر خالہ کو مطمئن کرنا بہت جان جوکھوں کا کام تھا۔ جو اس کی ماں نے خوش اسلوبی سے پہلے آنے والے رشتے کی اہمیت پر ٹھوس دلائل دے کر مکمل کردیا۔

☆......☆......☆

ولید کا رشتہ قبول کرلیا گیا جب اس کے کانوں میں یہ خبر پہنچی تو اسے اپنی بچپن کی خواہش پوری ہوتی محسوس ہوئی وہ سیکنڈ کے ہزارویں لمحے میں اپنے گھر کو جنت نما سجا چکی تھی۔

جس خاندان میں کبھی کسی لڑکے نے فوجی لباس نہ پہنا ہو اس خاندان کے پہلے فوجی لڑکے کی بیوی ہونے کا احساس اسے بہت تسکین دیتا تھا اور اس نسبت کے بعد تو وہ اپنے آپ کو ہواؤں کے دوش پر اڑتا ہوا محسوس کررہی تھی۔

رشتہ قبول ہوتے ہی دونوں طرف سے شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ طے یہ پایا کہ اس دفعہ ولید چھٹیوں پر آئے گا تو دونوں کو رشتہ ازدواج میں باندھ دیا جائے گا۔ یہ دن اس کے لیے بہت اہمیت کے حامل تھے۔ عموماً ایسا ہوتا ہے ان دنوں لڑکیوں پر اپنے مجازی خدا کی تصویر چھائی رہتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ اس کے برعکس ہوا وہ ولید سے زیادہ اپنے گھر کو سجانے سنوارنے کے خیالوں میں کھوئی رہتی لیکن اسے یہ پتا نہیں تھا کہ خواب و خیال کی عمر کتنی ہوتی ہے۔ ذرا سی آہٹ ہوئی اور ختم۔

☆......☆......☆

اِدھر ولید نے چھٹیاں ملنے کا اعلان کیا اِدھر شادی کی تیاریوں میں تیزی آ گئی۔ روزانہ دونوں طرف بازاروں کے چکر لگتے کیونکہ پندرہ روزہ چھٹیوں میں پروگرام کو اس طرح ترتیب دینا تھا کہ شادی کے بعد کچھ چھٹیاں باقی رہیں تاکہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزار سکیں۔ لہٰذا طے پایا کہ جس دن ولید کی آمد ہو اس دن مایوں دوسرے دن شادی تیسرے

دن ولیمہ اس پروگرام کے تحت اس کی شادی کی تاریخ رکھی گئی۔

اور یوں تین دن کے مختصر سے عرصے میں وہ عاتقہ سلیمان سے عاتقہ ولید بن گئی۔ شادی کے بعد ایک الگ ہی دنیا تھی۔ یوں تو وہ بچپن سے ہی اس گھر میں آتی رہی تھی۔ مگر تب یہ گھر اس کی پھوپی کا تھا اور اب وہ جس بندھن کے ساتھ آئی تھی اس نے گھر میں رہنے والے ہر فرد سے رشتہ دوطرح سے بدلا تھا۔

ماں باپ اور پھوپا پھوپی کی جگہ ساس سسر نے اور بہن بھائی کزنز کی جگہ دیور نندوں نے لے لی تھی۔ اگر کچھ نہیں بدلا تھا تو وہ اس کی خوبصورت گھر کی خواہش تھی۔ اپنی اسی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس نے دن رات ایک کر دیا تھا۔

کچھ ہی عرصے میں اس کی محنت رنگ لے آئی۔ گھر کا ہر حصہ اس کے سلیقے کی تصویر نظر آتا۔ کوئی شخص بھی اس کے سلیقے کی تعریف کیے بنا نہ رہ پاتا۔ شروع سے ہی اپنے خیالوں میں مگن رہنے کی وجہ سے وہ بہت خاموش طبع ہو گئی تھی۔ لہٰذا سسرال میں بھی کبھی کسی سے اَن بن نہیں ہوئی۔

☆......☆......☆

سال بھر کا عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ عاتقہ کی شادی کے دو ماہ بعد خالہ بھی اپنے دیور کی بیٹی میمونہ کو سفیان کی دلہن بنا کر لے آئیں۔ میمونہ ان کے لیے اچھی بہو ثابت ہوئی۔ جس نے آتے ہی سارے گھر کی ذمہ داری سنبھال لی۔ ان دنوں وہ تخلیق کے مراحل سے گزر رہی تھی۔ سفیان نے تو اسے ہتھیلی کا چھالہ بنا لیا تھا۔ اس کے کھانے پینے کا خیال رکھنا۔ روز شام میں اس کو آؤٹنگ پر لے جانا اس کی ڈیوٹی میں شامل تھا۔ اکثر اوقات وہ کھانا بھی باہر کھا کر آتے۔ ایک بھرپور اور آئیڈیل زندگی گزر رہی تھی۔ وہ آنے والی زندگی کے ڈھیروں خواب دیکھتے، بچے کے مستقبل کی ڈھیروں باتیں کرتے ان کی زندگی ان دنوں خوشیوں کے ہنڈولے میں جھول رہی تھی۔

☆......☆......☆

ان دنوں ولید چھٹیوں پر آیا ہوا تھا۔ جب امی نے ولید پر کسی اچھی گائنا کالوجسٹ سے عاتقہ کا چیک اپ کرانے کے لیے زور ڈالتے ہوئے اُسے سمجھایا۔

''ڈیڑھ سال کے عرصے میں ایک بچہ گود میں آ جاتا ہے۔ جب ہماری شادی کو ڈیڑھ سال ہوا تھا تو تم چھ ماہ کے میری گود میں تھے اور گھٹنے گھٹنے چلتے تھے۔ پہلا بچہ جتنی جلدی ہو جائے اچھا ہے۔ لوگوں کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں۔ ورنہ لوگ جینا حرام کر دیتے ہیں اور پھر زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد پیدائش میں بھی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔'' ولید نے کچھ اُلجھ کر جیسے اُن کی بات کی نفی کی۔

''پیاری امی جان آپ یہ بات جان لیں کہ لوگوں کی زبانیں کبھی بند نہیں ہوں گی۔ اگر آپ نے لوگوں کی زبانوں کی پروا کی تو اپنی بہت سی خوشیاں کھو دیں گی۔ شادی نہ ہو تو لوگوں کی زبانیں کہ اسے کوئی قبول نہیں رہا ہے۔ اولاد نہ ہو تو لوگوں کی زبانیں اسے بنجر زمین ہونے کا خطاب دے ڈالتی ہیں۔

بیٹا نہ ہو تو لوگوں کی زبانیں کہ بیٹا نہ ہوا۔ اب باپ دادا کا نام کیسے چلے گا۔ کوئی خوش ہے تو اس کے لیے لوگوں کا حسد، کوئی غمزدہ ہے تو اس سے اظہارِ ہمدردی تو کر دیتے ہیں۔ مگر اس کے لیے مرہم نہیں بنتے اور اظہار ہمدردی بھی وہ لوگ

کرتے ہیں جن میں ذرہ برابر شرافت ہوتی ہے۔
ورنہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی کے آنسو دیکھ کر بھی بہت خوش ہوتے ہیں۔
بہر حال میں آپ کے حکم کی تعمیل ضرور کروں گا کیونکہ مجھے دنیا کی نہیں اپنی اور خود سے منسلک رشتوں کی پرواہے اور پھر آپ کو دادی جیسے رشتے پر فائز کرنا ہے۔''

آخری جملہ اس نے شوخی اور شرارت سے ماں کو دیکھتے ہوئے کہا تو لمحے بھر کے لیے اُن کے چہرے پر تبسم کی لکیر جھلک گئی اور وہ محبت بھری نظروں سے بیٹے کو دیکھتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئیں۔

پھر اُس شام وہ ڈاکٹر سارہ کی کلینک سے نکل رہے تھے تو بہت مطمئن تھے۔ کیونکہ ڈاکٹر سارہ کی رپورٹ کے مطابق وہ دونوں بالکل نارمل تھے۔
بس اللہ کے ہاں دیر تھی مگر اندھیر نہیں۔

☆......☆......☆

وقت کا پنچھی اپنی مخصوص رفتار سے پَر لگا کر اڑتا رہا۔ ان کی شادی کو تین سال کا عرصہ بیت گیا مگر ابھی تک وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ ماں نے اُس کے بعد سے ولید کے اتنے ٹھوس دلائل دینے کے بعد اس متعلق کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ اللہ کی رضا پر راضی ہوگئی تھیں۔ کیونکہ دادی تو وہ اور بچوں کی بھی بن سکتی تھیں مگر یہ ضرور سوچتی تھیں کہ اولاد ماں باپ کے درمیان بہت مضبوط کڑی ہوتی ہے۔

ولید کی سنگت میں عاتقہ نے کبھی بھی اولاد کی کمی محسوس نہیں کی تھی مگر ماں بننے کی خواہشمند ضرور تھی اور یہ آرزو کس عورت کو نہیں ہوتی۔
شادی کے تین سال بعد بھی وہ خالی گود تھی اور سفیان جس کی شادی اس کے بعد ہوئی تھی۔

وہ تین سال کے عرصے میں دوسری بار باپ بننے والا تھا۔ شادی کے پہلے سال ہی سعد نے آکر ان کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دیا تھا۔

☆......☆......☆

اُن دنوں ولید ایک ہفتے کی چھٹی پر آیا ہوا تھا کہ اُس نے ولید سے خالہ کے گھر جانے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ دونوں امی سے اجازت لے کر خالہ سے ملنے چلے گئے۔

خالہ نے خندہ پیشانی کے ساتھ اُن کا استقبال کیا۔ وہاں سفیان اور میمونہ کی مکمل زندگی کو دیکھ کر اسے اپنی زندگی سونی سونی اور نامکمل محسوس ہوئی۔ اس دل میں پھر بچے کی خواہش جاگ اٹھی۔

اس رات جب وہ سونے کے لیے لیٹی تو ولید کو اپنی خواہش بتا کر اس کی مرضی جاننا چاہی۔
ولید نے اسے حقیقت پر مبنی ایک ٹھوس جواب دیا۔
''جب اللہ کی مرضی ہوگی بچہ بھی ہو جائے گا۔
تم بتاؤ بچے کی وجہ سے ہمارے بیچ کبھی اَن بن ہوئی تم نے کبھی میری محبت میں کمی دیکھی۔ مجھے تم سے اپنی تمام تر شدتوں کے ساتھ محبت ہے۔
اللہ اگر مجھے اولاد کی نعمت سے نوازے گا تو اس کا شکر ہے ورنہ میں ساری زندگی تمہارے ساتھ یونہی صبر و شکر کے ساتھ گزار دوں گا۔ تم اس معاملے میں پریشان ہونا چھوڑ دو اور سکون سے رہو۔ میں نے اپنی مرضی اللہ کے سپرد کر دی ہے۔ تم بھی ایسا ہی کرو۔ یہ سب اللہ کے معاملے ہوتے ہیں۔ وہ ہمارے حق میں جو بہتر سمجھے گا وہی کرے گا۔''

پھر عاتقہ کی طرف شرارتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔
''اگر تمہاری شدت سے بچے کی خواہش ہے

تو تھوڑا اور انتظار کرو۔ میں آئندہ چھٹیوں پر آؤں گا تب دیکھیں گے......'' مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ آئندہ پھر کبھی ایسا موقع نہیں آئے گا۔ جب وہ دونوں اس موضوع پر بات کریں گے۔

ولید کو آئے ابھی تین چار دن ہی گزرے تھے کہ ہندوستان نے مشرقی پاکستان پر حملہ کردیا۔ اس کی چھٹیاں ایمرجنسی میں منسوخ کردی گئیں۔

یوں تو وہ ہمیشہ ہی چھٹیاں گزار کر جاتا تھا اور جاتے جاتے خوبصورت لمحات اس کی جھولی میں ڈال جاتا مگر اس دفعہ تو انتہائی عجلت میں جانا پڑا تھا اور جانے کا مقصد بھی وہ جنگ تھی۔ جو زبردستی اس کے پیارے وطن پر مسلط کردی گئی تھی۔ ایک دفعہ پھر ہندوستان نے اپنا کاری وار کیا تھا۔ بہرحال اس دفعہ وہ جو یادیں اور لمحات اسے سونپ کر گیا تھا وہ خوشگوار تو بہت تھے۔ مگر اب وہ اُن لمحات میں کھوئے رہنے کی بجائے حالات بہتر ہونے کی دعائیں مانگا کرتی کیونکہ اب وہ اس کی تصوراتی دنیا نہیں حقیقی زندگی تھی۔ اور ضرور نہیں جو خوابوں خیالوں میں ہو وہی حقیقت بن کر سامنے آجائے۔ خواب اور حقیقت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ مگر آنے والے وقت میں کس قسم کے حالات اور واقعات چھپے ہیں یہ کوئی نہیں جانتا۔

مشرقی پاکستان کے حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے تھے۔ ولید کی صرف اتنی خبر آئی تھی کہ اس کی ڈیوٹی مشرقی پاکستان کے بارڈر پر لگادی گئی تھی۔ وہ ہر پل اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہوکر جنگ بند ہونے اور ولید کے سلامتی سے لوٹ آنے کی دعائیں مانگا کرتی تھی۔ لیکن اس کی تمام دعائیں رائیگاں گئیں۔ نہ ہی ملک کے حالات بہتر ہوئے اور نہ ہی ولید کی کوئی خبر آئی۔ خبر ملی تو صرف اتنی کہ پاک فوج نے ہتھیار ڈال دیئے اور ملک کو دولخت کردیا گیا۔

یہ خبر اس پر بجلی بن کر گری۔ ولید کی ابھی تک کوئی باقاعدہ خبر نہیں ملی تھی کہ وہ زندہ ہے یا خدانخواستہ...... شہید ہوگیا یا پھر قیدی بنالیا گیا ہے۔ اسی کشمکش میں تقریباً پندرہ دن گزر گئے۔

☆......☆......☆

اسی دوران اسے سفیان کے یہاں جڑواں بچوں کی پیدائش کی خبر ملی۔ سفیان کے بچوں کی خوشی اور پاک فوج کے ہتھیار ڈالنے کے غم کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ وہ اسپتال پہنچی۔ دونوں نومولود بچے جھولے میں دنیا سے بے خبر میٹھی نیند سو رہے تھے۔ یہاں آکر پتا چلا کہ پیچیدگی کے باعث میمونہ کی حالت بہت سیریس ہے اور ڈاکٹر نے بارہ گھنٹے بہت اہم بتائے ہیں۔ مگر بارہ گھنٹے تو بہت ہوتے ہیں۔ ابھی بچوں کو دنیا میں آئے دو گھنٹے ہی گزرے تھے کہ میمونہ زندگی کی بازی ہار گئی۔ نومولود بچے جنہوں نے ابھی ماں کی گود کالمس محسوس بھی نہیں کیا تھا کہ دنیا میں آتے ہی ماں کی ممتا سے محروم ہوگئے۔

☆......☆......☆

میمونہ کا چہلم کرکے وہ یہ سوچ کر گھر آئی تھی کہ اب کی بار ولید چھٹیوں پر آئے گا تو اسے سفیان کے ایک بچے کو گود لینے کے لیے راضی کرلے گی مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی وہ اس کی زندگی کا سب سے بدترین دن تھا۔ جب ولید کی میت گھر آئی۔ ابھی تو میمونہ کا غم ہی تازہ تھا کہ خاندان کا ایک جوان بیٹا جامِ شہادت نوش فرما گیا۔

ولید کی میت لانے والے جوانوں نے بتایا تھا کہ ولید کی ڈیوٹی مغربی پاکستان کے بارڈر پر لگادی گئی تھی۔ جہاں دشمن کی طرف سے داغے گئے ایک گولے نے اسے شہادت عطا کردی۔

ولید کی میت دیکھ کر تو اس پر جیسے سکتہ ہی طاری ہو گیا۔ شدت غم نے گویا اس کی گویائی ہی چھین لی۔ پھوپی کا واویلا، ماں کی آہیں بہنوں کا ماتم بھی اسے نہ رُلا سکا۔ بس خالی خالی آنکھوں سے سب کو دیکھتی رہی۔ بابا جان نے اس کے سامنے ولید کا ذکر کر کے رُلانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر سب بے سود ثابت ہوئیں۔

☆......☆......☆

امی چہلم تک اس کے ساتھ رہیں وہ بھی کب تک رہتیں انہیں بھی آخر ایک دن اپنے گھر جانا تھا۔ امی کے جانے کے بعد اسے بہت اکیلا پن محسوس ہوتا۔ دن تو کیسے نہ کیسے گزر رہی جاتا۔ مگر رات اس پر بہت بھاری گزرتی خاص کر اس وقت جب رات کو اچانک چونک کر اس کی آنکھ کھل جاتی تو بیڈ کے دوسرے کنارے کو خالی دیکھ کر اسے ہول اٹھتے ویسے تو ولید کے ڈیوٹی پر جانے کے بعد وہ کمرے میں اکیلی ہی سوتی تھی مگر اس وقت میں اور اس وقت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اس وقت اسے ولید کے برابر میں نہ ہونے پر بھی اس کے قرب کا احساس ہوتا اور وہ اسے تصور میں ہی اپنے قریب محسوس کر کے خیالوں میں ہزاروں باتیں کر ڈالتی اس وقت اسے ولید کے لوٹ آنے کا انتظار ہوتا اور اس انتظار میں میٹھا میٹھا درد، پھر دوسری صبح کا سورج ایک نئی امید کے ساتھ طلوع ہوتا اور آج حقیقت میں اس کے بیڈ ہی نہیں اس کی زندگی میں بھی ولید کی جگہ اس طرح خالی ہوئی تھی کہ کبھی بھی بھر نہیں سکتی تھی۔ اس کے خواب وخیال کبھی حقیقت نہیں بن سکتے تھے۔ جو وہ کبھی کھلی اور کبھی بند آنکھوں سے دیکھا کرتی تھی۔ اس صبح کا سورج اس کی زندگی میں صرف اندھیرے کا پیغام لے کر طلوع ہوا تھا۔ اس وقت اسے خلیل جبران کا وہ قول یاد آتا کہ تم جس شخص سے محبت کرتے ہو اسے اللہ کی رضا کے لیے چھوڑ دو۔ اگر وہ تمہارا ہوا تو وہ زندگی کے کسی بھی موڑ پر تمہارے پاس آ جائے گا اور اگر تمہارا نہ ہوا تو تمہارے پاس ہوتے ہوئے بھی تمہیں چھوڑ کر چلا جائے گا۔ ایسا ہی کچھ اس کے ساتھ بھی ہوا۔ اسے اپنا من چاہا شخص مل تو گیا تھا مگر اس کے ملن کا عرصہ بہت کم وقفہ کے لیے آیا تھا۔ تب وہ اپنے دل کو یہ سوچ کر تسلی دے لیتی شاید قدرت نے اس کا اور ولید کا اتنے عرصے کا ہی ساتھ لکھا تھا۔ ولید اسے ایک بچہ بھی تو نہ دے کر گیا تھا۔ جس کے سہارے وہ اپنی بقیا زندگی گزار لیتی اسے معلوم نہ تھا۔ زندگی اس رنگ میں بھی اپنا جلوہ دکھائے گی۔ وہ جتنی جلدی دلہن بنی تھی اتنی ہی جلدی اجڑ بھی گئی تھی۔ سفید سوٹ پہنے وہ کسی اور ہی دنیا کی شہزادی لگتی تھی۔

☆......☆......☆

چار مہینے دس دن اس طرح گزرے پتا ہی نہ چلا۔ عدت کی فاتحہ والے دن سب کو یوں لگ رہا تھا جیسے کل کی بات ہو مگر اس پر یہ چار ماہ چار صدیاں بن کر بیتے ولید کے بغیر ایک ایک پل گزارنا اسے پل صراط کا سفر محسوس ہوتا عدت کی فاتحہ کے بعد دونوں گھرانوں نے اس کی آئندہ آنے والی زندگی کے بارے میں فیصلہ کرنے کا سوچا وہ ایک تماشائی بنی سب کچھ دیکھتی اور سنتی رہی۔ ہر شخص کے الفاظ اس کے کانوں پر ہتھوڑے برسا رہے تھے۔ سب کو اپنی اپنی پڑی تھی اس کے دل پر کیا بیت رہی تھی یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

اس کی پھوپی کا کہنا تھا اگر عاتقہ چاہے تو یہ اپنی بقیا زندگی ہمارے ساتھ ہی گزار سکتی ہے۔ جو

حیثیت اس کی ولید کے سامنے تھی۔ وہی اس کے بعد بھی برقرار رہے گی اور ابھی یہ کم عمر ہے۔ اس کے سامنے پہاڑ جیسی زندگی پڑی ہے ہم کب تک زندہ رہیں گے۔ کل جب سب دیور نندیں اپنے گھر کے ہو جائیں گے تو اسے تنہائی کا عذاب بہت ستائے گا۔ ویسے بھی آنے والی بہوئیں اور داماد کس مزاج کے ہوں کسی کو نہیں معلوم۔ اگر اس کی منشاء ہو تو کچھ عرصے بعد ہم یاسر (دیور) سے اس کا نکاح کر دیں گے۔ اس طرح اس کا گھر بھی بس جائے گا اور یہ تنہا بھی نہیں رہے گا۔''

جبکہ اس کے ماں باپ کا کہنا تھا کہ اگر ولید کا ایک بچہ ہوتا تو ہم اس متعلق سوچتے بھی۔ ہم کیا کہہ سکتے ہیں فیصلہ عاتقہ کے ہاتھ میں ہے جو اس کی مرضی ہوگی وہی ہمارا فیصلہ ہوگا۔ ویسے بھی دونوں گھرانے اس کے اپنے ہیں جہاں دل چاہے وہاں رہے۔'' اس طرح وہ اتنی چھوٹی سی عمر میں فیصلہ کرنے کی حقدار ٹھہر گئی۔ ابھی تو وہ دنیا کو صحیح طرح سے پرکھ بھی نہ پائی تھی۔

☆......☆......☆

موسمِ بہار بہت ہی مختصر موسم ہوتا ہے اور بہت کم عرصے کے لیے آتا ہے لیکن اپنے ساتھ خوبصورتی اور دلکشی لے کر آتا ہے۔ مگر اس کی زندگی میں تو بہت ہی کم وقفے کے لیے آیا تھا اور کچھ یادوں کے حسین پھول اس کی جھولی میں ڈال کر ہمیشہ کے لیے خزاں کی نوید سنا گیا تھا اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس کی خوشیوں کا زمانہ اتنا قلیل ہوگا۔ زندگی کیسے کیسے کھیل کھیلتی ہے زندگی کا ہر بدلنے والا لمحہ اپنے اندر ایک نیا رنگ لیے ہوئے ہوتا ہے۔ قدرت کے فیصلے بھی نرالے ہوتے ہیں۔ تقدیر کا صرف ایک فیصلہ تدبیر کے ہزاروں فیصلوں پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اس بات کا ادراک اس پر ولید کے جانے کے بعد ہوا تھا۔ مگر وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے اور وقت ہی سب سے بڑا استاد بھی۔ وقت ہی انسان کو سب کچھ سکھاتا ہے۔ وقت ہی انسان کو بناتا ہے، وقت ہی بگاڑتا ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے وقت وقت کی بات ہے اس نے بھی اپنے آپ کو وقت کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا کہ صحیح وقت پر اللہ اس کے لیے جو فیصلہ کرے گا۔ وہی اس کے حق میں بہتر ہوگا کیونکہ اسے یقین تھا کہ انسان سے جتنی جلدی اس کا رب راضی ہوتا ہے۔ کوئی اور رشتہ نہیں ہوتا۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس رات عشاء کی نماز کے بعد رو رو کر دعا مانگ رہی تھی۔ تو اسے قوی امید تھی کہ اس کا رب اسے روشن راستہ ضرور دکھائے گا اور پھر اس رات انتہائی عجز و انکساری کے ساتھ دعا مانگ کر سوئی تو ایک ٹھوس فیصلہ کر چکی تھی۔ جو دوسرے دن سب کو سنانا تھا۔

☆......☆......☆

دوسرے دن تمام بڑے ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔ یوں تو سب کے سامنے فیصلہ سنانا بہت دل گردے کا کام تھا کیونکہ اس گھر میں اسے کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ مگر وہ کبھی یہ بات گوارہ نہ کر سکتی تھی کہ جو دیور سے بھابی بنا کر لایا تھا وہی اس کا شوہر بن جائے۔ ویسے بھی اس گھر سے ولید کی یادیں جڑی ہوئی تھیں۔ وہ نہ اس گھر میں ولید کے بغیر رہ سکتی تھی نہ اس کی جگہ کسی اور کو دے سکتی تھی۔ اور نہ ہی اتنی لمبی زندگی اکیلے گزار سکتی تھی۔ بہر حال اسے کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ یہی سوچ کر اس نے بڑے صلح جو انداز میں کہنا شروع کیا۔

''پھوپی جان آپ اس گھر میں بہت محبت اور ارمان کے ساتھ مجھے بہو بنا کر لائی تھیں مگر

قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ ہم کچھ سوچتے ہیں مگر ہمارا رب ہمارے لیے کچھ اور سوچ رہا ہوتا ہے۔ آپ کل بھی میری پھوپو تھیں اور آج بھی ہیں آئندہ آنے والے وقت میں بھی رہیں گی۔ ہمارا یہ رشتہ کبھی نہیں بدل سکتا۔ میں جانتی ہوں آپ میرا ابھی برا نہیں چاہیں گی مگر میں کیا کروں۔ میں نہ اس گھر میں ولید کے بغیر رہ سکتی ہوں اور نہ ہی اس کی جگہ کسی اور کو دے سکتی ہوں۔ اس لیے میں نے واپس جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ میرے جذبات کا اندازہ لگا سکتی ہیں کہ میں نے یہ فیصلہ کتنے کرب کے ساتھ کیا ہے۔'' یہ کہتے کہتے اس کی آواز رندھ گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

ولید کی شہادت کی خبر سُن کر اس کے ہونٹوں پر چپ کا جو قفل لگا تھا۔ وہ یہ فیصلہ سنانے کے بعد ٹوٹا پھوپو نے تڑپ کر اسے گلے سے لگالیا اور بولیں۔

''ٹھیک ہے بیٹا تم جب چاہو یہاں آسکتی ہو۔ اس گھر کے دروازے تم پر ہمیشہ کھلے رہیں گے۔''

کچھ فیصلے ایسے ہوتے ہیں جو تحمل مزاجی کے ساتھ نمٹا لئے جائیں تو نہ ہی دلوں میں کدورتیں آتی ہیں اور نہ ہی رشتوں میں دراڑیں پڑتی ہیں۔ عاتقہ نے بھی اس مسئلے کو بالکل اسی طرح خوش اسلوبی سے حل کر دیا تھا۔ جیسے اس کی شادی کے مسئلے کو اس کے ماں باپ نے حل کیا تھا۔

دوسرے دن اس گھر کے دروازے کو خیر باد کہتے ہوئے اس نے ایک حسرت بھری نظر اپنے اس گھر پر ڈالی جو اس نے اپنی انتھک محنت اور محبت سے سجایا تھا۔ اس طرح وہ شادی کے صرف تین سال کے عرصے میں واپس اس دہلیز پر آگئی۔ جہاں سے چلی تھی اب نہ اسے گڑیوں کی شادی یاد تھی نہ اپنی خواہشات کا عکس، نہ بچپن کی کوئی بات نہ ماں باپ کا لاڈ نہ ہی خوبصورت گھر کی آرزو، اگر کچھ یاد تھا تو وہ ولید کی محبت۔ ایک دفعہ پھر اس کی زندگی خیالوں میں بسر ہونے لگی۔

مگر اب ان خیالوں میں یادیں تھیں اور یادوں میں کرب ناک زندگی۔ ویسے وہ اپنی خواہشات کے خیالوں سے تو کبھی نکل ہی نہ سکی تھی مگر زندگی کے یہاں تک کے سفر میں اس کی سوچ اور خیالات میں بہت حد تک تبدیلی آچکی تھی۔

☆.......☆.......☆

ولید کی شہادت کے بعد ایک اور حادثے نے ان کی زندگیوں میں ہلچل مچادی۔ سفیان کے والد ظہر کی نماز پڑھ کر اچھے خاصے گھر آئے مگر تھوڑی دیر میں ہی ہارٹ اٹیک نے ان کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ خاندان میں متواتر تین اموات سے ان کی زندگیاں اُلجھ کر رہ گئیں۔

☆.......☆.......☆

ولید کو دنیا سے پردہ کیے آٹھ ماہ ہو چکے تھے اور سفیان کے بچے تقریباً نو ماہ کے ہو چکے تھے یہ عمر بچوں پر بہت بھاری گزرتی ہے۔ اس عمر میں بچے عموماً دانت نکالنے کے مراحل سے گزر رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے آئے دن بیمار رہتے ہیں اور اسی عمر میں چلنا شروع کرتے ہیں، تو خطرناک حد تک شریر ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں ایک ہی بچے کو سنبھالنا بہت جان جوکھوں کا کام ہوتا ہے پھر یہاں تو دو دو بچوں کا مسئلہ تھا۔ پھر تیسرا اسعد جو ماں کے بغیر سوتا ہی نہیں تھا۔ جیسے تیسے کر کے دادی پھوپو نے بچوں کو سنبھال تو لیا تھا۔ مگر اتنے چھوٹے بچے کب تک ماں کے بغیر رہ سکتے ہیں۔ دن کے بیشتر حصوں میں انہیں ماں کی شدت سے ضرورت محسوس ہوتی ہے ابھی تو انہیں ماں سے

بچھڑے کم عرصہ ہوا تھا اور آگے بہت بڑی زندگی پڑی تھی۔

اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے ماں نے سفیان پر دوسری شادی کرنے کے لیے زور دینا شروع کر دیا۔ انہوں نے سفیان کو سمجھایا دیکھو بیٹا میں کب تک تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہارے ابو کے جانے کے بعد میں اپنے آپ کو بہت اکیلا محسوس کرتی ہوں۔ کل تمہاری دونوں بہنوں کی شادیاں ہو جائیں گی۔ گھر میں بھابیاں آئیں گی۔ نہ جانے کس مزاج کی ہوں۔ ایسے حالات میں اکیلے بچوں کے ساتھ زندگی گزارنا بہت مشکل ہو جاتا ہے اور پھر تمہاری عمر بھی اتنی نہیں ہے کہ اکیلے زندگی گزارو۔ مرنے والوں کے ساتھ مر نہیں جاتے۔ تم بچوں کی خاطر ہی سہی دوسری شادی کر لو۔ گھر میں ماں آجائے گی تو مجھے بھی اطمینان ہو جائے گا۔ اس وقت تمہاری حالت مجھ پر زیادہ کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ میں بھی کب تک تمہارے ساتھ رہوں گی۔ اگر تم اجازت دو تو میں عاتقہ کے لیے بات کروں۔''

ماں کے مسلسل اصرار کرنے پر سفیان نے مجبور ہو کر ہاں کر دی۔ سفیان کے ہاں کرنے کی دیر تھی کہ وہ ایک بار پھر عاتقہ کے لیے دست سوال بن کر بہن کے پاس پہنچ گئیں۔

ان کی نظر میں سفیان کے لیے بیوی اور بچوں کے لیے ماں عاتقہ کے علاوہ کوئی اور اچھی ثابت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

☆......☆......☆

اِدھر عاتقہ کے ماں باپ اتنی کم عمری میں بیٹی کی اجڑی مانگ دیکھ کر اندر ہی اندر گھلنے لگے تھے۔ ابھی تو انہیں دو بیٹیاں اور بیاہنا تھیں کہ بیاہی بیٹی اتنی جلدی اجڑ کر دوبارہ ان کی دہلیز پر آ گئی تھی۔ اس کی سونی زندگی کو دیکھ کر انہوں نے دوبارہ اس کا گھر بسانے کا سوچا۔ مگر اب صورتِ حال کچھ اور تھی۔ اب وہ الہڑ سی دوشیزہ نہیں بیوہ عورت تھی اور ایسی صورت میں رشتہ ملنا ذرا مشکل تھا مگر اس وقت ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب بہن ایک دفعہ پھر سفیان کا رشتہ لے کر آ گئیں۔

جب عاتقہ کو خالہ کی آمد کا مقصد پتا چلا تو اس نے تڑپ کر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر کے امی کو انکار کر دیا اور سفیان کے رشتے پر سمیعہ کے لیے غور کرنے کا مشورہ دیا مگر وہ ماں تھیں، کیا کر سکتی تھیں۔ مرد ایک ساتھ چار رکھ لے کوئی فرق نہیں پڑتا مگر عورت کے لیے اپنے شوہر کی جگہ کسی اور کو قبول کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ بھی ولید کی جگہ کسی اور کو قبول نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے ولید کی یادوں کے سہارے زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن یہ دنیا کا دستور ہے یہاں سوائے عشق حقیقی کے کسی اور کی یادوں کے سہارے زندگی خوشحال بسر نہیں ہوتی۔

امی نے اسے سمجھایا کہ چھوٹے بہن بھائی بھی تمہارے آگے ہیں۔ ہم بوڑھے ماں باپ کب تک تمہارے ساتھ رہیں گے۔ زمانے کی اونچ نیچ سے بخوبی واقف ہو۔ بالآخر ان تمام حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ اپنے دل پر پتھر رکھنے میں کامیاب ہو گئی۔

پھر اک شام خاموشی سے ان کا نکاح ہو گیا۔ خالہ کے یہاں بھی بہت محبت سے سب نے اس کا استقبال کیا۔ مگر ان کی محبت اسے ہمدردی کی طرح لگتی حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی اگر وہ بیوہ تھی تو سفیان بھی شادی شدہ اور تین بچوں کا باپ تھا اور تین بچوں کے باپ کو بیٹی دینے سے پہلے لوگ دس دفعہ سوچتے ہیں۔ وقت کبھی بھی ایک جگہ رُکتا

نہیں ہے اس کا کام تو چلنا ہے وہ مسلسل چلتا رہتا ہے۔

بچپن چھوٹا تو اس کی حسین یادیں جوانی کی فکر میں ڈھل گئیں۔

ولید سے زندگی جڑی تو باپ کے گھر کی بہت سی خوشگوار باتیں اور بے فکری ختم ہوگئی۔

ولید کا ساتھ چھوٹا تو اس کی یادوں سے نکلنا مشکل ہوگیا۔

سسرال سے نکلنے کا وقت آیا تو ولید کے گھر کو چھوڑنا مشکل ہوگیا۔

سفیان سے شادی کا وقت آیا تو فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا۔ کیونکہ سفیان سے شادی کا مطلب ولید کی یادوں کو ہمیشہ کے لیے دفن کردینا تھا۔

عاتقہ سلیمان سے عاتقہ ولید اور عاتقہ ولید سے عاتقہ سفیان تک کے سفر کے ہر موڑ پر زندگی مشکل سے مشکل ترین ہوتی گئی۔

جس موڑ پر باپ کے گھر کو چھوڑا تو ولید کا ساتھ تھا اور پھر ولید کا ساتھ جس موڑ پر چھوٹا وہاں سفیان اس کا منتظر تھا۔

سفیان کے ساتھ زندگی کا نیا سفر شروع ہوئے ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ بچوں کی جو محرومی اُسے ولید کے گھر تھی وہ سفیان سے نکاح کرتے ہی ختم ہوگئی تھی۔ تینوں ننھے فرشتے سعد، معاویہ اور رملہ سارا دن اپنی معصوم شرارتوں میں اسے مصروف رکھتے۔ جس سے اس کا دل بہلا رہتا اور ان کے چھوٹے موٹے کاموں میں لگ کر اسے دن گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔

خالہ اِن دنوں بہت مطمئن نظر آتیں۔ سفیان بھی اپنے بچوں کی بہترین پرورش ہوتے دیکھ کر بہت پُرسکون رہتا۔

میکے آتی تو ماں باپ کے چہروں پر بھی اطمینان کا عکس دیکھتی ہر شخص اپنی جگہ خوش اور مطمئن نظر آتا۔ تب اِسے اپنے اندر ایک عجیب سی خوشی اترتی ہوئی محسوس ہوتی کہ اس کے ایک فیصلے سے کتنے لوگوں کی زندگی میں سکون آ گیا تھا۔ وہ اپنے رب کے حضور سجدہ شکر ادا کرتی مگر وہ خود مطمئن نہیں تھی۔ سفیان نے اسے پہلی رات ہی کہہ دیا تھا دیکھو عاتقہ میں بچپن سے ہی تم سے خاموش محبت کرتا تھا اور کزن ہونے کے حوالے سے مجھے یہ رشتہ قبول ہونے کی اُمید بھی تھی۔ میں صرف حجاب کے انتظار میں تھا مگر جب امی رشتہ لے کر گئیں تو بہت دیر ہوچکی تھی اور ولید مجھ پر بازی لے گیا تھا۔ پھر جب خالہ نے ولید کا رشتہ قبول کرلیا تو میں نے یہ سوچ کر صبر کرلیا کہ تم میری قسمت میں نہیں تھیں۔ پھر میمونہ نے آکر مجھے اتنی محبت دی کہ میں تین سال کے قلیل عرصے میں سب کچھ بھول جانے پر مجبور ہوگیا۔ کبھی کبھی مجھے لگتا شاید میری محبت کچی عمر کا وقتی جذبہ تھا۔ جب ہی تو اتنی جلدی اُتر گئی اور پھر یکطرفہ بھی تھی میں نے کبھی تم سے اظہارِ محبت کیا ہی نہیں تھا۔ جو میرے جذبات تم تک پہنچتے میں نے بہت دفعہ تم سے اپنے جذبوں کا اظہار کرنا چاہا مگر کبھی ہمت نہیں ہوئی۔ کیونکہ مجھے خوف تھا کہیں تم انکار نہ کردو اور...... تمہیں تو بچپن سے ہی فوجی پسند تھے اور ولید کا رشتہ قبول ہونے کی وجہ بھی میں یہی سمجھتا تھا کبھی میں تم سے اتنی شدت سے محبت کرتا تھا پھر وہ شدت ایک دم ختم ہوگئی۔ میں اس جذبے کو کوئی نام نہ دے سکا۔ میں محبت کے معاملے میں بہت کمزور تھا اس یا پھر بدنصیب یہ کبھی سمجھ نہ سکا اور آج !! تم ملیں تو کس صورت میں کہ تمہارے دل میں ولید کی محبت اور میرے دل میں میمونہ کی محبت جڑ پکڑ چکی ہے۔ تمہارے لیے ولید کی محبت کو بھلا

دینا مشکل ہے تو میرے لیے میمونہ کی یادیں دل سے نکالنا ناممکن، میں تمہارے سارے حقوق پورے کروں گا۔ مگر بیوی والے حقوق کی مجھ سے اُمید نہ رکھنا اس معاملے میں ''میں'' انصاف نہ کر پاؤں گا نہ میں تم سے تمہارے ماضی کے بارے میں پوچھوں گا، نہ تم مجھ سے میرے بیتے ہوئے کل کے بارے میں سوال کرنا کیونکہ میں نے یہ شادی امی کے مجبور کرنے پر صرف بچوں کی وجہ سے کی ہے۔ جہاں تک بچوں کا تعلق ہے تو وہ تو تمہارے پاس پہلے ہی تین عدد موجود ہیں۔ اس لیے بچوں کی کمی تمہیں اپنی زندگی میں کبھی محسوس نہیں ہوگی۔ تم انہیں ماں کی محبت دو گی تو وہ بھی تمہاری عزت کریں گے۔ آگے تمہیں معلوم ہوگا کہ حالات کو کیسے ہینڈل کرنا ہے کیونکہ تم پڑھی لکھی سمجھدار اور سلجھی ہوئی عورت ہو۔''

سفیان کی بات سن کر وہ سکتے جیسی کیفیت میں رہ گئی۔ وہ تو ولید کی محبت کو باپ کی دہلیز پر یہ سوچ کر دفن کر آئی تھی کہ اب اس کی زندگی صرف سفیان اور اس کے بچوں کی ہے مگر یہاں تو سفیان اس کے حقوق پورے کرنے سے معذرت کر رہا تھا۔

سفیان کی بات کے جواب میں وہ صرف اتنا بولی۔ ''آپ نے جو کچھ کہا میں اس پر سختی سے عمل پیرا رہوں گی مگر میری طرف سے ہمیشہ اپنا دل صاف رکھیے گا کہ اب بھی میرے دل میں ولید کی محبت ہے جس وقت میں نے آپ سے شادی کا اقرار کیا تھا۔ اسی وقت دل سے ولید کی یادوں کو نکال دیا تھا۔ اگر مجھے ولید کی یادوں کے سہارے زندگی گزارنی ہوتی تو آپ سے شادی کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ آگے آپ خود سمجھدار ہیں۔

غزل

اُلفت کا روگ دِل کو لگانے سے فائدہ؟
بیکار اپنے جی کو جلانے سے فائدہ؟

اپنی طرف بھی اُٹھتی ہیں پھر چار اُنگلیاں
اوروں کی سمت اُنگلی اُٹھانے سے فائدہ؟

دُکھ میں اضافہ کر کے چلا جائے گا وہ شخص
اُس کو بلانے پاس بٹھانے سے فائدہ؟

تنہائی میں جو مرضی کے سب لوگ ہیں تو پھر
محفل میں جا کے ملنے ملانے سے فائدہ؟

اک دوست بھی ہے کافی وفادار گر ملے
یوں ہر کسی سے ربط بڑھانے سے فائدہ؟

جب رفتگاں نے لوٹ کے آنا نہیں ہے تو
قبروں پہ جا کے دیپ جلانے سے فائدہ؟

جب سعدیہ کسی کو بھی احساس تک نہیں
ہر وقت یونہی رونے رُلانے سے فائدہ؟

شاعرہ: سعدیہ سیٹھی

اس رات اتنے بڑے لیکچر کے بعد عائشہ نے کبھی سفیان کے قریب ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ حالانکہ رات میں جب بھی سفیان اس کے برابر میں ہوتا تو اس کے من میں شدت سے سفیان کی قربت کی چاہت ابھرتی مگر وہ ہر بار اپنے جذبات کو دل کے نہاں خانے میں ڈال دیتی۔ پھر گزرتے وقت کے ساتھ اس کی شدت میں کمی آتی گئی۔

اس نے اپنی زندگی کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ مگر وہ دنیا کا کیا کرتی جسے کسی پل چین نہیں ہوتا۔ جب لوگ اس سے اولاد کے بارے میں پوچھتے تو ایک پل کو تو وہ لاجواب ہوجاتی پھر اس نے ایک حل نکالا۔ سب کے سوالوں کا صرف ایک جواب، جو اس دن اس نے اپنی ماں کو دیا تھا۔ جب وہ تینوں بچوں کو لے کر امی کی طرف آئی ہوئی تھی۔ تب امی نے اسے اپنے بچے کے لیے کہا تو اس نے مضبوط لفظوں میں جواب دے کر امی کو مطمئن کردیا یہ ٹھوس دلائل دینا اس نے ولید کی تین سالہ سنگت میں سیکھا تھا۔

''امی میں کوئی بے اولاد تھوڑی ہوں۔ تین بچوں کی ماں ہوں۔ مجھے اور سفیان کو اب اور بچوں کی ضرورت نہیں ہے ان کی اچھی پرورش کرنا ہماری زندگی کا مقصد ہے۔ بچے تو فرشتوں کی طرح ہوتے ہیں ان سے آپ کو وہی ملے گا جو آپ انہیں دیں گے۔ اگر انسان کی زندگی میں اولاد کا سکھ ہو تو وہ غیر کی اولاد پال کر بھی مل جاتا ہے اور اگر نہ ہو تو اپنی اولاد سے بھی کچھ فیض حاصل نہیں ہوتا۔

انشاء اللہ تعالیٰ میں ان بچوں کی ایسی تربیت کروں گی کہ لوگ اِن پر فخر کریں گے۔ انہیں اچھا انسان بنانے کے لیے میں ہر ممکن کوشش کروں گی آگے اللہ کی مرضی۔

مجھے یقین ہے اللہ کسی کی محنت ضائع نہیں کرتا تو میری بھی نہیں کرے گا مجھے اس کا اجر ضرور ملے گا۔

اس دنیا میں نہیں اگلی دنیا میں ہی سہی۔ آپ میرے حق میں دعا کرتی رہا کریں۔ اللہ مجھے ہر قدم پر ثابت قدم رکھے اور ہر منزل پر کامیابی عطا کرے۔''

امی نے اس کی شفاف گفتگو سُن کر 'آمین' کہا میں تمہارے لیے ہمیشہ دعا گو رہوں گی۔

☆......☆......☆

زندگی کے پانچ برسوں میں حالات بہت حد تک تبدیل ہوچکے تھے۔ اس کے ماں باپ تمام بچوں کی شادی سے فارغ ہوکر یکے بعد دیگرے دنیا سے رخصت ہوچکے تھے۔ اِدھر اس کے دیور اور نندوں کی بھی شادیاں ہوچکی تھیں اور خالو کے انتقال کے بعد خالہ بیمار رہنے لگی تھیں۔ لہٰذا انہوں نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اپنی زندگی میں ہی جائیداد کی تقسیم کا فیصلہ کرلیا تھا۔

☆......☆......☆

اس رات ان کی تمام اولاد ان کے کمرے میں موجود تھی اور سب بیڈ پر تمام اشیاء کو پھیلے دیکھ کر ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ آخر سفیان نے بات کرنے میں پہل کی۔

''امی یہ سب کیا ہے؟''

''بیٹا میں اپنی تمام اشیاء اپنے بچوں میں برابر تقسیم کرنا چاہتی ہوں اور اس گھر کو بیچ کر سب کو ان کے حق کے مطابق حصہ دینا چاہتی ہوں۔ تم اس گھر کی قیمت لگواؤ۔ یہ کام میری زندگی میں ہی ہوجائے تو میں سکون سے مرسکوں گی۔'' یہ بات سُن کر سفیان تڑپ کر بولا۔

''اللہ نہ کرے امی کیسی باتیں کرتی ہیں۔ ابو کے بعد ہم آپ کو کھونے کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ اللہ ہماری عمریں بھی آپ کو لگا دے۔''

''اللہ نہ کرے بیٹا!'' ماں نے بھی تڑپ کر جواب دیا۔ ''میں تو اپنے فرائض پورے کرچکی ہوں۔ مگر تم لوگوں پر ابھی بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ یہ تم لوگوں کی محبت ہے کہ تم اپنی ماں کے لیے ایسے جذبات رکھتے ہو اور میری خوش نصیبی کہ

مجھے رب نے اتنی فرمانبردار اولاد سے نوازا۔ مگر بیٹا میری بات غور سے سنو اور تم سب اپنے گرہ میں باندھ لو۔ اگر تم اس بات پر عمل پیرا رہو گے تو ہرگز ناکام نہیں ہو گے۔ جو بات میں تمہیں نصیحت کی صورت بتا رہی ہوں۔ وہی نصیحت تم اپنی اولادوں کو بھی کرنا تو دونوں جہانوں میں کامیاب رہو گے۔ دیکھو میرے بچو!

قدرت کے کچھ اصول ہوتے ہیں ہم ان اصولوں سے منہ نہیں موڑ سکتے۔ جس نے ماں کا پیٹ دیکھا ہے وہ قبر کا منہ بھی ضرور دیکھے گا۔ جو دنیا میں آیا ہے اسے بہر حال ایک دن جانا ہے۔ یہی دنیا کا دستور ہے۔ یہی قدرت کا قانون۔ یہاں ایک جاتا ہے تو دوسرا اس کی جگہ سنبھالنے کے لیے آ جاتا ہے۔

تمہارے ابو تو بالکل اچانک چلے گئے۔ مگر مجھے اللہ نے اتنی مہلت دی ہے۔ اب میری عمر اتنی نہیں ہے کہ مجھے برسوں جینا ہے اس لیے ہمیں حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ نہ جانے کب موت کا فرشتہ اللہ کا پیغام لے کر آ جائے۔ کچھ پتا نہیں اس لیے میں اپنی زندگی میں ہی اس فرض سے بھی سبکدوش ہو کر تمام جائیداد اپنے بچوں میں تقسیم کرنا چاہتی ہوں تاکہ کل اپنے رب کے حضور سرخرو ہو سکوں۔ ورنہ کیا منہ لے کر جاؤں گی اپنے رب کے سامنے کہ میں نے آخری وقت میں اپنے فرائض سے کوتاہی برتی......

اور کیا جواب دوں گی تمہارے ابو کو کہ وہ جو ذمہ داری مجھ پر سونپ گئے تھے۔ وہ میں نے پوری ذمہ داری سے نہیں نبھائی۔ میں چاہتی ہوں کہ جب دنیا سے جاؤں تو احساسِ ندامت کا کوئی بوجھ اپنے کندھوں پر لے کر نہ جاؤں۔''

ماں کے اس فیصلے پر بچوں نے ہر ممکن طریقے سے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی کہ امی آپ کو اپنی تربیت پر اعتماد ہونا چاہیے آپ کی اولادیں کبھی ایک دوسرے کے خلاف نہیں ہوں گی۔''

مگر وہ بہت دور اندیش خاتون تھیں۔ انہیں اس بات کا خدشہ تھا کہ ان کے بعد دولت کے حصول کے لیے اُن کی اولادوں میں نفرت کا بیج نہ اُگ جائے اور گھر نفرتوں میں نہ بٹ جائے۔ انہیں گھر کی محبت سے زیادہ اپنے بچوں کا سکون عزیز تھا۔ وہ دولت جائیداد سے زیادہ رشتوں کو ترجیح دینے والی خاتون تھیں۔ انہیں معلوم تھا کسی کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی۔

پھر اس رات انہوں نے اپنی تمام اشیاء زیور کیش حتیٰ کہ زیر استعمال جو چیزیں تھیں وہ تمام بچوں میں برابر برابر تقسیم کر دیں۔ اور گھر کی قیمت لگوانے کی ذمہ داری سفیان کو سونپ دی کیونکہ گھر اس طرح بنا ہوا تھا کہ بکے بغیر حصہ ہونا ناممکن تھا۔ دیوار کھڑی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور کوئی بیٹا اتنا صاحب حیثیت نہیں تھا کہ گھر کی قیمت لگوا کر دوسرے بہن بھائیوں کا حصہ ادا کرتا۔

☆......☆......☆

پھر ایک دن گھر بک گیا۔ قیمت اتنی لگ گئی کہ بہنوں کو حصہ دینے کے بعد بھائیوں کو اپنے حصے کے پیسوں میں کچھ رقم ڈال کر چھوٹے ہی سہی اچھے گھر مل گئے۔

سفیان نے جو گھر لیا اس میں تین کمرے، برآمدہ بڑے سے صحن میں ایک طرف کچن غسل خانہ، باتھ روم برابر برابر تھے۔ ایک طرف سے زینہ اوپر کی طرف گیا تھا۔ زینے کے نیچے پانی کی موٹر کا کنکشن تھا۔ عاتقہ کو بہت حد تک وہ گھر ایسا ہی لگا جیسا اس کے باپ کا تھا۔ مگر جو چیز بالکل

ویسی ہی تھی۔ وہ تھا صحن کے بیچ لگا نیم کا درخت، اس درخت کو دیکھ کر اسے اپنا بچپن بے تحاشا یاد آیا۔
خالہ تو جیسے گھر کی تقسیم کے انتظار میں تھیں۔ بچوں کو اپنے گھروں میں آباد دیکھ کر ایک دن خاموشی سے پُرسکون نیند سو گئیں اور اس کا جو آخری بزرگ سہارا تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔

☆......☆......☆

پھر گزرتے وقت کے ساتھ اس کی زندگی میں مشکل سے مشکل ترین دور آتا گیا۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ پریشان ہو جاتی مگر اس نے اپنے قدم ڈگمگانے نہیں دیے۔ ہر حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی رہی۔ سفیان کے رویے اور معاشرے کی دل آزاری کی باتوں کے باوجود نہ کبھی سفیان کی ذمہ داری سے غافل ہوئی اور نہ ہی کبھی بچوں کی تربیت میں کوتاہی برتی۔ بچوں کا تمیز شعور دیکھ کر جب لوگ خوشی سے اس کی تربیت کی تعریف کرتے تو سننے والوں میں ایسے لوگ بھی شامل ہوتے جو اس کی تعریف سُن کر حسد کرتے۔
اس وقت ایسے لوگوں کی سازشیں اسے پریشان کر دیتیں۔ جب بچے کسی سے سُن کر اسے سوتیلی ماں ہونے کے الفاظ کہتے ایسے وقت میں وہ شدت سے اپنے رب کو یاد کرتی، اس سے مدد طلب کرتی اس نے کامیابی کی منزل پر پہنچنے کے لیے سب سے زیادہ آسان راستہ اختیار کیا تھا، وہ راستہ تھا کثرت سے اللہ کی عبادت۔ اس عمل کے بعد اسے نہ لوگوں کی کڑوی باتوں کی پروا تھی نہ ان کی سازشوں کی۔ اس کی زندگی کا مقصد اپنی وہ ذمہ داری پوری کرنا تھی جو اس کے رب سے اس پر سونپی تھی۔ وہ اپنے رب سے پُرامید تھی کہ اللہ اس کی محنت کبھی ضائع نہیں کرے گا۔

☆......☆......☆

گزرتے وقت کے ساتھ زندگی کے ماہ و سال کھنکتے سکوں کی طرح اس کی جھولی میں گرتے رہے۔ بچے بڑے ہوتے گئے وہ لوگوں کی سازشوں کو اپنے مضبوط ارادوں سے کچلتی رہی۔
سفیان کے شب و روز ویسے ہی تھے۔
ہاں البتہ اب وہ عاتقہ کے سلیقے کی تعریف کرنے لگا تھا اور عاتقہ کے لیے تو سفیان کی اتنی ہی محبت کافی تھی۔

☆......☆......☆

وقت اتنی تیزی سے گزرا کہ پتا ہی نہیں چلا۔ اس روز جب وہ آئینے کے سامنے کھڑی بال سلجھا رہی تھی۔ تب اس نے اپنے چہرے کو غور سے دیکھا۔ بالوں میں اُترتی سفیدی اور چہرے پر پڑی جھریاں اسے اس کی عمر کا پتا بتا رہی تھیں۔
اس وقت وہ عمر کے اس حصے میں کھڑی تھی۔ جہاں انسان کے کندھوں پر اس کے بچوں کی شادی کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔
سعد امریکہ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر اپنا پرائیویٹ اسپتال چلا رہا تھا۔
معاویہ نے بھی M.B.A کرنے کے بعد اپنا بزنس کر لیا تھا اور رملہ نے ماسٹرز کرنے کے بعد اپنا ذاتی اسکول کھول لیا تھا۔ اسے فکر تھی کہ رملہ کا کوئی اچھا سا رشتہ آ جائے پھر سعد کے لیے کوئی لڑکی دیکھے گی۔ وہ اپنی محبت، لگن، دعاؤں اور اللہ پر مکمل یقین کے ساتھ بچوں کو اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی اور بچوں نے بھی اسے ماں تسلیم کر لیا تھا۔

☆......☆......☆

ولید کے جانے کے بعد وہ اکثر سوچتی کاش ولید کا کوئی بیٹا ہوتا تو میں اسے آرمی آفیسر بناتی مگر اس کی خواہش اس کے دل میں ہی رہ گئی۔ پھر

سفیان سے شادی کے بعد اس نے سعد اور معاویہ کے لیے ایسی آرزو کی تھی۔

مگر افسوس بڑے ہونے کے بعد دونوں بچوں میں سے کسی کا بھی رجحان اس طرف نہیں تھا۔ لہٰذا اس نے کسی پر زور زبردستی کرنے کی بجائے اُن کی خواہش کا احترام کیا۔

ویسے بھی کسی پر مرضی مسلط کرنا تو اس کی بچپن سے ہی عادت نہیں تھی۔ اس کی تعلیم اور اس کے ماں باپ کی تربیت نے اس کے مزاج میں جو مواد شامل کیا تھا۔ اس کی بدولت اس کی طبیعت ایسی تھی کہ جس ماحول میں چاہو ڈھال لو۔

اس نے بچپن سے ہی اپنی کوئی بات ضد سے نہیں منوائی تھی۔ قدرت کے ہر فیصلے کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کیا تھا۔ وہ تو صرف دینا جانتی تھی مانگنا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ زندگی کے ہر موڑ پر دیتی چلی آئی تھی۔ ماں باپ نے جہاں اس کی شادی کر دی۔ اس نے خوشی سے قبول کر لیا۔

ولید نے اتنی جلدی اس کا ساتھ چھوڑ دیا اس نے قدرت کے اس فیصلے پر کوئی شکوہ نہیں کیا۔

ماں باپ نے دوسری شادی پر زور دیا خاموشی سے تین بچوں کے باپ کو اپنا لیا۔

سفیان نے اس کے حقوق پورے کرنے پر معذرت کی وہ حرفِ شکایت زبان پر نہ لائی۔

ماں باپ ساس سُسر سب ایک ایک کر کے اسے تنہا چھوڑ گئے۔ وہ اللہ کی رضا پر صبر کرتی گئی اور اب بچوں کی شادی کے معاملے میں بھی اولین ترجیح بچوں کی خواہش کو دی۔

سعد کو اپنے ساتھ جاب کرنے والی ڈاکٹر ماریہ پسند آ گئی۔ وہ سال بھر کے اندر اسے دلہن بنا کر لے آئی یہ اور بات کہ ڈیڑھ سال کے مختصر عرصے میں ماریہ کو اس گھر میں گھٹن محسوس ہونے

لگی تو وہ اپنے چھ سوگز کے بنگلے میں شفٹ ہو گئے۔ اس نے خوشی خوشی اُن کی جدائی برداشت کر لی۔

معاویہ نے اپنے دوست کی بہن کو پسند کر لیا۔ اس نے خاموشی سے ان کی محبت کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ معاویہ بھی چھ ماہ بعد سسرال کی طرف سے ملے ہوئے گھر میں شفٹ ہو گیا۔ وہ اس کی خوشی کے کبھی آڑے نہیں آئی۔

رملہ اور اس کے ماموں کا بیٹا زیاد ایک دوسرے کو بچپن سے پسند کرتے تھے۔ اس نے اس معاملے میں بھی دیوار بننے کی کوشش نہیں کی نہ اسے ان کے فیصلے پر افسوس ہوا۔ افسوس ہوتا بھی کیوں... تینوں بچے اپنے گھروں میں خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے۔

سب بیٹے بہوئیں اس کی اپنی سگی ماں جیسی عزت کرتے تھے اور بڑھتی عمر کے ساتھ بچوں نے بھی اس کے ساتھ کوئی بدتمیزی نہیں کی تھی۔ دونوں بیٹے ہر ہفتے اس سے ملنے آتے وہ خندہ پیشانی کے ساتھ اپنی خدمات سرانجام دیتی۔

بیٹے اسے اپنے گھر میں شفٹ ہونے پر راضی کرتے مگر وہ اس بات سے انکار کر دیتی ایک تو وہ اس گھر کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ نیم کا درخت اس کی تنہائی کا بہترین ساتھی تھا اور اسے بہت کچھ یاد دلاتا تھا۔ دوسرے وہ بہت صلح جو اور امن پسند عورت تھی۔ کوئی بدمزگی نہیں چاہتی تھی۔

☆......☆......☆

آج وہ بہت پُرسکون اور مطمئن تھی۔ اس کے تینوں بچے اپنے اپنے گھروں میں خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ بن ماں کے بچوں کی پرورش کرتے ہوئے اس نے اپنا آپ بھلا دیا تھا۔ وہ ہر پل اپنے رب کے سامنے سجدہ شکر رہتی کیونکہ اس کے رب نے اسے جو روشن راستہ دکھایا تھا اس پر سفر کر کے وہ اپنی منزل پر پہنچ کر دنیا کے سامنے سرخرو ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

زندگی اپنی پگڈنڈی پر سیدھی سمت سفر کر رہی تھی کہ ایک منحوس حادثے نے اس کی زندگی میں ایک دفعہ پھر بھونچال مچا دیا۔

رملہ کا میاں اچھا خاصا آفس جانے کے لیے گھر سے نکلا مگر راستے میں ہی ایک ٹرک کے حادثے نے اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔

اس پر تو ایک دفعہ پھر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ لاکھ اس نے رملہ کو اپنی کوکھ سے جنم نہیں دیا تھا مگر ماں بن کر اپنی گود میں پالا تھا۔

لاکھ اپنی چھاتی کا دودھ نہیں پلایا تھا مگر بچپن میں اسی چھاتی سے لگا کر اُسے میٹھی لوریاں تو سنائی تھیں۔ آج اسی چھاتی سے لگا کر صبر کی تلقین کر رہی تھی۔ ان ہی بچوں کی خاطر اس نے اپنی زندگی تج دی تھی۔ رملہ کی عدت کے بعد اس کا وہاں رہنے کا جواز نہیں بنتا تھا۔ اس لیے وہ رملہ کو اپنے ساتھ ہی لے آئی۔ رملہ کو دیکھ کر اسے اپنی جوانی کے وہ دن یاد آتے جب ولید کی شہادت کے بعد اس پر اُداسی اور مایوسی نے ڈیرے ڈال لیے تھے، اور وہ ہر وقت بولائی بولائی پھرتی تھی۔ تب اس نے رملہ کو بالکل اسی طرح سنبھالا جس طرح کسی وقت میں اس کی ماں نے اسے سنبھالا تھا۔ اسے لگتا رملہ کی صورت میں ایک دفعہ پھر عاتقہ نے جنم لے لیا ہے اور زندگی جہاں سے چلی تھی آج پھر وہیں کھڑی تھی۔ جب رملہ کی بچی شنزاہ کو اس درخت کے نیچے کھیلتے دیکھتی تو اسے اپنا بچپن بہت یاد آتا۔ اس کی زندگی نیم کے درخت سے شروع ہو کر نیم کے درخت پر ہی ختم ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

معاویہ عنبر وٹو

عنبرین کی شادی

''وہ رائے تب دیں گے جب بھائی کوئی غلط فیصلہ کرنے جا رہے ہوں گے۔ انہوں نے کچھ غلط کیا ہی نہیں تو پھر وہ رائے کیا دیتے۔'' عنبرین نے کہا۔ ''مگر آنٹی تو کہہ رہی تھیں بہت شریف لوگ ہیں لڑکا بھی اچھا ہے، نوکری بھی ہے۔ وہ تو خوش نظر آ رہی تھیں، پھر......

اپنوں کی بے وفائی سے عبارت ایک افسانہ

کڑھائی کے کام سے فارغ ہو کر اس نے کچن کی جانب رخ کیا۔ آج اُس کا پسندیدہ ڈش چکن کڑاہی اور چاول بنانے کا ارادہ تھا چند دن پہلے ہی اس نے یہ ڈش بنانا سیکھی تھی۔ وہ کچن میں چکن کڑاہی

اور چاول کی تیاری میں مصروف تھی کہ اچانک اس کے کانوں میں ایک آواز گونجی۔

''ہیلو!'' آواز پر اس نے دروازے کی جانب نگاہ اٹھائی تو دروازے پر نورین کو پا کر مسکرا دی۔

''ارے تم وہاں کیوں رک گئی ہو! آ جاؤ۔'' عنبرین نے نورین کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم تو کچھ بنانے کی تیاری میں سر جھکائے اتنی مگن تھیں کہ میں نے سوچا خود تو تمہارا سر اٹھے گا نہیں میں ہی اٹھا دوں۔'' نورین شوخی سے بولتی عنبرین کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

''کیا بنانے جا رہی ہو عنبرین؟'' نورین نے پوچھا۔

''چکن کڑاہی اور چاول۔'' عنبرین نے جواب دیا۔

''ارے واہ تمہیں چکن کڑاہی اور چاول بنانا آ گئے۔'' نورین نے حیرت سے عنبرین کی طرف شوخی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو سوائے چائے کے کچھ بنانا نہیں آتا۔ تم نے اتنا کچھ بھی سیکھ لیا۔'' نورین نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

عنبرین فریزر سے چکن کا پیکٹ نکالتے ہوئے گویا ہوئی۔ ''اتنا مشکل نہیں ہے نورین، پتا ہے میں ہر کام سیکھنے یا کرنے سے بسم اللہ پڑھتی ہوں اور پھر تین مرتبہ دُرود شریف اور مجھے وہ کام اللہ اور اس کے رسُول ﷺ کے نام کی برکت سے بہت جلدی آ جاتا ہے۔''

''تم سچ کہتی ہو عنبرین!'' نورین کے لہجے میں حیرت تھی۔

تمہیں معلوم ہے میں کبھی جھوٹ نہیں بولتی، خود آزما کر دیکھ لینا۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ ہم کوئی کام کرنے سے پہلے بسم اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے مدد مانگیں اور پھر بھی ہمارا وہ کام نہ ہو، میں تو گھر کے ہر کام میں اسی سے مدد طلب کرتی ہوں، اگر سالن میں نمک مرچ وغیرہ تیز بھی ہو جاتا ہے تو میں اس پر بھی یہی پڑھ کر دم کر لیتی ہوں اور یقین کرو کہ مجھے کبھی مایوسی نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کی مدد ہمیشہ ہر حال میں بندے کے شامل حال رہتی ہے بشرطیکہ اس کے طلب کرنے میں خلوص اور پکارنے میں اعتماد ہو۔'' عنبرین نے نصیحت بھرے لہجے میں کہا۔

''تمہاری شخصیت میں تو کبھی ڈھونڈنے سے بھی جھول نظر نہیں آتا، سچ مجھے رشک آتا ہے تمہارے اوپر۔'' نورین نے اس کی ساری بات دھیان سے سنی تھی اور اس کے خاموش ہونے پر بڑے جذب سے گویا ہوئی تھی اور عنبرین نے محض مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔

''اچھا سناؤ تمہارے اس پرپوزل کا کیا بنا، مجھے تو بہت بے چینی ہو رہی تھی۔'' نورین کو اپنے آنے کا مقصد یاد آیا۔ اس نے بڑے اشتیاق سے عنبرین کو دیکھتے ہوئے پوچھا جو چکن کڑاہی بنانے میں مگن تھی۔

''کیا بننا ہے کچھ بھی نہیں۔ عنبرین نے نورین کی طرف بغیر دیکھے کہا۔

''مطلب بات آگے نہیں بڑھی؟ نورین نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں یار۔''

''مگر کیوں۔''

ناصر بھائی کو اس کی نوکری پسند نہیں آتی کہ چودہ، پندرہ ہزار میں گھر نہیں چلایا جا سکتا اور پھر ابھی دو چھوٹی بہنیں بھی ہیں جن کی شادیاں کرنی ہیں۔ تو ان کے چودہ' پندرہ ہزار میں تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا اس لیے وہ انہیں پسند نہیں آیا منع کر دیا۔'' عنبرین نے تفصیل سے بتا کر ایک نظر اسے دیکھا اور پھر کام

میں مصروف ہوگئی۔

''عنبرین چودہ، پندرہ ہزار تنخواہ کوئی کم تو نہیں ہے، یہ بھی تم سے ہی سنا ہے کہ اس کا اپنا اچھا سا گھر بھی ہے اوراس کے والد بھی تو گورنمنٹ اسکول میں پڑھاتے ہیں، ان کی بھی تو آمدنی ہوگی نا۔ آج کل تو معاشرے میں والدین صرف یہ دیکھتے ہیں کہ لڑکا برسرِ روزگار ہے یا نہیں، چاہے اس کی تنخواہ محض آٹھ ، دس ہزار ہی کیوں نہ ہو اور ناصر بھائی کو چودہ، پندرہ ہزار بھی کم لگ رہے ہیں، اور پھر انسان کی ترقی بھی ہوتی ہے، تنخواہ بھی بڑھ جاتی ہے، یہ تو اپنی قابلیت پر ہوتا ہے وہ ساری زندگی چودہ، پندرہ ہزار پر تو نہیں بیٹھا رہے گا۔ یہ اچھا نہیں کیا ناصر بھائی نے۔'' نورین افسوس سے سرہلاتے ہوئے گویا ہوئی۔

''بھائی نے اچھا کیا ہے۔ مجھے معلوم ہے وہ میرا برا نہیں چاہ سکتے مجھے ان پر پورا یقین ہے۔'' عنبرین نے بڑی شدت سے اس کی بات رد کردی اور بڑے یقین سے گویا ہوئی تھی۔

نورین نے بیچارگی سے اس کے چہرے پر پھیلی بھائی کی محبت کو دیکھا اور پھر گویا ہوئی۔

''انکل اور آنٹی کا کیا کہنا تھا، کوئی تو رائے دی ہوگی انہوں نے بھی؟''

''وہ رائے تب دیں گے جب بھائی کوئی غلط فیصلہ کرنے جا رہے ہوں گے۔ انہوں نے کچھ غلط کیا ہی نہیں تو پھر وہ رائے کیا دیتے۔'' عنبرین نے کہا۔

''مگر آنٹی تو کہہ رہی تھیں بہت شریف لوگ ہیں لڑکا بھی اچھا ہے، نوکری بھی ہے۔ وہ تو خوش نظر آ رہی تھیں، پھر اب وہ تمہارے بھائی کی رائے سے اتفاق کیسے کرنے لگیں؟'' سوال وزن رکھتا تھا عنبرین کو کچھ سمجھ نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔ کچھ لمحوں تک وہ پیاز کاٹتی رہی پھر نورین کو چاول بنانے کا طریقہ سمجھانے لگی۔ نورین نے ترحم بھری نظروں سے اس معصوم سی لڑکی کو دیکھا، پھر گہری پھر سانس بھرتے ہوئے اس سے چاول بنانے کا طریقہ سمجھنے لگی۔

کچن سے فارغ ہو کر وہ دوسرے کمرے میں آ کر بیٹھ گئیں اور نورین کو اپنی بنائی کڑھائی والی قمیض دکھانے لگی۔

''بہت پیاری ہے۔ کب پہنو گی؟'' نورین خوشی سے بولی۔

''یہ میری تو نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟'' نورین نے حیرت سے پوچھا۔

مطلب یہ کہ میری ہے ہی نہیں، یہ تو میں نے اپنی آنے والی بھابی کے لیے کاڑھی ہے۔'' عنبرین نے خوشی سے کہا۔ نورین نے اپنا سر پیٹا اور تیزی سے بولی۔

''اوہ گاڈ! عنبرین! تم نے اس قدر محنت اور لگن سے تیار کی وہ بھی اپنی آنے والی بھابی کے لیے جو ابھی تک اس گھر میں آئی ہی نہیں۔''

''آئی نہیں تو ایک دن آ جائے گی۔'' وہ پورے اطمینان سے قمیض تہہ کرتے ہوئے گویا ہوئی۔

''مگر کب تک؟'' نورین کے کان کھڑے ہو گئے۔

''بس چند ہی دنوں کی دیر ہے۔''

''تمہاری شادی سے بھی پہلے؟'' نورین کے دماغ میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔

''جی ہاں یہ کوئی نئی بات تھوڑی ہے۔'' وہ اطمینان سے گویا ہوئی۔

''ناصر بھائی کو شرم نہیں آئے گی خود تو شادی کر کے بیٹھ جائیں گے اور تمہارے آئے اچھے رشتے یو نہی ٹھکراتے رہیں گے۔''

''نورین!''

عنبرین کے چہرے پر پھیلی خفگی کا تاثر دکھائی دیا تھا۔ اس نے ٹوکنے والے انداز میں اس کی جانب دیکھا تھا۔

''اگر میرے لیے کوئی اچھا رشتہ نہیں مل رہا تو کیا بھائی بھی بیٹھے رہیں میرے انتظار میں۔''

''تم ...... تم عنبرین! سمجھ میں نہیں آ رہا تمہیں کس طرح سمجھاؤں۔'' نورین نے بے بسی سے اپنے دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے کہا۔

اس کے روبرو بیٹھی زرد لباس میں ملبوس انتہائی خوبصورت لڑکی اس کی دوست نہیں تھی بلکہ اس کا سب کچھ وہی تھی۔ اس کو وہ حقیقت سمجھانا چاہتی تھی جو آج کل پچھتر فیصد گھروں میں کھلے عام نظر آتی ہے۔ وہ سب کچھ سمجھتے بوجھتے بھی انجان بن رہی تھی یا پھر اسے اپنے بھائی پر اس قدر پختہ یقین تھا کہ اسے حقیقت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

''ناصر بھائی کتنی تنخواہ لیتے ہیں۔'' نورین کو اچانک خیال ہی آیا تھا۔

عنبرین نے خمار آلود آنکھیں اس پر جماتے ہوئے قدرے تعجب سے اسے دیکھا تھا۔

''بولو عنبرین؟'' اس کو کھویا پا کر نورین نے اصرار آمیز لہجہ اپنایا۔

''یہی پندرہ ہزار۔'' عنبرین نے سوچتے بتایا۔

''صرف پندرہ ہزار اور گھر بھی کرائے کا۔'' نورین نے تائید چاہی تو، اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اور تمہارے والد بھی مزدور آدمی ہیں، کچھ خاص نہیں کرتے ہے نا؟'' عنبرین کو اس کے سوالوں کا مقصد سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے الجھتے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''مگر پھر بھی ابو جی کی پنشن آتی ہے۔'' ایک دم اسے جیسے کچھ یاد آیا تھا۔

''اس کو چھوڑو یہ بتاؤ ناصر بھائی بھی شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔ ان کی بھی تو تنخواہ اتنی نہیں ہے۔ اسے بھی تو تمہاری شادی آخر کرنی ہے، جس کے لیے وہ بھی کچھ پس انداز کرتے ہوں گے۔ تو سوچیں ناصر بھائی خود کو کس طرح اہل سمجھ رہے ہیں شادی کا۔'' عنبرین پھر لا جواب ہوئی تھی۔ وہ کوئی جواب دیے بغیر بے تاثر چہرے کے ساتھ اسے دیکھتی رہی۔ نورین اس کی کیفیت سمجھ گئی تھی جب ہی تو محبت سے اس کے دونوں ہاتھوں کو تھامے نرمی سے گویا ہوئی۔

اب بھی وقت کی ڈور ہاتھ میں ہے عنبرین، اپنے والدین کو سمجھاؤ کہ وہ کم از کم تمہارے معاملات میں اپنا ہولڈ رکھیں، تمہارے متعلق کیے تمام فیصلوں کا اختیار صرف اور صرف انہیں ہونا چاہیے۔ عنبرین اگر دنیا میں تمہارے ساتھ کوئی مخلص ہے اور دل و ایمان سے تمہارا بھلا چاہتا ہے تو وہ تمہارے والدین کے علاوہ کوئی اور نہیں، نہ کوئی بھائی نہ کوئی دوسرا عزیز۔''

عنبرین خاموشی لیے بس اسے غور سے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی نگاہیں مسلسل اس کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ اس کو یقین تھا وہ ضرور کچھ نہ کچھ بولے گی تب وہ اس کے گال پر پیار کرتے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''ابو جی گھر آ گئے ہوں گے۔ تم کھانا کھا لو، میں چلتی ہوں......'' دروازے کے قریب پہنچ کر وہ ٹھہری تھی۔

''عنبرین! میری بات کو سوچنا ذرا غور سے۔'' وہ کہتے چلی گئی۔ باہر گاڑی مسلسل ہارن بجائے جا رہی تھی۔ یقیناً اس کے والد آ چکے تھے۔ وہ کمرے میں وہیں کافی دیر بیٹھی رہی تھی، جیسے کچھ سوچنے میں مصروف ہو، حتیٰ کہ کمرہ اندھیرے سے بھر آیا تھا۔ مغرب کی اذان سنائی دی تو وہ چونکی تھی۔ جھٹ پٹ سارا سامان سمیٹ کر الماری میں رکھا اور جلدی سے باہر آ گئی۔

باہر ماں کو کسی گہری سوچ کے دریا میں ڈوبے دیکھ کر چلتی ہوئی ان کے پاس آن بیٹھی۔

''امی جی کیا سوچ رہی ہیں آپ۔'' ماں کے پاس بیٹھ کر اس نے اپنا سر ماں کے کندھے سے ٹکا دیا۔

اماں نے گہری سانس خارج کرتے اس کی طرف دیکھا اور پھر کچھ لمحے بعد گویا ہوئی۔

''کچھ نہیں بیٹا! میں نے کیا سوچنا ہے۔'' اماں نے بڑے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

''کوئی پریشانی لاحق ہے کیا۔'' اس نے سر اٹھائے ان کے چہرے پر پھیلے تفکر کے جال کو دیکھا تھا۔

''نہیں ایسا تو کچھ بھی نہیں۔''

اماں نے خود کو مطمئن ظاہر کرنے کی کوشش تھی۔

پھر اس کا دھیان بٹانے کے لیے گویا ہوئیں۔

آج کھانے میں تم نے چکن کڑاہی اور چاول بنائے ہیں نا اسے دیکھو اور روٹیاں بنا لو، تمہارا باپ اور بھائی آنے والے ہیں۔''

تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ بابا آگئے اور ان کے پیچھے پیچھے بھائی بھی چلے آئے۔

''جلدی سے کھانا لگاؤ۔ عنبرین پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں بھوک سے۔'' حسبِ معمول انہوں نے آتے ہی کھانے کا واویلہ کیا وہ فوراً اٹھی اور کچن میں چلی گئی۔ ہمیشہ کی طرح اس نے بڑے سلیقے سے تمام چیزیں دسترخوان پر سجائیں اور خود بھی ساتھ میں بیٹھ کر کھانے لگی۔

کھانے کہ ساتھ ساتھ ہلکی پھلکی گپ شپ بھی جاری تھی۔ کھانے کے بعد وہ کچن سمیٹ کر کمرے میں لیٹنا چاہ رہی تھی کہ پاپا نے آواز دی۔

''عنبرین بیٹی ایک کپ چائے کا تو بنا لاؤ بلکہ ایک کپ بھائی کے لیے بھی، دن بھر کی تھکاوٹ ہوتی ہے، جب تک تمہارے ہاتھ کی چائے نہ پی لیں تھکاوٹ جاتی ہی نہیں۔'' عنبرین نے ہمت کر کے اٹھتے ہوئے کچن کا رُخ کیا۔

وہ دونوں باپ بیٹے باہر لاؤنج میں چلے گئے اور عنبرین چائے بنانے میں مصروف ہوگئی۔

ساری تھکن دور ہو جاتی ہے بیٹیوں کی۔ محبت کے دو بولوں کے سوا بیٹوں چاہیے بھی کیا ہوتا ہے۔

چائے کے لیے وہ لاؤنج میں آئی خلافِ معمول امی اور پاپا بھی بھائی کے ساتھ بیٹھے تھے اس کے آتے ہی وہ تینوں خاموش ہو گئے۔ یہ دیکھ کر اسے کچھ حیرت محسوس ہوئی، لیکن کچھ پوچھے بغیر وہ واپس اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔ بے خیالی میں وہ دروازہ بند کیے بغیر ہی بیڈ پر لیٹ گئی اچانک اس کا دھیان باہر سے آتی بھاری آواز پر گیا۔

''پاپا جی! آپ خود سوچیں اور کتنا انتظار کروائیں ہم ان لوگوں کو دو سال تو ہو گئے ہیں منگنی کیے، لوگ باتیں بنانے لگے ہیں اور پھر ان کے والد کی طبیعت بھی کچھ خراب رہتی ہے۔ وہ لوگ پریشان رہتے ہیں، خدانخواستہ کچھ الٹا سیدھا ہو گیا تو ضمیر ملامت کرتا رہے گا۔ ماہ نور سے چھوٹی بھی ابھی دو بیٹھی ہیں۔ اس کی شادی ہو گی تو باقی دو کا نمبر آئے گا۔''

بھائی کی آواز اسے بہت واضح سنائی دے رہی تھی۔ وہ بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی، کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے اب اسے اپنے بھائی ناصر کا چہرہ بھی نظر آنے لگا تھا۔ جس پر ماہ نور بھابی کی بہنوں کے لیے بے تحاشا فکرمندی تھی۔ اس کا دل دھڑکا تھا۔ اس سے قبل کوئی اس کے دماغ کی دہلیز پر منڈلاتا۔ کچھ لمحے بعد اسے پاپا کی دھیمی بوجھل آواز سنائی دی تھی۔

''میں اور تمہاری ماں سوچ رہے تھے کہ تم سے پہلے عنبرین کی شادی ہو جاتی تو اچھا ہوتا۔''

''پاپا اس کی بھی ہو جائے گی کوئی اچھا رشتہ تو آئے، آپ فکر کیوں کرتے ہیں۔''

''ڈھنگ کا رشتہ آیا تو تھا پتا نہیں کیا سوچ کر تم نے منع کر دیا۔'' ماں کے لہجے میں ہلکا سا احتجاج تھا۔

بھائی نے ایک نظر انہیں دیکھا۔ آپ کو ان لوگوں میں

کون ساڈھنگ نظر آیا، مجھے تو ان میں کوئی بھی بات
ایسی نہیں نظر آئی کہ انہیں پسند کیا جاتا اور پھر جتنی فکر
آپ لوگوں کو عنبرین کی ہے اس سے کہیں زیادہ مجھے
ہے۔ آپ لوگ خود سوچیں، وہ میری لاڈلی بہن ہے
تو کیا ایک بھائی اپنی بہن کا بُرا سوچ سکتا ہے۔''

''نہیں بیٹا ہم بھلا ایسا کب سوچتے ہیں کہ تمہیں
اپنی بہن کی فکر نہیں ہے لیکن بیٹا ناصر یہ بھی تو دیکھو کہ
آج کل کے دور میں رشتے ملنا کتنا مشکل ہیں، پھر
بڑی مشکل ہوتی ہے اور تم ہو کہ کوئی رشتہ پسند ہی نہیں
آ رہا اچھے بھلے رشتوں کو تم نے انکار کر کے واپس بھیج
دیا۔'' عنبرین کے والد نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا۔

''پاپا آپ لوگ جو بھی سوچیں لیکن میں اپنی
بہن کے لیے جلد بازی سے کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا
میں کسی ایسے رشتے کو ہاں نہیں کر سکتا کہ جب تک
میں خود سو فیصد مطمئن نہ ہو جاؤں اور پھر اس کی اتنی
فکر کیوں کر رہے ہیں۔ وہ تو ابھی اتنی کم عمر ہے اور
پھر کیا کمی ہے اس میں جو اچھا رشتہ نہ ملے۔'' بھائی
نے بہن کی بھرپور وکالت کی۔

''اُف اللہ۔'' اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ وہ
تیزی سے دروازے سے ہٹی تھی اور دروازہ بند کیا تھا۔

'یہ نورین بھی پتا نہیں کیا کیا کہہ جاتی ہے۔ ناصر
بھائی جیسا اچھا بھائی تو ہے ہی نہیں کسی بہن کے
پاس۔' اسے ناصر بھائی ایک بار پھر اونچے مینار پر
بیٹھے نظر آئے تھے۔ ان لوگوں کے درمیان مزید کیا
گفتگو ہوئی اسے اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

وہ بیڈ پر لیٹی اور بھائی کی عظمت کو سلام پیش
کرتے ہوئے نیند کی وادیوں میں اتر گئی تھی۔

☆......☆......☆

جو گھر بھائیوں کی کمائی پر چلتے ہیں وہاں مرکزی
حیثیت بھی ان کی ہی ہوتی ہے۔ ایسے گھروں میں
والدین ثانوی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں اور ان پر
عمل کرنے کی مرضی بھی پھر بھائیوں کو ہی ہوتی ہے۔

عنبرین کو کیا خبر تھی کہ اس کے ڈھیر سارے
خواب حقیقت کا روپ دھارے بغیر ہی اس کے دل
کے ایک گوشے میں اسی خاموشی سے دفن ہو جائیں
گے جتنی خاموشی سے انہوں نے سر اٹھایا تھا۔

گھر میں شادی کا خوب شور تھا۔ دعوتوں کا
سلسلہ ختم ہوا اور زندگی اپنے معمول پر آئی تو شب کو
لیٹ کر اس نے سوچا کہ اب اسے صبح چھ بجے جاگنا
نہیں پڑے گا اب بھابی جو تھیں۔ بھائی کو جگانا،
انہیں ناشتا دینا اور لنچ تیار کر کے ان کے ساتھ کرنا ان
کی ذمہ داری ہے۔ صبح جلدی نہ جاگنے کا خیال اتنا
خوش آئند تھا کہ وہ جلد ہی نیند کی آغوش میں چلی
گئی۔ دروازے پر ہوتی مسلسل دستک پر وہ ہڑبڑا کر
اٹھی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پر گھڑی رکھی تھی اٹھ کر دیکھا تو
چھ بج رہے تھے۔ دوپٹا کاندھوں پر پھیلاتے اس
نے آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا تو سامنے ناصر
بھائی کو کھڑے دیکھ کر ایک دم حیران رہ گئی۔

''بھائی آپ خیریت؟''

''عنبرین ٹائم دیکھو، اب تک پڑی سوئی ہوئی
ہو ناشتا تیار نہیں کرنا تھا کیا؟''

ان کی تیوری بل کھا رہی تھی۔ یہ انداز اس نے
کبھی بھائی کے چہرے پر نہیں دیکھا تھا۔ نیند سے بند
ہوتی آنکھیں ایک دم کھلی تھیں۔

''بھائی وہ بھابی جی کہاں ہیں؟'' وہ پوچھے بغیر
رہ نہ پائی تھی۔

''وہ ابھی سو رہی ہے۔'' ان کا انداز برقرار تھا۔

''تو بھائی انہیں جگا دیں۔ وہ ناشتا بنا دیں گی آپ کو۔''

''اس کی عادت نہیں ہے اتنی صبح جلدی اٹھنے کی
اور اب اسے جگانے کا ٹائم بھی نہیں ہے؟'' میں لیٹ
ہو جاؤں گا اس کے اٹھنے پر، تم فٹافٹ جاؤ کچن میں
اور ناشتا بناؤ۔'' بھائی اسے حکم دیتے اپنے کمرے کی

طرف چلے گئے۔ وہ سن سی کھڑی وہیں رہ گئی اس کی عادت نہیں، تو کیا میری عادت ہے اتنی صبح جاگنے کی۔ وہ اس کے آگے سوچ نہیں پائی۔ اس کی آنکھوں میں یکدم جلن ہونے لگی تھی۔ واش روم میں جا کر اس نے پانی کے چھینٹے کافی دیر تک منہ پر مارے اور منہ پونچھے بغیر کچن میں چلی آئی۔

وقت بہت کم تھا اور کام بہت زیادہ جلدی جلدی کرنے کے چکر میں اس کا ہاتھ جلتے ہوئے توے پر پڑا۔ تیل کے چھینٹے اڑے لیکن وہ ہر چیز سے بے نیاز کام میں مصروف رہی۔

سب کچھ وقت پر تیار کر کے دے دینے کے باوجود بھائی کا موڈ خراب دکھائی دیا تھا۔ وہ چلے بھی گئے اور بھابی سوتی ہی رہیں۔ سب کچھ سمیٹ سماٹ کر وہ کمرے میں آئی تو اسے دونوں ہاتھوں میں تکلیف کا احساس ہونے لگا۔ جہاں تیل کے چھینٹے اڑے تھے اس کی سرخ سفید رنگت وہاں سے جھلس گئی تھی۔ واش روم جا کر اس نے جلی ہوئی جگہ پر ٹوتھ پیسٹ لگایا تو خود بخود آنسو اس کے ہاتھوں پر گرتے ہوئے کپڑوں میں جذب ہو گئے۔ وہ اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ لیکن اسے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

اس کے جذبوں پر شاید پہلی مرتبہ ضرب پڑی تھی۔ اس لیے وہ بیڈ پر گرتے ہوئے پھوٹ کر رو پڑی۔

☆......☆......☆

اس نے فرض کر لیا کہ بھابی کے ہونے یا نا ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا اس لیے اس نے دوسرے روز ان کا انتظار نہیں کیا اور ہمیشہ کی طرح بھائی کے لیے ناشتا اور کھانا بنانے کچن میں چلی آئی۔

''بھابی آپ!'' انہیں پہلے سے کچن میں موجود دیکھ کر اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ وہ حیران آنکھوں سے انہیں دیکھتی اندر آئی اور ان کے برابر میں آن کھڑی ہوئی۔

''ارے عنبرین اتنی جلدی کیوں جاگ گئی ہو۔ ا نہوں نے اسے دیکھا اور اس کے قریب مسکراتے گویا ہوئی۔'' میری جان میں ہوں نا، اب سمجھ لو تمہارے کام ختم، جاؤ تم سو جاؤ۔ جب چاہے اٹھ جایا کرنا کام کی فکر مت کرنا۔''

اس کی حیرانی ہوا ہو گئی۔ کہاں تو وہ کل سارا دن کمرے سے نکلی ہی نہیں تھیں اور کہاں اب یہ سب اور انہوں نے بھی شاید اس کی آنکھوں میں تحریر حیرانی کی رقم داستان پڑھ لی تھی، جب ہی وضاحتی لہجے میں بولیں۔

''وہ بات دراصل یہ تھی کہ عنبرین کل میری طبیعت خراب تھی۔ صبح سر اتنا بوجھل ہو رہا تھا کہ مجھ سے اٹھا ہی نہیں گیا، خیر اب بس تم جاؤ آرام کرو۔''

انہوں نے تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے انڈا پھینٹا اور اس کی طرف دیکھتے پھر مسکرا دی تھیں۔ اس کے چہرے پر بھی مطمئن سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ وہ بے اختیار خوش ہوتی اپنے کمرے میں لوٹ آئی اور پھر لمبی تان کر سو گئی۔

کام کا ٹینشن ختم ہوئی تو نیند بھی کیا خوب آئی۔ بارہ بجے اس کی آنکھ کھلی تو وہ باہر آئی تو ہر چیز صاف نکھری نکھری نظر آئی تھی اس کا دل خوشی سے بے قابو ہو گیا۔

''آج جاگنے کا ارادہ نہیں تھا کیا بیٹی۔'' امی شفقت بھری نظروں سے دیکھتی بولیں۔

''امی بھابی جی نظر نہیں آ رہیں؟ بیٹی اپنے کمرے میں ہوگی، ابھی سارا کام نمٹا کر گئی ہے۔ بڑی پیاری ہے۔''

''اللہ کا شکر ہے۔''

''ارے عنبرین کیسی ہو بھئی؟'' وہ شاید نہا کر آئی تھیں۔ گیلے بال ان کی پشت پر پھیلے ہوئے تھے۔ اسے امی کے پاس بیٹھے دیکھا تو مسکراتے بولیں۔

''جی میں بالکل ٹھیک آپ تھک گئی ہوں گی،

آخر سارا کام جو کیا ہے۔'' اس نے رُخ موڑ کر انہیں دیکھا اور کچھ شرمندگی سے گویا ہوئی۔

''ارے نہیں عنبرین! کیسی تھکن اچھا یہ بتاؤ ناشتا کرو گی۔'' اس کا گال چھوتے انہوں نے محبت بھرے انداز میں پوچھا، وہ اندر ہی اندر سرشار ہوگئی۔

''نہیں بس اب کھانا کھاؤں گی بلکہ میں لگاتی ہوں کھانا۔'' اُس نے یہ کہہ کر اٹھنا چاہا بھابی نے ہاتھ پکڑ کر اسے واپس بٹھادیا اور خود اٹھتے ہوئے گویا ہوئیں۔

''نہیں عنبرین تم بیٹھو میں لگاتی ہوں کھانا۔'' وہ اتنا کہہ کر کچن کی طرف بڑھی اس نے امی کو دیکھا ان کے چہرے پر سکون اور سرشاری دونوں مسکراہٹ سمیت موجود تھے، وہ خود بھی مسکرادی تھی۔

بھابی نے دسترخوان لگایا اور سب چیزیں رکھنے کے بعد انہیں آواز دی وہ تو گویا خود کو ملکہ سمجھ رہی تھی، ٹھاٹ سے اٹھی اور دسترخوان پر بیٹھ گئی اور ابھی اس نے پہلا نوالہ توڑا ہی تھا کہ آدھی آدھی کچی روٹیاں اور پانی میں تیرتی بوٹیاں اور مرچوں سے سرخ سالن نے اس کے حلق سے اترنے سے ہی انکار کردیا کچھ یہی حال امی کا بھی تھا جبکہ وہ ان دونوں کی کیفیت سے بے نیاز بڑی رغبت سے کھانا کھا رہی تھیں۔

اس نے بڑی بیچارگی سے امی کو دیکھا پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے کھانا کھانے کے لائق نہیں تھا اور ادب و آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے چند لقمے حلق میں انڈیلے اور برتن سمیت کھڑی ہوگئی۔

''اگر انہوں نے مزید ایسا ہی کھانا بنایا تو......''

اس کے آگے اس کی سوچ ادھوری رہ گئی تھی۔

☆......☆......☆

جب رات کو بھائی پلٹے تو ساتھ آئسکریم بھی لے کر آئے تھے وہ بھی اس کا پسندیدہ فلیور۔ وہ سب کچھ بھول کر ایک بار پھر خوش ہوگئی، دوپہر کا حال دیکھ کر اس نے کھانا بنانے میں خود ہی عافیت جانی۔

''عنبرین میں تمہارا بے حد احسان مند ہوں گا اگر تم صبح مجھ کو تم ناشتا بنا کر دو گی۔''

بھائی نے بڑی بیچارگی سے اسے مخاطب کیا تھا۔ اس نے حیرت سے بھائی کی طرف دیکھا۔ ''خیریت بھائی۔''

''تمہارے ہاتھ کا کھانا اتنا لذیذ ہے کہ مجھے عادت ہوگئی ہے کہ تمہاری بھابی کے ہاتھ کا کھانا تو موڈ خراب کردیتا ہے۔''

''سچ بھائی۔'' اپنی تعریف سن کر وہ بے اختیار کھلکھلائی تھی۔ ''ناصر۔'' بھابی نے مصنوعی خفگی سے گھورا۔

''مانا کہ عنبرین کھانا بہت مزیدار بنا لیتی ہے لیکن میں نے بھی تو اتنا برا نہیں بنایا تھا۔''

''ہاں...... ہاں اتنا برا نہیں تھا بس برا تھا۔'' وہ شرارت سے گویا ہوئے۔

اس سے پہلے بھابی کچھ بولتی عنبرین گویا ہوئی۔

''اوکے اوکے میں بنادوں گی۔''

''ہاں اچھی سی چائے بنادو۔''

وہ فوراً گویا ہوئے۔

''بھابی آپ کے لیے بھی بناؤں؟'' اس نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

''کون بدنصیب ہوگا جو تمہارے ہاتھ کی چائے سے منع کرے گا۔'' انہوں نے ستائشی لہجے میں کہا وہ خوشی سے بے قابو ہوئی کچن میں چلی آئی۔

بھابی اور بھائی دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے بڑے دلکش انداز میں مسکرائے تھے۔

☆......☆......☆

''اچھے علاقے میں رہائش ہے اور اپنا مکان بھی۔ لڑکے نے ایم ایس سی کیا ہوا ہے اور ایک پرائیویٹ فرم میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔ تنخواہ تیس ہزار سے زیادہ ہے۔ گھر میں صرف ماں باپ ہیں اور دو بہن بھائی ہیں۔ وہ دونوں ابھی چھوٹے ہیں ابھی پڑھ رہے ہیں۔ انہیں ہماری عنبرین پسند آئی ہے میں تو سوچ رہی ہوں

بیٹا کہ بس اب جلد از جلد عنبرین کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔ یہ بھی اپنے گھر کی ہو جائے تو میرا آخری فرض بھی پورا ہو جائے گا۔''

کسی جاننے والے کے توسط سے عنبرین کا ایک اور رشتہ آیا تھا۔ ڈھونڈنے سے بھی کوئی خامی نظر نہیں آ رہی تھی۔ امی اور پاپا دل سے راضی تھے۔ پاپا نے تو لڑکے کے بارے میں ساری معلومات بھی حاصل کر لی تھیں۔ اب وہ ناصر کو تفصیل بتا رہے تھے۔

''آپ نے بھی اچھی طرح لڑکا دیکھ لیا، کیسا ہے؟''
بڑی دیر بعد انہوں نے بے تاثر چہرے کے ساتھ پوچھا۔

''جی میں خود ہی گیا تھا اس کی فرم میں اس سے ملنے بیٹا۔'' پاپا نے بتایا۔

''تو پھر کب کی تاریخ رکھیں۔'' بھائی کو یکدم خاموش دیکھ کر امی نے پوچھا۔

''جی دیکھ لیتے ہیں جلد ہی رکھ لیں گے۔ وہ کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ پاپا اور امی ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ ظاہر ہے سارا خرچ ان ہی کو کرنا تھا مزید یہ کہ جو سیٹ وغیرہ امی نے عنبرین کے لیے بنوا رکھے تھے وہ بھی ناصر نے یہ کہہ کر بری میں چڑھوا دیے کہ میں اور بنوا دوں گا عنبرین کو۔ ابھی وقت نہیں ہے اور جو کچھ تھوڑے بہت پیسے جمع تھے وہ بھی شادی پر لگا دیے۔ اب وہ دونوں ہاتھ جھاڑے بیٹھے تھے۔ سارے کا سارا آسرا بیٹے پر تھا جس کو بظاہر کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی بہن کی شادی میں۔

☆......☆......☆

وہ بڑے مسرور انداز میں پہننے کے لیے کوئی خاص سوٹ منتخب کر رہی تھی کہ کچھ دیر پہلے آئی نورین نے اسے ٹوک دیا۔

''دیکھ لینا تم عنبرین تمہارے بھائی ناصر اس رشتے میں بھی کیڑے نکال ہی لیں گے۔ در حقیقت وہ ہر گز نہیں چاہیں گے کہ تمہاری شادی ہو۔''

''ایسی کوئی بھی بات نہیں ہے، کیوں ایسا سوچتی ہو نورین۔'' اس نے ناگواری سے اسے ٹوکا تھا۔

''میرے بھائی نے اس لیے منع کیا تھا کہ ڈھنگ کے رشتے نہیں تھے لیکن اس رشتے میں ایسی کوئی خامی نہیں ہے، سو وہ بلاوجہ منع نہیں کریں گے۔'' نورین نے کہا کچھ نہیں۔ بس اسے دیکھتی رہی اور پھر گویا ہوئی تھی۔

''خدا کرے کہ ایسا ہی ہو عنبرین، لیکن ایک بات یاد رکھو بعض دفعہ حقیقت اتنی واضح ہوتی ہے کہ دوسروں کو با آسانی نظر آ جاتی ہے اور بعض دفعہ فریب اس قدر فہیم انداز میں دیا جاتا ہے کہ بڑی دیر کے بعد سمجھ آتی ہے۔ جب پانی سر سے گزر گیا ہوتا ہے۔'' عنبرین بھی انہی بے وقوفوں میں شمار ہوتی تھی۔ جنہیں نا بے جا تعریف کا مطلب سمجھ آیا اور نہ ہی اس کی جھوٹی تعریف کے بدلے میں اپنا ردعمل۔

بھائی کو بھابی کے ہاتھ کا کھانا بنا ہوا پسند نہیں آیا یہ ذمہ داری اس نے دوبارہ اپنے سر پر لے لی تھی صفائی اسے پسند نہیں آئی۔

آگے آگے سے کی گئی صفائی اسے سخت زہر لگتی تھی اور یہی ہو رہا تھا۔ بادل نخواستہ اسے یہ ذمہ داری بھی اپنے سر لینی پڑی اور رہا گھڑی گھڑی چائے بنانے کا سوال تو بھابی کو اس کے ہاتھ کی چائے اس قدر پسند تھی کہ بھابی کے سر سے خود بخود یہ ذمہ داری اس کی ہو گئی پہلے سے زیادہ کام میں مصروف ہو گئی تھی اور اس وقت اس کا کام اور زیادہ بڑھ جاتا جب بھابی اس سے بڑے پیار اور لجاجت سے کسی ڈش کی فرمائش کر دیتیں اور وہ ان کی اس دکھاوے کی محبت کو حقیقت جان کر بڑی جانفشانی سے ان کا ہر کام کر دیا کرتی۔ مثلاً انہیں کچھ کھانا ہوتا تو کہتیں۔

''میں بنا لوں گی خود ہی عنبرین! لیکن جو مزہ

تمہارے ہاتھ میں ہے وہ شاید میرے ہاتھ میں نہ آئے زندگی بھر۔'' اور وہ فوراً ان کی فرمائش پوری کرنے میں جت جاتی۔ اس کے ہاتھ کا سلا ہوا کوئی سوٹ انہیں پسند آ جاتا تو کہتیں۔

''کاش مجھے بھی ایسا سینا آتا۔'' اور فوراً کہتی۔

''یہ کون سی بات ہے، لائیں میں سی دوں گی۔'' اور وہ چٹا چٹ کئی پیار کرتی اُس کے گال پر اور سوٹ اسے تھما دیا کرتیں، اور حقیقتاً خوشی تو اسے اس وقت ہوتی جب وہ بھائی کے سامنے اس کی تعریف کرتیں۔

اسے ابھی تک یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ یہ نیا دور ہے، بے وقوف بنانے اور قابو کرنے کے طریقے بھی نئے ہیں اور وہ بھی ان ہی نئے طریقوں کا ہتھیار بنی بے وقوف بن رہی تھی۔

☆......☆......☆

عنبرین کی بات طے ہوگئی تھی۔ آج وہ لوگ حتمی تاریخ طے کرنے آرہے تھے، ساتھ ہی ان کی یہ خواہش تھی کہ لڑکا ایک نظر عنبرین کو دیکھ لے امی پاپا اس بات پر بھی راضی ہوگئے۔

آج کل کے دور میں وہ اس پر بھی راضی نہ ہوتے تو پھر ان کی بیٹی کے ساتھ ہی زیادتی ہوتی۔

لاؤنج خوب چمک رہا تھا۔ آج اس نے بڑی جی جان سے صفائی کی تھی۔ وہ لوگ وقت پر ہی آگئے تھے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد ان کی امی نے عنبرین کو لاؤنج میں لانے کی بات کی تھی جس پر ناصر بھائی ایک دم بھڑک گئے تھے۔

''اگر آپ کے بیٹے کو آپ لوگوں کی پسند پر اعتبار نہیں تھا تو آپ نے یہ اختیار ان ہی کو کیوں نہیں دے دیا۔''

انہوں نے ہکا بکا ہو کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ ان کے ساتھ آنے والے نعمان فاروقی کا چہرہ خفت کے مارے سرخ ہوگیا تھا۔ امی پاپا گم صم بیٹے کی اس اچانک حرکت کو دیکھ کر خاموش تھے۔

وہ بتا چکے تھے کہ ان کی خواہش کیا ہے اور اس وقت کسی قسم کا کوئی اعتراض اس نے نہیں کیا تھا اور اب اچانک۔

انہوں نے درزیدہ نظروں سے ماں بیٹے کو دیکھا۔

''یہ بات نہیں ہے، بات طے ہو چکی ہے بیٹے! بس ایک نظر دیکھنا ہے اسے اور ویسے بھی مذہب اس بات کی اجازت دیتا ہے۔''

نعمان فاروقی کی امی نے بڑے تحمل سے کہا تھا۔

''جی! مذہب بھی صرف ایسے مواقع پر یاد آتا ہے جب اپنا مطلب ہوتا ہے۔ بہرحال ہم شریف لوگ ہیں۔ ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا اگر آپ اپنی خواہش پر قائم ہیں تو بہتر ہے کہ جان لیں نکاح یا منگنی سے پہلے ہم اپنی بیٹی کو نہیں دکھائیں گے۔''

ناصر نے دوٹوک لہجے میں کہا تھا۔ نعمان کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ اچانک کھڑا ہو گیا۔

''اٹھیں ماں جی بہت ہوگیا۔''

نعمان غصے سے یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ بھی خاموشی سے اٹھیں اور ایک لفظ کہے بغیر بیٹے کے پیچھے چلی گئیں۔ امی پاپا ساکت نظروں سے اپنے بے حد خوش اخلاق بیٹے کے بدترین رویے کو دیکھتے رہے اور وہ دروازے سے لگی اپنے کانوں میں گونجتی نورین کی آواز کی بازگشت کو روکنے کی سعی میں نڈھال ہوگئی۔

''دیکھ لینا تمہارے بھائی اس رشتے میں بھی کوئی نا کوئی کیڑے نکال لیں گے۔ درحقیقت وہ چاہتے ہی نہیں کہ تمہاری شادی ہو۔''

''کوئی تماشا نہیں ہو رہا ہے یہاں جو ہر کوئی منہ اٹھائے دیکھنے کی خواہش کرنے لگا ہے۔ دکان میں رکھا کوئی شو پیس نہیں ہے ہماری بہن جو پہلے اماں آ کر قیمت لگا گئیں اور پھر بیٹے کو لے آئیں کہ پسند آئے تو قیمت چکائے اور لے جائے، ورنہ دیکھ کر واپس کر دے ان کی ہمت کیسے ہوئی اس طرح کی خواہش کا اظہار کرنے کی۔'' اسے ناصر بھائی کے با آواز بلند

بڑبڑانے کی آوازیں اب تک آرہی تھیں۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس نے صحیح کیا یا غلط لیکن اس کے بعد لاؤنج میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ امی اور بابا میں سے دونوں کوئی ایک لفظ نہیں بولا تھا۔ خاموشی کا وقفہ طویل ہو چکا تھا۔ وہ جلدی سے چہرہ صاف کرتے ہوئے اٹھی اور کپڑے اٹھا کر واش روم میں چلی گئی۔

''کسی کو خبر نہیں ہونی چاہیے کہ میں رو رہی ہوں۔'' منہ پر پانی کے چھینٹے مارتے وہ مسلسل یہی سوچ رہی تھی۔ لاؤنج کی لائٹ بند ہو چکی تھی امی اور بابا شاید اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ امی اس کے پاس چلی آئیں گی پھر اس نے سوچا کہ وہ سوچیں گی میں شرمندہ ہو جاؤں گی۔ اس لیے نہیں آئیں اور بھائی بھی شاید اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ رہا بھابی کا سوال وہ تو آج کل ''خاص'' بیمار تھیں۔ سو اپنے کمرے سے باہر کم نکلتی تھیں۔

''جو اللہ چاہے گا بس وہ ہو جائے گا۔'' اس نے تمام سوچوں کو ذہن سے جھٹکا اور دودھ گرم کرنے کے لیے کچن میں آ گئی، رات کو امی اور پاپا کے ساتھ دونوں کو گرم دودھ پہنچانا بھی اس کی ذمے داری میں شامل تھا۔ دودھ گرم کر کے اس نے ٹرے میں رکھا اور ان کے کمرے کے سامنے آ کر ہاتھ سے ٹرے تھام کر ہینڈل گھمانا ہی چاہا تھا کہ اچانک اس کا ہاتھ ہینڈل پر ہی ساکت ہو گیا۔

''میں تو بالکل پریشان ہی ہو گیا تھا کہ اب تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔ کہیں بھی کوئی برائی نہیں ہے، پھر ان لوگوں کو کیسے ٹالا جائے، ویسے لوگ خاصے شریف تھے، لڑکا میرے اتنے سنانے پر بھی ایک لفظ نہیں بولا۔ افسوس تو مجھے بھی ہوا۔ لیکن میں کیا کروں سارے پیسے تو میں اپنی شادی پر لگا چکا۔ پھر جو پیسے تھے۔ وہ ایک دوست کو اس کی بہن کی شادی کے لیے قرض دے دیے اور بس۔''

''اچھا وہ جو پالیسی کے ایک لاکھ ملنے تھے۔'' بھابی پوچھ رہی تھیں۔

''نہیں وہ تو مل گئے ہیں۔ مگر وہ سارے پیسے اگر میں نے عنبرین شادی پر خرچ کر دیے تو جو مہمان چند دنوں تک ہمارے گھر میں آنے والا ہے۔ اس کا خرچہ پورا کون کرے گا۔ اس کے آنے پر دعوتیں ہوں گی، سارا خرچہ تو مجھے ہی برداشت کرنا ہے نا، پاپا کی طرف سے تو کوئی آسرا نہیں۔''

عنبرین نے ہینڈل پر سے ہاتھ ہٹا کر بوجھل دل سے ماؤف ذہن کے ساتھ دیوار کو تھاما تھا۔

''آپ تو بڑے سیاست دان نکلے ناصر۔'' بھابی کی کھنکتی آواز پر اس نے بڑی مشکلوں سے خود کو گرنے سے روکا تھا۔

''وہی لوگ عقل مند ہوتے ہیں جو ہر کام کرنے سے پہلے سے پلاننگ کر کے رکھتے ہیں، میں اپنے وارث کو دوسروں کے آسرے پر تو نہیں چھوڑ سکتا اور پھر عنبرین کا کیا ہے، دو چار سال میں ہو ہی جائے گی اس کی شادی۔ پھر ابھی اگر یہ رشتہ ڈن ہو بھی جاتا تو میرا تو سوچتے سوچتے بی پی ہائی ہو رہا تھا کہ آنے والے دنوں کے بکھیڑے کون سمیٹے گا۔ امی تو کام وغیرہ کر نہیں سکتیں اور تم سے تو ابھی کچھ نہیں ہوتا۔ بعد کا تو اللہ بہتر جانتا ہے، سو میں نے یہی سوچا کہ عنبرین کی شادی جتنی دیر سے ہو اتنا ہی اچھا ہے۔''

وہ فخریہ لہجے میں بول رہے تھے۔ عنبرین کے ہاتھوں کی تمام طاقت جواب دے گئی تھی۔ باوجود کوشش کے وہ ٹرے کو ہاتھ سے گرنے سے نہ بچا پائی تھی۔ شیشے کے نازک گلاس ٹوٹ کر چکنا چور ہو گئے تھے اور ان کے ساتھ ہی بھائی ناصر کی عظمت کا بلند مینار بھی کرچی کرچی ہو کر اس کی روح کو زخمی کرتا اس کے سامنے دھڑام سے گر گیا تھا۔

☆☆......☆☆

عشق کی راہداریوں، طبقۂ اشرافیہ اور اپنی مٹی سے جڑے لوگوں کی عکاسی کرتے سلسلے وار ناول کی تیئسویں کڑی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ملک قاسم علی جہان آباد کے مالک تھے۔ ان کا شمار ضلع خوشاب کے جانے مانے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ ان کے دو بیٹے ملک عمار علی اور ملک مصطفیٰ تھے۔ عمار علی ریاست کے امور میں دلچسپی لیتے تھے جبکہ ملک مصطفیٰ علی چھوٹی بہن امل کے ساتھ تعلیم کے سلسلے میں لاہور رہائش پذیر تھے، ملک عمار علی کی شادی ان کی کزن ماہین سے ہوئی تھی۔ وہ اٹھارہ سالہ لڑکی خود سے عمر میں کئی سال بڑے ملک عمار علی کو ذہنی طور پر قبول نہ کر سکی تھی۔ وہ کانوینٹ سے پڑھی ہوئی اور خاصے آزاد خیالات رکھتی تھی، جو لائف بھرپور طریقے سے انجوائے کرنا چاہتی تھی۔ اُمِ فروا اُمِ زارا اور اسماعیل بخش مولوی ابراہیم کی اولادیں ہیں۔ اُمِ فروا کی شادی بلال حمید سے ہوئی ہے جو میڈم فیری کے لیے کام کر رہا ہے۔ میڈم فیری کا تعلق اس جگہ سے تھا جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ بلال حمید اُمِ فروا کو پہلی بار میکے لے کر آیا تھا کہ میڈم فیری کی کال آ گئی......

میڈم فیری نے بلال عرف بالو کو باور کرایا کہ جلد اُمِ فروا کو ان کے حوالے کر دے۔ بلال حمید کے لیے یہ ناممکن سا ہو گیا تھا کیونکہ وہ اُمِ فروا سے واقعی محبت کرنے لگا تھا۔ ماہین اپنے دیور مصطفیٰ علی میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ امل کی تعلیم مکمل ہوتے ہی اُس کی شادی اُس کے کزن محمد علی کے ساتھ ہونے کی تیاریاں ہونے لگی تھیں لیکن امل کے خیالات کسی اور طرف بھٹکنے لگے تھے۔

ماہین اپنے بچپن کے دوست کاشان احمد سے ملتی ہے تو پتا چلتا ہے کاشان بچپن ہی سے اُس میں دلچسپی لیتا تھا مگر کبھی محبت کا اظہار نہ کر پایا۔ ماہین اپنے آئیڈیل کے اس طرح بچھڑ جانے پر دکھی ہے۔ کاشان احمد ملک سے باہر جانے سے پہلے ماہین سے محبت کا اظہار کر دیتا ہے۔ ماہین ملک عمار علی سے ویسے ہی ناخوش ہے اس پر کاشان احمد کا اظہارِ محبت اُس کی زندگی میں ہلچل مچا دیتا ہے۔

ماہین کے دل میں کاشان احمد کی محبت بھی جڑ پکڑ رہی ہے اور اب وہ عمار علی کی شدتوں سے مزید خائف ہونے لگی ہے۔ امل کی شادی اس کے کزن محمد علی کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ محمد علی اُسے محبتوں کی بارش میں نہلا دیتا ہے اور یوں فوجی افسر کی بیوی بن کر وہ اپنی پہلی محبت کی یادوں سے پیچھا چھڑا لیتی ہے۔ ماہین اور عمار علی کے بیچ میں تکرار ہونے لگی ہے۔ میڈم فیری بلال کو اُمِ فروا پر

کڑی نظر رکھنے کا کہتی ہے۔ ایک دن اچانک بلال کی ملک مصطفیٰ علی سے ملاقات ہو جاتی ہے اور وہ انہیں اعتماد میں لے کر اپنی اور اُمِ فروا کی رام کتھا سُنا دیتا ہے۔ ملک مصطفیٰ علی اُسے اپنے ساتھ مراد ولا میں لے جاتا ہے اور انیکسی میں رہائش اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ فیری بلال کی تلاش میں ہے۔

اچانک ملک قاسم علی کی وفات ہو جاتی ہے۔ سارا جہان آباد سوگ میں ڈوبا ہے۔ ملک عمار علی سارے انتظام اپنے ہاتھ میں لے کر بڑے ملک کے فرائض انجام دینے لگتے ہیں۔

ماہین کی ذرا سی غفلت اُسے نہ چاہتے ہوئے بھی ماں بنا دیتی ہے۔ ماہین کے دل میں کسی طرح بھی بچے کی محبت پیدا نہیں ہو پاتی۔ وہ ماں کے سنگھاسن پر بیٹھ کر بھی کاشان کی محبت کی ہُوک اپنے دل میں محسوس کرتی ہے۔ امل دوسری بار ماں بننے والی ہے۔ محمد علی مہرالنساء بیگم سے امل کا خیال رکھنے کا کہتا ہے۔ اِدھر مہرالنساء بیگم دادی بننے کے بعد چاہتی ہیں کہ ماہین ریاست کی بڑی ملکائن کی ذمے داریاں اُن کی زندگی ہی میں اپنے ہاتھ میں لے لے۔ ماہین اِس صورت حال سے سخت متنفر ہے۔ وہ جلد از جلد جہان آباد سے واپس لاہور جانا چاہتی ہے۔ لیکن ملک عمار علی اُس کی باتیں سن کر بہت رسان سے، اپنی محبت سے اُسے جہان آباد رہنے پر قائل کر لیتے ہیں۔

کاشان احمد، ماہین کو عمار علی کے ساتھ محبت کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ آخر ماہین کاشان کی محبت میں عمار علی کے ساتھ آہستہ آہستہ محبت کرنے لگتی ہے۔ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی وہ عہد کرتی ہے کہ آئندہ زندگی وہ ملک عمار کی محبت کی پاسداری میں گزارے گی۔ زندگی نئی کروٹ لیتی ہے۔ ماہین دوسری بار اُمید سے ہوتی ہے۔ اچانک اُس کے سر کا سائیں، جہان آباد کے بڑے سرکار ملک عمار علی زندگی کی بازی ہار دیتے ہیں۔ جہان آباد اس افتاد پر خون کے آنسو روتا ہے۔

ملک مصطفیٰ علی، بھائی کی اچانک موت پر دلبرداشتہ ہیں آخر ماں، بھابی اور بھتیجے کے لیے زندگی میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔

اُمِ فروا کو بالآخر بلال طلاق دے دیتا ہے اور اُمِ فروا واپس اپنے میکے آ جاتی ہے۔ اُمِ فروا کی محبت میں ملک مصطفیٰ علی کا مسلسل دین کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے اور آخر کار......

(اب آگے پڑھیے)

مہرالنساء نے ملک مصطفیٰ علی کے سسرالیوں کو بے حد عزت و تکریم دی تھی۔ اس ضیافت میں موجود ہر خاتون سے انہوں نے بے بے جی اور اُمِ زارا کو ملوایا تھا۔ سبھی ان ماں بیٹی کے حسن سے متاثر دکھائی دے رہی تھیں۔

یقیناً مصطفیٰ علی کی بیوی بھی اپنی بہن کی طرح حسین ہو گی۔ سب قدرت کی تعریف و توصیف بیان کر رہے تھے جو کیسی کیسی شکلیں تخلیق کرتی ہے۔ اُمِ زارا جس ڈریس میں ملبوس تھی وہ معروف ڈیزائنر کا تھا۔ ملک مصطفیٰ علی نے تقریب کے لیے خاص طور پر اُمِ زارا کے لیے بنوایا تھا۔ ایسا ہی ڈریس اُمِ فروا کے لیے بھی تھا۔

لائٹ ٹی اور آف وائٹ کنٹراس میں گھیرے دار فراک چوڑی دار پاجامہ کے ساتھ بڑا سا مکیش چھنا دوپٹا جس کے بارڈر پر دبکے کا نفیس کام تھا۔ سر پر ٹکائے ہلکی سی میچنگ جیولری کے ساتھ اُمِ زارا خطرناک حد تک خوبصورت لگ رہی تھی۔ ایسی سج دھج کے ساتھ ایسا قیمتی لباس آج سے پہلے اُس نے نہیں پہنا تھا۔

ملک مصطفیٰ علی حازم علی کو اٹھائے اندرون خانہ آئے تو تمام کزنز اُن کے گرد جمع ہو گئیں۔

''مصطفیٰ بھائی آپ کی سالی اتنی پیاری ہے تو بیگم تو بہت خوبصورت ہوگی؟'' ملک مصطفیٰ علی اثبات میں مسکرائے۔

''تم لوگ خود ہی دیکھ لینا ناں۔''

''مصطفیٰ بھائی، آصف بھائی کے لیے اپنی سالی کا رشتہ لے دیں ناں۔'' صدف تو مرمٹی تھی اُم زارا پر۔ جو اس وقت اسٹیج کے نزدیک کھڑی امل سے باتیں کر رہی تھی۔ ملک مصطفیٰ علی نے کن انکھیوں سے صدف کو دیکھا۔

''پلیز مصطفیٰ بھائی میرے بھیا ڈاکٹر ریحان کے لیے بات کریں ناں۔'' ہالہ نے سرگوشی میں مصطفیٰ علی سے کہا۔ امتل نے چٹکی کاٹی۔

''نہیں بس میرے شاہ میر لالہ کے لیے کوشش کریں۔'' اس دوران ملک مصطفیٰ علی مسکراتے رہے۔

''اے لڑکیوں بخش دو مجھے۔ انہوں نے ماموں زاد ہالہ کے سر پر ہلکی سی چپت رسید کی۔ اور باری باری اپنی ان تمام کزنز کو دیکھا اور ماہین کی جانب بڑھ گئے۔

انہوں نے ماہین کو دیکھتے ہی ماشاء اللہ، چشم بدور جیسے کلمات دل میں بولے۔ آج ماہین پہلے جیسی ماہی لگ رہی تھی۔ اپنی تیاری میں اُس نے خاص اہتمام کیا تھا۔ بہت خوبصورت کٹ میں سی گرین ڈریس تھا اُس کا۔ جس میں وہ کھلی کھلی لگ رہی تھی۔ وہ خوش تھی، گھر والوں کے لیے، اپنے بچوں کے لیے عمار علی کی روح کی خوشی کے لیے۔ یقیناً آج عمار بہت خوش ہوں گے۔ اُسے آج اپنی آنکھیں نم نہیں کرنی تھیں۔ بلکہ ان نیلگوں آنکھوں میں خوشیوں کی چمک پرونی تھی۔ امل نے اس سہل اور اچھے طریقے سے اُسے سمجھایا تھا۔ تب امل آپی کی ایک ایک بات اس نے اپنے پلو سے باندھ لی تھی۔ اُسے ہر حال میں خوش رہنا تھا عمار علی کے بچوں کی خاطر۔ وہ دل ہی دل میں رب کا شکر ادا کر رہی تھی کہ عمار جاتے جاتے دو خوبصورت پھول اُسے سونپ گئے تھے۔ جن کی اس نے بہترین پرورش کرنی تھی، تربیت کرنی تھی۔ انہیں بہترین مقام دلانا تھا۔ جہان آباد کے وارث تھے، حسان علی اور حازم علی۔ تب ماہین نے کھلے آسمان کی طرف دیکھا شفاف، امبر پر پرندے محوِ پرواز تھے۔

''اے مالک! تُو بڑا رحمٰن ہے۔ تیرے فیصلے بہترین فیصلے ہوتے ہیں۔'' اس کے بند ہونٹ آہستگی سے ہلے۔

رمشا نے آہستگی سے اس کا کندھا چھوا۔

''ماہی کیا دیکھ رہی ہو؟''

''دیکھ رہی ہوں اس حسین کائنات کو بنانے والا خود کس قدر حسین ہوگا۔ جو ہمیشہ اپنے بندوں کے لیے اچھا کرتا ہے۔''

''ماہی تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' رمشا نے آہستگی سے نرمی سے اُس کا ہاتھ دبایا اور ماہین کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

خاندان کی کئی خواتین نے اُم زارا کے رشتے کے لیے مہر النساء سے بات کی تھی۔ ماں جی نے انہیں جواب دیا تھا کہ آپ اُم زارا کے والدین سے رابطہ کریں۔'' وہ اس سلسلے میں خود نہیں آنا چاہتی تھیں۔

دوسرے دن مولوی صاحب کی فیملی رخصت ہوئی تھی۔ مہرالنساء نے قیمتی تحائف ساتھ دیے تھے۔
طے یہ پایا تھا فوزیہ کے جیسے ہی امریکہ سے پاکستان کے لیے ٹکٹ کنفرم ہوتے ہیں رخصتی کی تاریخ مقرر کردی جائے گی۔ ابھی تو بہت تیاریاں باقی تھیں۔ ایل بھی نوشہرو جا چکی تھی۔ ان دنوں محمد علی کی پوسٹنگ وہیں پر تھی۔ ماہین اب زیادہ تر جہان آباد میں رہتی تھی۔ اس کا جہان آباد میں زیادہ دل لگتا تھا۔ وہ بھی وقت تھا جب وہ جہان آباد رہنے پر بیڑیاں تڑواتی تھی۔ ماہین کو سکون ملتا تھا یہاں پر۔
فوزیہ بھی آنے والی تھیں۔ مہرالنساء سوچ رہی تھیں۔ فوزیہ کے آنے کی صحیح ڈیٹ معلوم ہوجائے تو مصطفیٰ کی تاریخ رکھ دیں۔

☆......☆......☆

اس ویک اینڈ ملک مصطفیٰ علی دو دن جہان آباد رہ کر واپس لاہور آرہے تھے۔ اُن کے ساتھ اُن کے کزن عرفان اسلم بھی تھے۔ جو سی ایم ایچ میں میجر ڈاکٹر تھے۔ وہ بھی دو دن پہلے ملک مصطفیٰ علی کے ساتھ آئے تھے۔ مہرالنساء سے ملنے، مہرالنساء ملک مصطفیٰ علی سے کہہ رہی تھیں۔
''پتر ایک دن اور رُک جاتے۔ عرفان بھی رہ لیتا۔ اتنی مدت بعد تو یہ جہان آباد آیا ہے۔'' مہرالنساء کے ماموں زاد کا بیٹا تھا عرفان۔ جن کی آبائی زمینیں فیصل آباد کے ایک گاؤں میں تھیں۔
''پھوپی جان میں انشاء اللہ چکر لگاتا رہوں گا۔'' عرفان آگے بڑھے تو مہرالنساء نے اُن کے ماتھے کا بوسہ لیا۔
''ماں جی اگلے ہفتے آپ نے لال حویلی آنا ہے۔''
''ہاں میں سوچ رہی ہوں۔ مولوی صاحب سے درخواست کروں کہ اب ہمیں رخصتی کرادیں۔ فوزیہ سے بھی آج بات کروں گی۔''
''ٹھیک ہے آپ اور ماہین تیار رہنا، انشاء اللہ جمعہ کو میں آپ کو آکر لے جاؤں گا۔'' مہرالنساء دونوں ہاتھوں میں مصطفیٰ علی کا چہرہ تھامے مسکرائیں۔
''ہم علی بخش ڈرائیور کے ساتھ آجائیں گے۔'' عرفان نے کن انکھیوں سے ملک مصطفیٰ علی کی طرف دیکھا۔
''میں اپنی ماں اور بھابی کو لینے خود آؤں گا۔'' ملک مصطفیٰ علی نے ماں جی کا جھریوں زدہ دودھیا ہاتھ چوما۔ مہرالنساء نے زبردستی دوپہر کے کھانے کے لیے انہیں روک لیا۔
''کھانے کا ٹائم ہے اب کھانا کھا کر ہی نکلو۔''

☆......☆......☆

اس وقت ملک مصطفیٰ علی ڈرائیونگ کررہے تھے۔ میجر ڈاکٹر عرفان اُن کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر تھے۔ ملک مصطفیٰ علی کا گن مین حیدر پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ سارا راستہ عرفان اسلم نے ملک مصطفیٰ علی کی شادی کا ذکر چھیڑے رکھا۔
''عمار لالہ کی شادی میں تو میں شرکت نہیں کرسکا تھا۔ اُن دنوں آرمی کی طرف سے میں سعودیہ میں تھا۔ اب تمہاری شادی پر خوب ہلہ گلہ ہوگا۔ مصطفیٰ سن لو تم! تمہاری شادی پر میں زبردست قسم کا ڈانس

کرنے والا ہوں۔ساتھ میں تمہیں بھی کراؤں گا۔"

ملک مصطفیٰ علی اچانک اُداس ہو گئے تھے۔انہیں ملک عمار علی یاد آ گئے تھے۔ان کی براؤنش آنکھوں میں یک بارگی یورش بڑھی تھی۔تب ہمیشہ کی طرح دائیں ہاتھ کی پشت سے بائیں گال زور سے رگڑا، ونڈ اسکرین پر اُن کی نظریں بدستور مرکوز تھیں۔شفاف سرمئی موٹروے پر دور تک نیلا آسمان جہاں سفید سرمئی نارنجی روئی کی مانند بادلوں کے بگولے تیزی سے ان کے ساتھ محوسفر تھے۔کافی دیر تک ملک مصطفیٰ علی خاموش رہے۔عرفان اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔

راوی کراس کرنے کے بعد جیسے ہی وہ لاہور شہر کی طرف ٹرن لینے لگے۔مخالف سمت سے تیز رفتاری میں آتی ویگن سے گاڑی زور سے ٹکرائی۔ایک زوردار دھماکہ ہوا۔اسٹیئرنگ پوری قوت سے ملک مصطفیٰ علی کے سر میں لگا۔ونڈ اسکرین مکمل ٹوٹ چکی تھی۔کانچ کے ٹکڑے عرفان کے ماتھے اور گردن پر لگے تھے۔ملک مصطفیٰ علی پر بھی شیشے کے ٹکڑے اڑ کر آئے تھے۔ان دونوں نے حفاظتی بیلٹ باندھی ہوئی تھی، پیچھے بیٹھا حیدر اُچھلا تھا۔اُس کا سر گاڑی کی چھت سے ٹکرایا۔لیکن معجزانہ طور پر اُسے کوئی چوٹ نہ آئی۔اُسے خراش تک نہیں آئی تھی۔ملک مصطفیٰ علی بے ہوش ہو چکے تھے۔تیزی سے اُن کا خون بہہ رہا تھا۔عرفان ہوش میں تھے۔

فوراً سارجنٹ نے فون کر کے ایمبولینس منگوالی تھی۔عرفان نے سی ایم ایچ میں میجر ڈاکٹر انوار چوہدری کو فون کر دیا تھا۔ملک مصطفیٰ علی کی کنڈیشن ایسی تھی فوری طور پر آپریشن ہونا چاہیے تھا اُن کا۔عرفان خود زخمی تھے۔لیکن اس وقت انہیں صرف ملک مصطفیٰ علی کی فکر تھی۔میجر عرفان ڈاکٹر ہوتے ہوئے سمجھ نہ پا رہے تھے ملک مصطفیٰ علی کی پوزیشن کے بارے میں۔خون بہت بہہ چکا تھا۔ایمبولینس میں ہی عارضی فرسٹ ایڈ دے دی گئی تھی۔ایمبولینس فل اسپیڈ میں کینٹ میں داخل ہوئی تھی۔اب وہ سی ایم ایچ کی طرف فراٹے بھر رہی تھی۔

میجر عرفان نے ابھی تک کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔حیدر کو بھی منع کر دیا۔ایمرجنسی میں ملک مصطفیٰ علی کا آپریشن جاری تھا۔سرجن عارف بیگ نے میجر ڈاکٹر عرفان اسلم کو آپریشن میں شامل ہونے سے روک دیا تھا۔سرجن عارف بیگ کے ساتھ باقی ڈاکٹرز تھے۔عرفان اسلم کی ٹریٹ منٹ ہو چکی تھی۔ونڈ اسکرین کے شیشے لگنے سے وہ کافی زخمی ہوئے تھے۔اس وقت وہ آپریشن تھیٹر کے باہر کھڑے بے چین دکھائی دے رہے تھے۔

تین گھنٹے کا آپریشن کامیاب رہا تھا۔ملک مصطفیٰ علی خطرے سے باہر تھے۔یہ تو میجر عرفان بھی سمجھ رہے تھے لیکن وہ پریشان تھے۔اڑتالیس گھنٹے میں ملک مصطفیٰ علی کا ہوش میں آنا ضروری تھا ورنہ...... ورنہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔انہیں آئی سی یو میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔عرفان سوچ رہے تھے کہ اگر مصطفیٰ کے سسرال میں اطلاع دی گئی تو اُن کی تمام رات پریشانی میں گزرے گی۔لہٰذا صبح ہی سب کو بتایا جائے۔میجر عرفان اسلم نے اپنے گھر میں فون کر کے والدہ اور بیوی کو بتا دیا تھا کہ میں مصطفیٰ علی کے ساتھ جہان آباد سے آ گیا ہوں۔رات میں مصطفیٰ کی طرف ہی رکوں گا۔"

رات بارہ بجے میجر عرفان اسلم ڈاکٹرز کے پینل کے ساتھ اپنے آفس میں موجود تھے۔اس وقت ملک

مصطفیٰ علی کا کیس ڈسکس ہو رہا تھا۔ میجر عرفان بہت سنجیدہ تھے۔ باقی پینل کے لوگ بھی فکر مند تھے۔ ان اڑتالیس گھنٹوں میں ہر صورت ملک مصطفیٰ علی کو ہوش میں لانے کی کوشش کی جانی تھی۔ آہستہ آہستہ تمام ڈاکٹرز سرجن اٹھ چکے تھے۔ کرنل عارف بیگ نے میجر عرفان کو بھی آرام کرنے کے لیے کہا تھا۔ ملک مصطفیٰ علی کا موبائل میجر عرفان کے پاس تھا جو انہوں نے Silent پر رکھا ہوا تھا۔ ماہین کی کال تھی۔ انہوں نے چیک کیا تو بہت ساری مس کالز تھیں ماہین کی۔ وہ میجر عرفان کو بھی فون کرتی رہی تھی۔ انہوں نے ماہین کا نمبر ملایا۔

''کیسی ہو ماہی؟''

''عرفان بھائی آپ لاہور پہنچ گئے؟''

''ہاں ہم سات بجے پہنچ گئے تھے۔''

''مصطفیٰ بھائی فون کیوں نہیں اٹھا رہے، سخت فکر ہو رہی ہے۔ پھوپی ماں بھی پریشان ہیں۔ پہلے تو پہنچ کر فوراً وہ فون کرتے تھے۔''

''ماہی دراصل آج میں بھی لال حویلی رُک گیا ہوں کہ کچھ گپ شپ لگائیں گے۔ مصطفیٰ علی ابھی مردان خانے کی طرف گیا ہے۔ دراصل چند کسانوں کا آپس میں کوئی سنگین مسئلہ ہوا ہے۔ فون وہ یہیں بھول گیا ہے۔''

''اچھا وہ آئیں تو اُن سے کہیں فون کرلیں۔''

''ماہین بیٹا وہ خیریت سے ہے۔ تم کیوں فکر کر رہی ہو۔ میں تو اب سونے لگا ہوں، وہ جانے کس وقت آئے۔ وہ صبح تم لوگوں کو فون کرے گا۔ اب تم سو جاؤ اور پھوپی جان سے بھی کہو وہ بھی سو جائیں۔ وہ فکر نہ کریں آج رات میں اُن کے بیٹے کے پاس ہوں۔''

اتنا لمبا چوڑا جھوٹ بولتے ہوئے الفاظ میجر عرفان کے گلے میں اٹک اٹک گئے۔ رندھی آواز پر وہ بمشکل قابو پا سکے تھے۔ میجر عرفان اسلم، ملک مصطفیٰ علی سے کافی بڑے تھے دونوں میں زبردست قسم کی دوستی تھی۔ جبھی فرینک بھی بہت تھے۔ جب بھی ملتے کھلی ڈلی گپ شپ لگتی دونوں میں۔ میجر عرفان کئی مرتبہ آ کر ملک مصطفیٰ علی کو دیکھ چکے تھے۔ ابھی تک وہ بے ہوش تھے۔

میجر عرفان اسلم تمام رات بے چین رہے۔ صبح مؤذن نے اذان دی تو وہ ہاسپٹل کے اندر ہی مسجد میں چلے گئے۔ باجماعت نماز پڑھنے کے بعد دیر تک مصطفیٰ علی کے ہوش میں آنے کی دعائیں کرتے رہے۔ گڑگڑا کر رب سے اُن کی صحت بھری سلامتی مانگتے رہے۔

''کیوں ناں مولوی صاحب کو فون کر کے بتا دوں تاکہ وہ سب مصطفیٰ کے لیے دعا کریں۔ ملک مصطفیٰ علی کے موبائل پر انہوں نے مولوی ابراہیم بخش کا نمبر تلاش کیا۔

ملک مصطفیٰ علی کا نمبر دیکھ کر مولوی صاحب نے دوسری ہی بیل پر فون اٹھا لیا تھا۔ عرفان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیسے مولوی صاحب کو بتائیں۔ گھبراہٹ و بے چینی کا ردِعمل ایک کسیلی بڑبڑاہٹ کی صورت، گلے کو کھنکار کر صاف کیا۔ بھلا وہ مولوی صاحب سے کیا کہتے کہ آپ کا داماد موت و حیات کی کشمکش میں بے ہوشی میں مبتلا ہے۔

''السلام علیکم مولوی صاحب۔''

''جی وعلیکم السلام۔'' آواز اجنبی تھی۔

''مولوی صاحب میں میجر ڈاکٹر عرفان اسلم بات کر رہا ہوں۔ ملک مصطفیٰ علی کا کزن ہوں۔''

''جی جناب خیریت سے ہیں آپ۔'' مولوی صاحب کی آواز میں فکرمندی عود آئی تھی۔

''دراصل مولوی صاحب آپ کو یہ بتانا تھا مصطفیٰ علی کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ سی ایم ایچ میں ایڈمٹ ہے۔ سر میں چوٹیں آئی ہیں۔ آپ اُن کے لیے خصوصی دعا کریں اور بھابی سے بھی کہیں مصطفیٰ علی کے لیے دعا کریں۔''

''ڈاکٹر صاحب یہ سب کیسے ہوا؟''

''مولوی صاحب آپ تشریف لائیں گے تو آپ کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کروں گا۔ جہان آباد میں ابھی نہیں بتایا۔ دن چڑھ جائے تو پھوپی جان کو بتاؤں گا۔'' انہوں نے یہ اس لیے کہا تھا معاً وہاں فون نہ کردیں۔

''اجازت چاہوں گا۔'' میجر عرفان نے فون بند کردیا تھا اور نپے تلے قدم اٹھاتے سی ایم ایچ کی عمارت کی جانب بڑھنے لگے تھے۔

اب وہ آئی سی یو روم میں تھے۔ ملک مصطفیٰ علی کو دیکھا۔ اُن کی آنکھیں چیک کیں۔ پھر سوالیہ نگاہوں سے نرس کی طرف دیکھا۔ نرس نے نفی میں سر ہلایا کہ انہیں ایک لمحہ کے لیے بھی ہوش نہیں آیا۔

وہ ڈاکٹر تھے۔ ملک مصطفیٰ علی کی پیچیدہ حالت کے بارے میں بہت کچھ سمجھ رہے تھے۔ وہ دعا کررہے تھے اڑتالیس گھنٹے سے پہلے پہلے مصطفیٰ علی کو ہوش آجائے۔ وہ سامنے کاؤچ پہ آکر بیٹھ گئے۔ اُن کے لیے اسپیشل چائے آچکی تھی۔ گرم گرم چائے نے اُن کے تھکے تھکے اعصاب کو قدرے تقویت پہنچائی تھی۔

☆......☆......☆

صبح دس بجے کے قریب میجر عرفان نے ماہین کو فون کیا۔ ماہین جاگی ہوئی تھی اور حازم علی کو فیڈ کرا رہی تھی۔ فوراً سے پہلے اُس نے اسکرین پر افی بھائی دیکھ کر فون اٹھالیا۔

''اِفی بھائی خیریت! آج تو صبح صبح آپ نے فون کرلیا۔''

''ہاں۔''

''مصطفیٰ بھائی کو میرے فون کا بتایا تھا؟'' وہ حازم علی کو اپنے قریب لٹاتے ہوئے بولی۔

''ماہی تم سے بات کرنی ہے بیٹا ذرا ہمت سے میری بات سننا۔''

''خیریت تو ہے اِفی بھائی۔'' وہ حلق کے بل چیخی۔

''ہاں بھئی خیریت ہے تم پریشان مت ہو۔ دراصل کل لاہور میں انٹر ہوتے ہوئے مصطفیٰ علی کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ کچھ چوٹیں لگی ہیں مصطفیٰ علی کو، میں بھی زخمی ہوا ہوں مصطفیٰ سی ایم ایچ میں ہے۔ آپریشن تو اُس کا ہوچکا ہے۔ دعا کرو جلد ہوش میں آجائے۔ اُس کے سر میں چوٹ لگی ہے۔'' میجر عرفان کے لہجے سے فکرمندی چھلک رہی تھی۔

ماہین کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ جیسے آواز نے اُس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ گنگ ہوچکی تھی پھر اُس کی

سسکیاں میجر عرفان اسلم نے فون پر سنی۔

''بیٹا تم بہت بہادر لڑکی ہو، ہمت سے کام لو اور پھوپی جان کو بھی بہت آرام سے بتانا۔ تم لوگ جلدی پہنچنے کی کوشش کرو۔''

''اِفی بھائی خطرے کی تو کوئی بات نہیں ہے ناں۔ مصطفیٰ بھائی ٹھیک تو ہیں۔''

''ہاں ماہی وہ ٹھیک ہے۔''

''ہاں بھئی میری بات پر تمہیں یقین کیوں نہیں آ رہا تم خود آ کر دیکھ لینا۔ اچھا میں فون رکھتا ہوں۔''

ماہین کانپ رہی تھی۔ اس کا جسم پتھر کی بھاری سل کی مانند محسوس ہو رہا تھا۔ اُس نے پیر بیڈ سے نیچے اُتارنے چاہیے پیروں میں جان ہی نہیں تھی۔ بمشکل اٹھنے میں کامیاب ہو پائی۔ خود کو گھسیٹتے ہوئے پھوپی ماں کی خواب گاہ تک آئی۔ وہ اس وقت تسبیحات پڑھ رہی تھیں۔ ماہین کی آنکھوں میں بار بار دھندلا اندھیرا چھا جاتا۔ وہ مہر النساء کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ بمشکل اُس نے خود پر کنٹرول رکھا تھا۔ چہرے کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ مہر النساء نے تسبیح مکمل کر کے سائیڈ پر رکھی۔ اور مسکرا کر ماہین کی طرف دیکھا۔

''پتر آج جلدی اُٹھ گئیں؟'' انہوں نے ماہین کے ماتھے کا بوسہ لیا۔ وہ اُن سے نظریں کترا رہی تھی۔ توقف بعد گویا ہوئی۔

''پھوپی ماں آج لال حویلی نہ چلیں۔ چھاموبھی اپنے چاچا کو یاد کر رہا ہے۔'' ماہین نے اُن کا ہاتھ دبایا۔

''ماہین کل ہی تو مصطفیٰ علی گیا ہے۔''

''چلتے ہیں ناں پھوپی ماں۔'' ماہین نے اُن کے گلے میں بانہیں حمائل کر دی۔ اس وقت ماہین کس پل صراط سے گزر رہی تھی یہ تو وہی جانتی تھی۔

''ماہین جمعہ کو تو جانا ہی ہے۔ دو دن تک پٹواری نے آنا ہے۔ اچھا ہے پٹواری کا کام نمٹ جائے۔ ورنہ تاریخیں ہی دیتا رہے گا۔ آبیانے کے معاملے کو کچھ کھینچ رہا ہے۔''

''نہیں پھوپی ماں ہمیں آج ہی جانا ہے۔ آپ مجھے بتائیں میں آپ کی پیکنگ کر دیتی ہوں۔''

''ماہین آخر کیوں تم اس قدر اصرار کر رہی ہو۔ خیریت تو ہے۔'' اچانک تفکرات اُن کے چہرے پر پھیلے۔

''وہ پھوپی ماں مصطفیٰ بھائی تو بالکل ٹھیک ہیں معمولی سی چوٹ آئی ہے انہیں۔ عرفان بھائی کا فون آیا تھا۔ چلتے ہیں ناں پھوپی ماں۔ مصطفیٰ بھائی سے بھی مل لیں گے۔'' ماہین اُن سے نگاہیں چراتے ہوئے بے ربط بول رہی تھی۔

''کیا ہوا مصطفیٰ علی کو۔'' ماں جی نے ماہین کی بے ربط گفتگو سن کر اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ اُن کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ جسم پر رعشہ کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

''پھوپی ماں آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔ وہ خیریت سے ہیں۔ بتا رہی ہوں ناں معمولی سی چوٹ آئی ہے۔ میں آپ کا ناشتا بنواتی ہوں ہم ایک گھنٹے تک نکل رہے ہیں۔''

''تم بس میری بات کراؤ مصطفیٰ علی سے۔''

پھوپی ماں ڈاکٹروں نے انہیں بات کرنے سے منع کیا ہے۔ انی بھائی ہیں اُن کے پاس، آپ فکر نہ کریں۔ بس اُن کے لیے دعا کریں۔'' ماہین جلدی جلدی اُن کی پیکنگ کر رہی تھی۔ اُسے ابھی اپنی اور بچوں کی بھی پیکنگ کرنی تھی۔ مزید وہاں کھڑے رہنا ماہین کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

ماں جی اور ماہین تمام راستہ دعا کرتی رہی تھیں ملک مصطفیٰ علی کی زندگی وصحت کے لیے۔

ماں جی تب سے گم صم تھیں۔ وہموں کی ماری یہ ماں اندر سے سخت خوف زدہ تھی۔ جانے اُن پر کیسی قیامت ٹوٹنے والی تھی۔ پہلے ہی ایک جوان کڑیل بیٹے کو کھو چکی تھیں۔ اُن میں اب ہمت نہیں تھی مزید کوئی صدمہ سہنے کی۔ وہ نڈھال لگ رہی تھیں۔

☆......☆......☆

میجر عرفان اسلم کے فون سے مولوی ابراہیم بخش سخت پریشان ہوئے تھے۔ وہ اُس وقت مسجد میں ہی تھے۔ انہوں نے دو رکعت نفل پڑھے اور نہایت عاجزی وانکساری سے اللہ پاک سے ملک مصطفیٰ علی کی صحت یابی اور ہوش میں آنے کی دعائیں کیں۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی گھر والوں کو کیسے بتائیں گے۔ سرمئی اندھیرا اسپیدی میں تبدیل ہو رہا تھا۔ اس وقت پورا موچی گیٹ نیند میں اونگھ رہا تھا۔

وہ تیزی سے اپنے گھر کے گیٹ کی طرف بڑھے۔ اس گلی میں سب سے بڑا گھر مولوی ابراہیم بخش کا ہی تھا۔

انہوں نے گیٹ بجایا۔ جانتے تھے اُن کی زوجہ غلام فاطمہ برآمدے میں ہی ہوں گی۔ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد وہ تلاوتِ قرآن پاک کیا کرتی تھیں۔ اسماعیل، اُمِ فروا اور اُمِ زارا نماز پڑھنے کے بعد سوجاتے تھے۔ بے بے جی نے گیٹ کھول دیا وہ جانتی تھیں اس وقت مولوی صاحب ہی گھر آتے ہیں۔ مولوی صاحب اندر آتے ہوئے چونکے۔ اُمِ فروا بھی آج برآمدے میں بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی۔

''اُمِ فروا بیٹا آج نماز پڑھنے کے بعد سوئی نہیں؟''

''ابا جی لیٹی تو تھی لیکن نیند نہیں آئی سوچا بے بے جی کے پاس چل کر بیٹھوں۔ عجیب سی بے چینی محسوس ہو رہی ہے۔ دل بھی گھبرا رہا ہے اللہ خیر کرے۔'' مولوی صاحب نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا توقف بعد بولے۔

''بیٹا تین کپ چائے بنا لاؤ۔''

''جی اچھا۔'' اُمِ فروا کچن کی طرف بڑھ گئی۔ اس وقت پیور شیفون کا سفید دوپٹا جس پر نفیس سی لیس ٹکی ہوئی تھی اُس کے چہرے کا ہالہ کیے ہوئے تھا۔

بے بے جی دوبارہ تخت پوش پر آ کر بیٹھ چکی تھیں۔ انہوں نے مولوی صاحب کی طرف دیکھا۔ جو بار بار داڑھی پر ہاتھ پھیرتے سوچوں میں گم تھے۔

''مولوی صاحب خیریت تو ہے آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔''

''غلام فاطمہ پریشانی ہی کی بات ہے۔''

''کیا بات ہے مولوی صاحب؟'' بے بے جی کی تمام توجہ اُن کے متفکر چہرے پر مرکوز تھی۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے ملک مصطفیٰ علی کے ماموں زاد کا فون آیا تھا۔ ملک صاحب کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ ابھی ہوش نہیں آیا۔ سی ایم ایچ میں ہیں۔"

"میرے مالک خیریت فرما۔" اچانک سے بے بے جی کی رنگت پیلی پڑ گئی۔ چہرے پر فکر مندی چھا گئی۔

"غلام فاطمہ چائے پی کر ہم ابھی ہاسپٹل چلتے ہیں۔ اسماعیل کو بھی جگا دو۔"

"ابا جی کہاں جا رہے ہیں آپ لوگ؟" اُم فروا چائے کی ٹرے لیے قریب آ گئی۔

"بیٹھ تو جاؤ۔" بے بے جی نے خود کو سنبھالا۔

"ملک مصطفیٰ علی کا کل ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے سر میں چوٹ آئی ہے۔ پتر تم اُن کے لیے دعا کرو۔" بے بے جی نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ اُم فروا کا سر گھوما آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ زمین پیروں تلے سرکتی محسوس ہوئی۔

"حوصلہ رکھو اُم فروا۔" اب بے بے جی نے اُسے دونوں کندھوں سے تھام لیا تھا۔

"ملک صاحب ٹھیک ہیں تم بس دعا کرو۔ اسماعیل کو جا کر اٹھا دو ہم ابھی نکلیں گے۔"

"بے بے جی وہ ٹھیک ہو جائیں گے ناں۔" اُس کی آواز رندھی گلے میں جیسے کسی نے دہکتے کانٹے بھر دیے تھے۔

"انشاء اللہ وہ جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔ اللہ کی ذات بے نیاز ہے وہ تمہارے سہاگ کو ہمیشہ سلامت رکھے گا۔" مولوی صاحب چائے پی کر وہاں سے اُٹھ چکے تھے۔

"بے بے جی میں بھی چلوں گی۔"

"اُم فروا تم ویسے ہی پریشان ہو۔ ابھی ہمیں جانے دو شام کو اسماعیل تمہیں لے جائے گا۔ تم اُنہیں دیکھ کر تسلی کر لینا۔" وہ نڈھال قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔ جائے نماز بچھاتے ہوئے سجدے میں گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اُس رب سے ایک ہی التجا تھی۔

"مالک میرے ملک جی کو ٹھیک کر دے......" روتے روتے اُس ہچکیاں بندھ گئیں۔ اُس کی خوبصورت سیاہ آنکھیں سوج گئی تھیں۔ جنونِ ہیجان میں مبتلا اپنی خود سے بھی لاتعلق محسوس کر رہی تھی خود کو۔

بے بے جی کب سے دروازے کے وسط میں کھڑی اُم فروا کو یوں تڑپ تڑپ کر اپنے رب سے التجائیں کرتا دیکھ رہی تھیں۔ اچانک بے بے جی کے دل کو گونا گو تشفی محسوس ہوئی۔ اُن کے بھینچے ہونٹ کپکپائے۔ انشاء اللہ ملک مصطفیٰ علی ضرور ٹھیک ہو جائیں گے اُن کی بیوی کی فریاد وہ مالک کل ضرور سنے گا۔ اُم زارا بھی بے بے جی کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ بے بے جی نے اُم زارا کو اشارے سے جانے کے لیے کہا۔ دونوں دبے پیر باہر نکل گئیں۔

اُم فروا سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اُس نے عارضوں پر لڑھکے آنسو ہتھیلیوں میں جذب کیے اور کھڑے ہوتے ہوئے پہلے عبادت اور پھر حاجت کے نوافل پڑھتی رہی۔ اُس کے سجدے طویل تھے اس کے پاؤں سوجھ چکے تھے۔ کمر تختہ بن گئی تھی۔ کندھوں کا کھچاؤ بڑھ رہا تھا۔ لیکن اُسے قطعی کچھ محسوس نہ ہو رہا تھا۔ اس

وقت اس بندی اور اسے پیدا کرنے والے کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں بچا تھا وہ محسوس کر رہی تھی خدا اُسے دیکھ رہا ہے، سُن رہا ہے، اس کے دل کی تکلیف جان رہا ہے۔ یک بارگی اس کا تسلسل بکھرا۔

''آپی زوال کا ٹائم ہو چکا ہے۔ اب بس کر دو۔'' اُمِ زارا اُس کے نزدیک آ گئی۔ ہاسپٹل سے اسماعیل بھائی کا فون آیا ہے۔ بتا رہے تھے مصطفیٰ بھائی کی حالت خطرے سے باہر ہے۔'' اُمِ فروا نے سلام پھیرنے کے بعد مسکرا کر اُمِ زارا کی طرف دیکھا۔

''واقعی، اُمِ زارا۔''

''ہاں آپی بھلا میں کیوں غلط بولوں گی۔ آپ خود اسماعیل بھائی سے بات کر لیں۔ آ جائیں میں ناشتا بناتی ہوں۔ میں نے بھی ابھی تک ناشتا نہیں کیا۔''

''میں آتی ہوں۔'' درودِ پاک پڑھنے کے بعد اُس نے دعا کے لیے ہتھیلیاں جوڑ لیں۔

شام کو اُمِ زارا نے اُسے اٹھایا۔ ''آپی اٹھیں اسماعیل بھائی کہہ رہے ہیں تیار ہو جائیں۔ مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد آپ کو ہاسپٹل لے جائیں گے۔ ماہین بھابی اور ماں جی آپ کا بہت پوچھ رہی تھیں۔ آپ کی طرف سے وہ فکرمند تھیں۔'' اُمِ فروا اُٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ بال پیچھے کرتے ہوئے بوجھل آنکھوں سے اُمِ زارا کی طرف دیکھا۔

''اُمِ زارا اُن کا کیا حال ہے اب؟''

''ٹھیک ہیں مصطفیٰ بھائی، میں آپ کے کپڑے واش روم میں رکھ دیتی ہوں آپ شاور لے لیں۔''

اُس کا دل نہیں چاہ رہا تھا چینج کرنے کو لیکن اس کا ملگجا لباس دیکھتے ہوئے اُمِ زارا نے اُسے زبردستی واش روم کی طرف دھکیلا تھا۔

☆......☆......☆

ہاسپٹل کی لابی میں اس کے قدموں کی رفتار میں شدید تیزی آ گئی تھی۔ وہ اسماعیل بخش کے برابر چل رہی تھی۔ رومز کے سیٹنگ لاؤنج میں ماہین اور ماں جی اُداس بیٹھی اسے دکھائی دی تھیں۔ اُمِ فروا نے ماں جی کو سلام کیا۔ انہوں نے فرطِ جذبات سے مغلوب ہوتے ہوئے اُسے گلے لگا لیا۔ اور اُمِ فروا کے روشن ماتھے پر اپنے لرزش زدہ ہونٹ ثبت کر دیے۔

''ماں جی انشاء اللہ وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔'' اُمِ فروا نے مہرالنساء بیگم کے ہاتھوں پر بوسہ دیا۔ پھر ماہین کی جانب بڑھی۔

''بھابی فکر نہ کریں وہ بہت جلدی اچھے ہو جائیں گے۔'' لڑکھڑاتا لہجہ زبان کا ساتھ نہ دے پا رہا تھا۔

''ہم سب دعا کر رہے ہیں ناں۔''

''انشاء اللہ مصطفیٰ بھائی بہت جلد ہوش میں آ جائیں گے۔'' ماہین رندھی آواز میں بولی۔

''کیا ابھی تک انہیں ہوش نہیں آیا؟'' اُمِ فروا کی روح پر پڑے چھالے پھوٹ پڑے۔

''نہیں آیا۔'' ماہین نے اُس سے نظریں کترائیں۔ وہ صوفے پر ڈھے جانے والے انداز میں بیٹھ گئی۔

''اُمِ فروا میں نیچے لاؤنج میں ہوں۔'' اسماعیل بخش کو اُس نے سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔

''اُم فروا پتر دعا کرو اپنے سہاگ کی سلامتی کے لیے۔''

''ماں جی وہ بہت جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔'' انہیں تسلیاں دیتے ہوئے اس کا دل کٹ رہا تھا۔ اُس نے بمشکل آنسو روک رکھے تھے۔ لیکن اُسے ہمت کرنی تھی ورنہ اُس ماں کی ہمتیں جواب دے جاتیں۔ جنہوں نے پہلے ہی ایک جوان بیٹا کھویا تھا۔ ماہین جس نے سہاگ کھویا تھا۔ اب ملک مصطفیٰ علی ہی تو تھے ان تینوں خواتین کا خیال رکھنے والے۔

''ڈاکٹرز کا پینل اندر ہے چیک اپ ہو رہا ہے۔ وہ جاتے ہیں تو تم مصطفیٰ بھائی سے مل لو۔'' ماہین نے اُس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے اُم فروا کی طرف دیکھا۔ اُم فروا نے سر کو جنبش دی اور خشک ہونٹوں کو آپس میں بھینچا۔ مہر النساء بیگم کے تسبیح کے دانے تیزی سے گر رہے تھے۔ ماہین اور اُم فروا دل ہی دل میں خداوند قدوس کو پکارتے ہوئے اُس اللہ سے مدد مانگ رہی تھیں۔ ملک مصطفیٰ علی کے ہوش میں آنے کی دعائیں کر رہی تھیں۔

ڈاکٹرز روم سے باہر نکلے باقی تو آگے بڑھ گئے میجر عرفان اسلم ان کے پاس رُک گئے۔ اُم فروا کو دیکھتے ہی پہچان گئے۔ یقیناً یہی مصطفیٰ علی کی بیوی ہے۔ انہوں نے ملک مصطفیٰ علی کے نکاح کی تصاویر دیکھ رکھی تھیں۔ وہ مبہوت سے ٹکٹکی باندھے اس سوگوار حسن کو دیکھ رہے تھے۔ ایسی معصومیت و پاکیزگی بھرا مکمل حسن انہوں نے آج سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ وہ غیر معمولی پُرکشش لڑکی تھی۔ کوئی ماوراء، اپسرا، یونانی شہزادی پرستان کی پری یا مصر کی کوئی قدیم حسن بانو، وہ مہر النساء بیگم سے بات کرتے کرتے غیر ارادی طور پر نگاہیں جھکائے بیٹھی اُم فروا کو دیکھ رہے تھے۔

''عرفان! مصطفیٰ علی کو کب ہوش آئے گا؟''

''پھوپی جان دعا کریں ہمیں اڑتالیس گھنٹے تک انتظار کرنا ہوگا۔ اس دوران مصطفیٰ علی کو ہوش آجائے۔''

''افی بھائی آخر ہوش کیوں نہیں آ رہا؟'' ماہین اُن کے قریب آ کر کھڑی ہوگئی۔

''ماہی دعا کرو اُسے ہوش آجائے ہوش آنا بہت ضروری ہے۔ اُس کے سر میں گہری چوٹ آئی ہے۔ میں نیچے اپنے آفس میں ہوں۔ تھوڑی دیر بعد پھر چکر لگاؤں گا۔ آپ مصطفیٰ کو دیکھ سکتے ہیں۔ بھابی آپ بس دعا کریں انشاء اللہ مصطفیٰ جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔'' میجر عرفان اسلم اب اُم فروا کے قریب آ کر کہہ رہے تھے۔

''انشاء اللہ۔'' اُم فروا کے منہ سے اچانک نکلا۔

''بھابی آپ مصطفیٰ کو دیکھ لیں۔''

''جی۔''

''پھوپی جان میں نے آپ کے ریسٹ کرنے کے لیے ایک روم ارینج کیا ہے وہاں آرام کریں۔ نرس آپ کو روم دکھا دے گی۔''

''ٹھیک ہے افی بھائی۔'' ماہین گویا ہوئی۔

''ماہین بچوں سے بات ہوئی؟''

''جی...... وہ سیماں کے پاس ہیں لال حویلی میں۔ امل بھی پہنچنے والی ہے۔ وہ پہلے لال حویلی جائے گی بچوں کو چھوڑنے۔''

''اچھا۔ میں یہیں ہوں کچھ دیر تک چکر لگاتا ہوں۔'' اس وقت میجر ڈاکٹر عرفان اسلم ملٹری یونیفارم میں اپنے کاندھوں پر عہدے کے رینک سجائے ڈیشنگ لگ رہے تھے۔ اُم فروا نے مہر النساء بیگم کو سہارا دیتے ہوئے اٹھایا۔ ماہین نے اُم فروا کو اشارہ کیا کہ تم ماں جی کو اندر لے جاؤ۔ میں یہیں رُکتی ہوں۔''

اُمِ فروا نے اثبات میں پلکیں جھپکیں۔ ماہین نے لال حویلی فون کر کے سیماں کو بچوں کے متعلق ہدایات دینی تھیں۔ حازم صرف تین ماہ کا تھا۔ وہ مدر فیڈ کا عادی تھا۔ ساتھ میں وہ اُسے بے بی ملک بھی دیتی تھی۔

اُمِ فروا مہر النساء کو لے کر جیسے ہی اندر داخل ہوئی۔ اس کی رُکی رُکی سانسیں بے اعتدال کی لوح میں پھونکنی کی طرح دہک گئیں۔ اُس نے انگلیوں سے ہونٹ دبائے دوسری ہتھیلی رندھی گردن پر سرسرا رہی تھی۔ ملک مصطفیٰ علی بیڈ پر بے سدھ لیٹے تھے۔ بائیں ہاتھ پر ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ سر پر سفید پٹی بندھی تھی۔ اُمِ فروا کو زمین سرکتی محسوس ہو رہی تھی۔ اپنے پیروں پر کھڑا رہنا دشوار گزار تھا۔ ضبط کی عنابوں کو اُس نے مزید کسا۔ اُسے ہر صورت ہمت سے کام لینا تھا۔ اس کے قلب سے اللہ ھو اللہ ھو کی صدائیں ابھر رہی تھیں۔ اُسے اپنے اللہ پر بھروسا تھا جس نے اُمِ فروا کے ملک جی کو بہت جلدی ٹھیک کر دینا تھا۔ مہر النساء بیگم ملک مصطفیٰ علی کے بیڈ کے قریب آ کر کھڑی ہوگئی تھیں۔ اُم فروا کو بھی اشارے سے اپنے قریب بلا لیا تھا۔

مہر النساء سورتیں پڑھ پڑھ کر ملک مصطفیٰ علی پر پھونک رہی تھیں۔ اُم فروا ساکن کھڑی ایک ٹک انہیں دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اُم فروا نے مہر النساء بیگم کو سامنے کے صوفے پر بٹھا دیا تھا۔ کانٹوں بھری سانسیں اُس کے خشک گلے میں خراشیں ڈال رہی تھیں۔

''میرے مالک! میں نے اور ملک جی نے آنے والی زندگی کے جو خواب اپنی آنکھوں میں پروئے تھے انہیں بہترین تعبیر عطا کرنا۔''

مہر النساء بیگم نے اُمِ فروا کو اشارے سے بیڈ کے نزدیک پڑی چیئر پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئی، فرطِ جذبات سے اُس کی آنکھیں سُلگ رہی تھیں۔ اس کا مخملی سراپا لرزش زدہ تھا۔

'اپنے بندوں کے توکل پر پورے اترنے والے میرے مالک کب ہوش آئے گا ملک جی کو۔' آنکھوں میں بھرتے جل تھل اُس نے بمشکل روک رکھے تھے۔

''اُمِ فروا۔'' مہر النساء کے پکارنے پر اُس نے چونکتے ہوئے جھرجھری لی اور اُن کی طرف دیکھا۔

''میں باہر جا رہی ہوں۔ تم اِدھر ہی رُکو۔''

''جی اچھا۔'' بمشکل اس کے گلے سے آواز نکلی تھی۔ ماں جی کے جاتے ہی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ وہ بار بار آنسو انگلیوں کی پوروں پر اتارتی تو وہ اسی تیزی سے پھر لبالب بھر جاتیں۔

''ملک جی آپ بہت جلد ہوش میں آ جائیں گے۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور بیڈ کے قریب آ کر کھڑی ہوگئی۔

''ملک جی آپ سے دوریوں کے سلسلے میں سہار نہ پاؤں گی۔ ابھی ابھی تو ہماری روحیں ملی تھیں۔ ابھی تو

میں نے آپ کی اُنگلی تھام کر نخلستانوں کی سبز گل شریں بدن وادیوں میں قدم بڑھائے تھے۔ آپ نے میری اُنگلی اتنے مختصر لمحوں کے لیے تھوڑی تھامی تھی۔ ہمارا سفر تو لا متناہی صدیوں پر مقید تھا۔
''یک بارگی اُس کی متورم آنکھیں آہستگی سے بند ہوئیں۔ وہ اپنے سہاگ کی اپنی زندگی میں ہمیشگی کی خداوند قدوس سے گڑگڑا کر دعائیں مانگتی رہی۔ اپنی اور اپنے ملک جی کی دائمی رفاقتوں کی طلب تھی اس کے گھمبیر تا لہجے کی پور پور میں...... اُسے قوی اُمید تھی گل پوش موسم ضرور اُن کے دلوں میں آباد ہوں گے۔ آمین اُس کے بھیجے لب ہلے۔

اڑتالیس گھنٹے بھی گزر گئے۔ ملک مصطفیٰ علی کو ہوش نہ آیا۔ جیسے جیسے لمحے گزر رہے تھے۔ سب ہی تشویش میں مبتلا ہو رہے تھے۔ یہ سب ملک مصطفیٰ علی کے پیارے اپنے پیارے کے لیے ہر سانس کے ساتھ عائیں مانگ رہے تھے۔ کوئی تو لمحہ بار آوری کا ہوگا۔ سچا رب اپنا معجزہ دکھادے گا۔ اُمید کا دامن کسی نے بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ وہ مایوسی کے کسی ریلے کو اپنے نزدیک نہیں آنے دے رہے تھے۔ لیکن خوف تھا جو تھرتھراتے پیروں میں گھبراہٹ کی کنڈلی کس رہا تھا۔

ہر جگہ ملک مصطفیٰ علی کے لیے دعائیں ہو رہی تھیں۔ غریب غربا میں کھانا تقسیم کیا جا رہا تھا۔ رعایا کا بچہ بچہ اپنے مالک کی صحت یابی اور ہوش میں آنے کی دعائیں کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر کے پینل نے تفصیلی اُن کا چیک اپ کیا۔ جو رپورٹ آئی تھی اُس میں تھا۔ ملک مصطفیٰ علی ''کوما'' میں جا چکے ہیں۔ یہ دورانیہ کتنا ہو سکتا ہے، اس بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اُن کے مزید دو ٹیسٹ ہوئے، رپورٹس دو دن بعد آنی تھیں۔

ماں جی وقت سے پہلے ہی لاغر و نحیف دکھائی دینے لگیں تھیں۔ ماہین اہل اور اُم فروا انہیں تسلیاں دے رہی تھیں۔ جبکہ وہ خود اندر سے ٹوٹی ہوئی تھیں۔ اہل واش روم میں جا جا کر رو رہی تھی۔ آنکھوں پر ضبط کے احکام کسی صورت وہ باندھ ہی نہیں پا رہی تھی۔ اُم فروا آنکھوں میں اُمڈتے ریلے کو روکنے کی سعی میں نڈھال تھی۔ اُسے آنسو آنکھوں سے باہر نہیں گرنے دینے تھے۔ ورنہ اُس کے آنسو مہر النساء بیگم کو مزید درگور کر دیتے۔ ماہین کے حوصلے مضبوط تھے۔ اندر سے وہ بھی تھرتھر کانپ رہی تھی۔ وہ چھوٹی سی لڑکی اندر سے کسی قدر بڑی ہو چکی تھی۔ ہمت و صبر سے سب کو سنبھال رہی تھی۔ وہ اس وقت پھوپی ماں کی بھی بزرگ دکھائی دے رہی تھی۔ پل پل انہیں تسلی و تشفی دیتی رہی۔

مہر النساء ماں تھیں۔ اکلوتے بیٹے کا صدمہ کیسے سہارتیں۔ اب تو دل بھی پے در پے صدموں سے آخری ہچکیوں کے سرہانے ایستادہ کھڑا اونگھ رہا تھا۔ کیا اب اُن میں اتنی ہمت تھی، اتنا بڑا صدمہ برداشت کرنے کی۔

میجر عرفان اسلم نے ان چاروں خواتین کو بہت سنبھالا تھا۔ اُس طریق اُنہیں سمجھایا کہ وقتی طور پر کیسلے زخموں پر امرت پھاہے رکھے محسوس ہوئے تھے ان سب کو۔ اہل رُک گئی تھی محمد علی دو دن رہ کر چلے گئے۔ اُن کی بٹالیں کسی کوہسار کی ویلی میں مشقوں کے لیے جانے والی تھی۔

اہل دن بھر سب کو تسلیاں دیتی۔ لیکن رات کو اپنے کمرے میں تکیے میں چہرہ چھپائے آنکھیں لال کرتی

رہتی۔ وہاں اُم فروا کی بھی ایسی ہی کیفیت تھی۔ اُس کی نیندیں اُس سے روٹھ چکی تھیں۔ اس کا ذہن سُن رہنے لگا تھا۔ ایک اذیت ناکی تھی جو اپنی کرب آمیزی کے پھالیوں سمیت اس پر مسلط تھی۔ ہر لمحہ اُس کے دل سے ملک مصطفیٰ علی کی صحت یابی واس بھیانک نیند سے جاگنے کی صدائیں ابھرتیں۔
ملک مصطفیٰ علی کی رپورٹس آچکی تھیں۔ اُن کی پوری باڈی پہلے کی طرح تندرست تھی۔ صرف دماغ کا کچھ حصہ متاثر ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ 'کوما' میں گئے تھے۔ ڈاکٹرز پُر امید تھے۔ مگر 100 فی صد تو کوئی ڈاکٹر بھی مطمئن نہیں ہوتا۔ اصل علم رکھنے والی ذات تو اللہ ہی کی ہے۔ سو سب کو اللہ کی ذات پر بھروسا تھا۔ میجر عرفان اسلم کا خیال تھا کوما کا پیریڈ زیادہ طویل نہیں ہوگا۔ دوسرے لمحے اپنی سوچ کو جھڑکتے کہ طویل ہو بھی سکتا ہے۔ ملک مصطفیٰ علی کی باڈی لینگویج میں ایک تل کے برابر بھی فرق نہیں آیا تھا۔ کسی بھی لمحے میں۔

☆......☆......☆

امل پابندی سے نماز نہیں پڑھتی تھی۔ اب وہ پوری نمازیں پڑھنے لگی تھی۔ دیر تک خداوند قدوس سے اپنے بھائی کی زندگی اور اس گھور کالی نیند ٹوٹنے کی دعائیں کرتی۔ اُس کی سنہری خوبصورت آنکھوں میں بدستور موٹے آنسوؤں کے ریلے اُترتے رہتے۔ امل سجدے میں گڑگڑاتی اللہ میرے اکلوتے بھائی کو جلدی سے ٹھیک کردے۔ کتنے ارمان تھے ہم سب کے دلوں میں اُن کی شادی کے۔ مصطفیٰ بھائی خود بھی کس قدر خوش تھے۔ وہ تو نکاح کے روز ہی کہہ رہے تھے آج ہی رخصتی ہوجائے۔ اپنے پہلو میں بیٹھی اُمِ فروا سے نگاہیں نہیں ہٹ رہی تھیں۔ تب انہوں نے ماہین اور امل کو میسج کیے۔
''ماں جی سے کہو رخصتی کرالیں۔'' امل بھائی کی بے چینی دیکھ کر واقعی امل ماں جی کے قریب پہنچ گئی تھی۔
''ماں جی مولوی صاحب سے کہیں ہمیں آج ہی رخصتی بھی دے دیں۔'' مہرالنساء بیگم نے امل کو گھورا۔
''دماغ خراب ہے تم لوگوں کا، ہم نے صرف نکاح کے لیے مولوی صاحب سے کہا تھا۔ رخصتی کے لیے نہیں۔''
''پلیز پھوپی ماں مان جائیں نا۔'' ماہین نے سرگوشی میں کہا۔
''دماغ خراب ہے تم دونوں کا۔ ان بھلے مانس لوگوں کو عین ٹائم پر رخصتی کے لیے کیسے کہہ سکتے ہیں۔'' مایوس ہوکر اُن دونوں نے مصطفیٰ علی کو میسج کردیا تھا۔
''ماں جی ہرگز نہیں مان رہیں۔'' میسج پڑھنے کے بعد ملک مصطفیٰ علی کا چہرہ لٹک گیا۔
''فروا ابھی ہمیں تین چار مہینے مزید انتظار کرنا پڑے گا۔'' انہوں نے قریب بیٹھی اُمِ فروا سے آہستگی سے کہا تو وہ جھینپ کر مسکرائی تھی۔
اب ماں جی سوچتی تھیں کہ کتنا اچھا ہوتا ہم نے جب نکاح کی بات کی تھی۔ رخصتی کی بھی کرلیتے۔ کچھ وقت تو دونوں بچے ساتھ رہ لیتے لیکن ایسا ممکن نہیں تھا۔ یہ تو صرف انہوں نے ہی سوچا تھا ناں۔ ان کے رب کی ایسی مرضی نہیں تھی۔ جب خدا کی ہی مرضی نہیں تھی تو پھر اُمِ فروا کیسے رخصت ہوکر ملک قاسم علی کی حویلی آتی۔

☆.........☆.........☆

میجر عرفان اسلم نے سی ایم ایچ میں ایک روم بک کروالیا تھا۔ جہاں امل اور ماہین کچھ دیر آرام کرتی تھیں۔ دوپہر تک اُم فروا بھی آجاتی، مہرالنساء بیگم کو اب امل یہاں نہیں لاتی تھی۔ وہ ان چند دنوں میں حد سے زیادہ کمزور ہوگئی تھیں۔ کھانا پینا اُن کا برائے نام رہ گیا تھا۔ امل اور ماہین ماں جی کے لیے فکر مند تھیں۔ اُم فروا کو تو چپ لگ گئی تھی۔ ہوں ہاں میں جواب دیتی تھی۔ وہ تو نزع کے عالم میں محصور تھی۔ گا نٹھیں پڑی جان کنی جیسی کیفیت میں مبتلا تھی۔ دنیا اُسے پھیکی لگنے لگی تھی۔

کتنے دنوں سے ملک مصطفیٰ علی اس اُداس ہاسپٹل میں سفید بستر پر چت لیٹے گہری نیند سو رہے تھے۔ ہر وقت ڈرپ انہیں لگی رہتی۔

اس دوپہر میجر عرفان اسلم ان کے روم میں آئے تو انہیں دیکھتے ہوئے امل سسک پڑی۔

''اَفی بھائی پلیز کچھ کریں کہ میرے لالہ اس بھیانک نیند سے جاگ جائیں۔'' انہوں نے بے بسی سے امل کی جانب صرف ایک سیکنڈ کے لیے دیکھا۔

''امل اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اسے اس نیند میں جانے ہی نہ دیتا۔ جب اللہ چاہے گا یہ جاگ جائے گا۔ اس کی یہ نیند ٹوٹ جائے گی۔'' اس وقت ہاتھ میں ملٹری کیپ پکڑے میجر عرفان اسلم افسردگی سے گویا تھے۔

''تم سب کی دعائیں ہی اب اسے ٹھیک کرسکتی ہیں۔'' ضبط کے باوجود امل اپنے آنسو روک نہ پائی جو اب روانی سے اس کے گال بھگو رہے تھے۔ ان سب کا مشترکہ درد کس قدر اذیت ناک تھا۔ ایک دوسرے کو تسلی تشفی دینے کے علاوہ ان کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ نگاہیں آسمانوں کی وسعتوں میں موجود اُس رب پر تھیں جس نے ملک مصطفیٰ علی کو ٹھیک کرنا تھا۔ اس وقت ماہین کی آنکھیں نم تھیں جبکہ اُم فروا خاموشی سے ہاتھ کی گرفت میں جمی تسبیح کے دانے گراتی رہی۔ اب میجر عرفان اسلم اُم فروا کی جانب توجہ کر رہے تھے۔

''بھابی آپ کی دعائیں مصطفیٰ کو مزید ٹھیک کردیں گی۔'' اُم فروا نے اثبات میں آنکھوں کو جنبش دی۔

''جس سے محبت کرنے والے اتنے لوگ موجود ہوں اُسے اللہ پاک ضرور ٹھیک کردے گا۔'' اُن کے لیے چائے آئی تو میجر عرفان نے بھی اُن کے ساتھ چائے پی۔

''اُم فروا تم کچھ دیر مصطفیٰ بھائی کے پاس جا کر بیٹھو۔'' ماہین اُس سے مخاطب تھی۔

''جی۔'' اُم فروا نے اثبات میں سر ہلایا۔ نپے تلے قدم اٹھاتی سٹنگ روم سے نکل کر ملک مصطفیٰ علی کے روم کی جانب بڑھنے لگی۔ اس وقت وہ سفید چوڑی دار پاجامے کے ساتھ سیاہ انتہائی نفیس پرنٹ کے شیفون قمیض کے سوٹ میں ملبوس تھی۔ طویل لابی سے گزرتے نفوس بغور اُسے دیکھ رہے تھے لیکن وہ تو صرف اپنے ملک جی کے خیالوں میں گم تھی۔

اُم فروا آہستہ روی سے چلتی ملک مصطفیٰ علی کے بیڈ کے نزدیک آگئی۔ وہ تو گہری نیند میں تھے بھلا انہیں اُم فروا کے آنے کا کیسے پتا چلتا۔ وہ سوچ رہی تھی اس دیوہیکل نیند کو ان پر ترس کیوں نہیں آتا۔ اس کی غلافی آنکھوں میں درد کی چبھن بڑھی۔ اُم فروا نے اپنا کپکپاتا ہاتھ نرمی سے اُن کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اُم فروا نے اپنی یخ بستہ انگلیوں کی پوریں اُن کے مضبوط ہاتھ پر سرسرائیں۔ پھر اُن کے ہاتھ کو آہستگی سے دبایا۔

''ملک جی آج پورے دس دن ہو گئے ہیں آپ کو سوئے ہوئے۔ اب اٹھ جائیں دیکھیں تو سب آپ کی وجہ سے کس قدر پریشان ہیں۔'' اس کی سیاہ آنکھیں گلابی ڈوروں سے لبریز ہوتی سُلگ اٹھیں۔ وہ بیڈ کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی۔ اُم فروا کی لانبی انگلیاں اب بھی ملک مصطفیٰ علی کے ہاتھ پر سرسرا رہی تھیں۔

''ملک جی ہم دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ دائمی اور پاک ساتھ نبھانے کے کتنے عہد و پیمان کیے تھے۔'' وہ ایسے بول رہی تھی جیسے اُسے بھرپور یقین تھا ملک مصطفیٰ علی اُسے سُن رہے ہیں۔

''ملک جی اُس روز جب فون پر میں آپ سے کہہ رہی تھی۔ میں تو اپنے ملک جی کو ہر آہٹ، میں ہر پل میں، ہر رنگ میں دیکھتی ہوں۔ رات کی رانی کی خوشبو بھری مہکاروں میں محسوس کرتی ہوں۔ آنگن میں جھلملاتی ہوا میں دیکھتی ہوں۔ رات کی خاموشی کی پُراسرار دیوی میں دیکھتی ہوں۔ گونجتے روشن اجالے میں مجھے دکھائی دیتے ہیں۔ تب آپ نے میرا خوب مذاق اڑایا تھا۔

''فروتم شاعرہ کب سے بن گئیں۔''

''جب سے ایسے وجیہہ شخص سے منسوب ہوئی ہوں۔''

لیکن اُسے ربِ العزت کی ذات پر یقین تھا وہ ضرور معجزہ دکھائے گا اور اس کے ملک جی اس گہری خوفناک بھیانک نیند سے ضرور جاگیں گے۔ اچانک اُس کی سیاہ آنکھوں میں امیدیں جھلملائیں۔ وہ یونہی بیٹھی انگشت شہادت سے سامنے آئیں چند لٹیں ہلاتی رہی۔

ان چند دنوں میں اُم فروا بہت کمزور دکھائی دینے لگی تھی۔ صبح اسماعیل اُسے سی ایم ایچ چھوڑ جاتا۔ اور شام کو گھر لے جاتا۔ وہ صبح آٹھ بجے تک یہاں پہنچ جاتی۔ امل اور ماہین کے آنے تک وہ ملک مصطفیٰ علی کے پاس رہتی۔ گم صم بیٹھی ٹکٹکی باندھے انہیں دیکھتی رہتی۔

اس شب جب وہ تہجد پڑھ کر فارغ ہوئی تھی تو بے بے جی اُم فروا کے نزدیک چلی آئیں۔

''اُم فروا تھوڑی دیر کے لیے آرام کرلو۔'' بے بے جی اس کی متورم آنکھیں دیکھ کر رنجیدہ تھیں۔

''کیا کروں بے بے جی، نیند نہیں آتی۔''

''بیٹا کوشش کرو گی تو آ جائے گی۔''

آج کل مولوی ابراہیم بخش کے گھر کی فضا بہت سوگوار تھی۔ بوجھل گھمبیر سناٹے ہر کونے کھدرے میں منہ چھپائے محسوس ہوتے۔ اُم فروا بے بے جی کے مزید قریب ہوگئی۔

''بے بے جی وہ اس کالی نیند سے جاگ جائیں گے ناں؟'' اس کی آنکھوں میں ایسی تڑپ تھی جیسے کسی نے اس کے کچے کھرنڈ سفاکی سے نوچ ڈالے ہوں۔

''انشاء اللہ بیٹا خدا کی ذات پر بھروسا رکھو۔ ملک مصطفیٰ علی بہت جلد کومے سے باہر آئیں گے۔ اُم فروا اللہ پاک کی ذات سے کبھی مایوس نہ ہونا۔''

''جی بے بے جی۔'' وہ اُن کے کندھے پر سر ٹیک کر گہری طمانیت پا گئی تھی۔ بے بے جی آہستہ آہستہ اُس کا سر تھپتھپاتے ہوئے آواز بابلند سورۃ مزمل پڑھتی رہیں۔

☆......☆......☆

مہرالنساء بیگم نے ڈیری انڈسٹری کی تمام تر ذمے داری میر عارفین علی پر ڈال دی تھی۔ میر صاحب

ملک قاسم علی کے کالج کے زمانے میں کلاس فیلو رہ چکے تھے۔ میر صاحب نیک خصائل کے ایک ایماندار شخص تھے۔ جنہوں نے تمام زندگی پولیس میں نوکری کی لیکن کبھی ایک دھلہ بھی رشوت کے نام پر نہ لیا۔ نہ ہی رشوت کبھی اپنے آفیسروں کو کھلائی، اُن کی ایمانداری کی وجہ سے ہی وہ ڈی ایس پی سے آگے ترقی نہ کر سکے۔ ہمیشہ اُن کی ترقی رُکی رہی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ایک نجی کمپنی میں سپروائزر تھے۔ ملک قاسم علی نے انہیں اپنی ڈیری فیکٹری میں بڑی پوسٹ پر تعینات کرلیا تھا۔ میر صاحب نے یہاں بھی نہایت ایمانداری سے اپنے فرائض انجام دیے۔ ہر ہر معاملے پر اُن کی نگاہ رہتی باریک بینی سے ہر ڈپارٹمنٹ سے منسلک اسٹاف کا جائزہ لیتے۔

انڈسٹری کو کبھی Loss میں نہ جانے دیا بلکہ ڈیری مصنوعات کی ڈیمانڈ بڑھتی چلی گئی۔ ملک قاسم خود ہر ماہ میر صاحب سے میٹنگ کرتے۔ ملک مصطفیٰ علی تو اکثر میر صاحب سے ملاقات میں رہتے۔ ملک قاسم علی کی وفات کے بعد ملک عمار علی اور ملک مصطفیٰ علی کے مشترکہ فیصلے پر میر صاحب کو چند ڈیپارٹمنٹ کا چیئرپرسن بنا دیا گیا تھا۔ بہت ساری ذمے داریاں انہیں سونپ دی گئی تھیں۔ اُن کی کارکردگی کی بدولت اُن کی سیلری، گاڑی، رہائش، میڈیکل کا پیکیج بھی بہترین دیا جا رہا تھا۔

اب مہرالنساء بیگم نے ماہین سے مشورہ کرنے کے بعد میر صاحب کو مزید اختیارات سونپ دیے تھے۔ میر صاحب اتنی بڑی ذمے داری اٹھانے سے ہچکچا رہے تھے۔ لیکن مہرالنساء بیگم کے اصرار پر انہیں یہ ذمے داری قبول کرنا پڑی۔ انہیں اب مالکوں کے اعتماد پر پورا اترنا تھا۔ انہیں نہایت محنت سے اپنے فرائض کی انجام دہی نبھانی تھی۔

مہرالنساء بیگم اور ماہین کے سر پر کسی مرد کا سایہ نہیں تھا۔ دونوں بچے ابھی کم سن تھے۔ جہان آباد میں مزارعے کیا کرتے پھر رہے ہیں۔ مہرالنساء بیگم کسی پر بھروسہ کرتیں کسی پر نہ کرتیں۔ سب ہی مزارعے ایماندار تو نہیں ناں ہو سکتے۔ مجبور ہو کر انہوں نے اپنے بھتیجے ارسلان کو دیکھ بھال کے لیے کہا تھا۔ جن کا گاؤں ضلع خوشاب میں ہی جہان آباد سے چند کلومیٹر کی دوری پر واقع تھا۔

ارسلان ہفتہ میں دو تین بار جہان آباد منشی اور کاردار سے تفصیلی بات چیت کرتے، کھاد، بیج، کیڑے مار ادویات، ڈیزل کا خرچہ، ایک ایک چیز کا حساب لیتے۔

تمام لوگ ملک مصطفیٰ علی کے جلد صحت یاب ہونے کی دعائیں کر رہے تھے۔ گاؤں کی کتنی عورتوں نے منتیں مانی تھیں۔ دیسی گھر کے چراغ جلانے کی نیت کی تھی۔ جہان آباد کے اس چشم و چراغ کے لیے۔ کون تھا جو دعائیں نہیں کر رہا تھا۔

بلال حمید دو دفعہ ہاسپٹل آیا تھا ملک مصطفیٰ علی کو دیکھنے۔ وہ چاہ رہا تھا میر عارفین علی اُسے ترقی دے دیں۔ لیکن میر صاحب نے صاف انکار کر دیا تھا کہ وہ ایک سال تک کسی فرد کو بھی ترقی نہیں دیں گے۔ انشاء اللہ ملک مصطفیٰ علی بہت جلدی ٹھیک ہو جائیں گے تو ایسے فیصلے وہ خود کریں گے۔''

بلال حمید کو میر صاحب کا انکار بہت برا لگا تھا۔ اب بلال حمید کے دل میں میر عارفین علی کے لیے جلن کڑاھن بے زاری بھرتی جا رہی تھی۔

اُم فروا اب بھی بلال حمید کے خیالی پنگھوڑوں میں سمندری جل پری بن کر اترتی وہ کبھی اس شبنمی پیکر کو

اپنے خیالوں سے نکال نہ پاتا۔

''بلال کیا ہوا؟ آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں۔'' نورین اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''نیند نہیں آ رہی تھی۔'' اُس نے مسکرا کر نورین کی طرف دیکھا۔

''سو جائیں۔'' نورین نے وال کلاک پر نظر ڈالی ساڑھے چار بج رہے تھے۔ وہ سگریٹ کا اَدھ جلا ٹکڑا کب سے ایش ٹرے میں مسل رہا تھا۔ اذانیں شروع ہو چکی تھیں۔ دور سے نزدیک سے ایک ہی صدا فضاؤں میں گونج رہی تھی۔

''اللہ اکبر...... اللہ اکبر......'' اُسے پھر اُم فروا کا خیال آیا۔

☆......☆......☆

ملک مصطفیٰ علی کو کوما میں گئے تقریباً ایک ماہ ہو چکا تھا۔ اس دوران مہر النساء بیگم ایک بار جہان آباد گئی تھیں۔ ارسلان تمام امور خوش اسلوبی سے انجام دے رہا تھا۔ مہر النساء مطمئن تھیں۔ زیست کے تمام تقاضوں کو ساتھ لے کر چلنا تو تھا ہی۔ منشی سے اندراج کے تمام رجسٹر منگوا کر انہوں نے خود چیک کیے۔ یہ ریاست ایک امانت تھی۔ مصطفیٰ علی، عمار علی کے بچوں کی، مہر النساء بیگم کا ایسا دبدبہ تھا کہ کسی کی جرأت نہیں تھی ایک پیسے کی ہیر پھیر کرے۔ وہ کوئین میری اسکول کی فارغ التحصیل اسٹوڈنٹ میں شمار ہوتی تھیں۔ بے حد ذہین جرأت مند تھیں اور قابل خاتون تھیں۔ ایک بار کا سنا دیکھا کبھی نہ بھولتیں۔ یہ بات جہان آباد کے تمام مزارعے بخوبی جانتے تھے۔ انہوں نے سب کو جتلا بھی دیا تھا کہ سنبھل کر رہنا۔ مہر النساء بیگم نے ایک بار پھر مستحقین میں اناج تقسیم کرایا تھا۔ جہان آباد کی عالی شان مسجد کی تزئین و آرائش کا کام مزید بڑے پیمانے پر شروع کرایا تھا۔ دیگیں پکوا کر غربا میں تقسیم کرائیں۔ سب ہی لوگ اپنے ملک کی صحت یابی کے لیے دعا گو تھے۔

امل واپس جا چکی تھی۔ دن میں کئی بار ماہین اور ڈاکٹر عرفان اسلم کو فون کرتی۔ اُم فروا سے بات کرتی، اُسے تسلی دیتی۔ جب وہ اندر سے خود بھی خوف زدہ تھی۔ ایک مہینے میں کوئی بہتری نہیں آئی تھی۔ پہلے دن جیسی کنڈیشن تھی اُن کی۔

☆......☆......☆

ملک مصطفیٰ علی کو کوما میں گئے ایک ماہ پندرہ دن ہو گئے تھے۔ آج اُن کا تفصیلی چیک اپ ہوا تھا۔ چند ٹیسٹ بھی کیے گئے تھے۔ سر کا ایکسرے کوئی چوتھی بار لیا گیا تھا۔ قدرت جب چاہتی انہیں ٹھیک کر دیتی۔ ڈاکٹر عرفان اسلم نے برطانیہ میں ایک معروف آرمی سرجن المور لاسن سے رابطہ کیا تھا۔ ملک مصطفیٰ کی تمام رپورٹس میل کی تھیں۔ ڈاکٹر عرفان ملک مصطفیٰ علی کو باہر بھی لے جانے کے لیے تیار تھے۔

چند دن بعد سرجن المور لاسن کا جوابی ای میل آ چکا تھا۔ انہوں نے اپنی رپورٹس میں لکھا تھا۔

''امید کی جا سکتی ہے کہ جلد یہ پیشنٹ کوما سے نکل سکتا ہے۔'' امید تو لگی ناں۔ اسی لیے کہتے ہیں اچھی امیدوں کے ساتھ جینا چاہیے امیدیں توکل اور یقین دیتی ہیں حوصلہ بخشتی ہیں۔ ڈاکٹر عرفان خوش تھے۔ انہوں نے ان تینوں خواتین کو یہ خوشخبری سنائی تھی۔ امید کی کرن مزید روشن ہو گئی تھی۔

اُم فروا دن بھر ملک مصطفیٰ علی کے پاس رہتی۔ مہر النساء بیگم کبھی کبھار شام کے وقت آتیں امید کی

کرنیں اُن کے جھریوں زدہ چہرے پر دکھائی دیتیں۔ آنکھوں کی مانند پڑتی روشنی واپس آنے لگی تھی۔ ماں جی کے ساتھ اکثر حسان علی بھی آ جاتا۔ وہ دلچسپی سے ملک مصطفیٰ علی کو دیکھتا۔ توتلی زبان میں ماں سے پوچھتا کہ یہ اُٹھ کیوں نہیں رہے؟''
ماہین اُسے بہلاتی۔ ''چھاموچھوٹے بابا سو رہے ہیں ناں۔ جانو ہم باہر چلتے ہیں ورنہ وہ ڈسٹرب ہوں گے۔'' ماہین اُسے لے کر باہر آ جاتی۔ حسان علی اُم فروا سے بہت مانوس ہو چکا تھا۔ آتے ہی اُس کی گود میں بیٹھ جاتا۔ ماں جی نے حسان علی کو سمجھایا تھا یہ تمہاری چھوٹی ماں ہیں۔ چھوٹے بابا کی بیوی...... بھلا اُسے کیا پتا بیوی کیا ہوتی ہے۔ وہ آنکھوں میں مسکانیں بھرے بغور اُم فروا کو دیکھتا۔ اور پھر اُس کے گلے لگ جاتا۔ تب اُم فروا اپنے ہونٹ چھامو کے سیاہ بالوں میں چھپا لیتی۔

☆......☆......☆

ماہین پھوپی ماں کی اجازت سے آج فوڈ انڈسٹری گئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ملک شاہ جہان کی فیملی کی کوئی خاتون کاروباری امور کے لیے گھر باہر نکلی تھی۔ جہاں مرد ہی مرد تھے۔ ماہین کو ہمت کرنا تھی اُسے اب اپنے پیروں پر خود کھڑا ہونا تھا۔ کسی قسم کا نقصان نہیں ہونے دینا تھا۔ اونر کی حیثیت سے اُسے بہت سمجھداری اور احتیاط کی ضرورت تھی۔ شاہ جہان انڈسٹریز کو عروج پر لے کر جانا تھا۔ ان چند دنوں میں ماہین نے بزنس ایڈمنسٹریشن کچھ کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔ رات کو دیر تک وہ موٹی موٹی بکس پڑھتی رہتی۔ کوئی کہہ سکتا تھا یہ وہی لاأبالی ماہین ہے جو صرف اپنی ذات کے بارے میں سوچا کرتی تھی۔
ملک مصطفیٰ علی اکثر اس سے انڈسٹری کی بابت بات چیت کرتے رہتے تھے۔ وہ تجربہ بھی اس کے پاس تھا س۔ میر عارفین علی کے ساتھ اس نے طویل میٹنگ رکھی تھی۔ جس میں فرم میں اعلیٰ عہدوں پر فائز چیدہ چیدہ لوگ بھی شامل تھے۔ ماہین کو تفصیلی بریفنگ بھی دی گئی تھی۔ جس میں اسے تمام ایشوز پر تفصیل سے آگاہ کیا گیا تھ۔ اس نے اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ اس کی ابزرویشن زبردست تھی۔ وہ سمجھ سکتی تھی یہ لوگ فارملیٹی نبھا رہے ہیں یا اس کے ساتھ ایماندار ہیں۔ میر صاحب پر اُسے مکمل بھروسا تھا۔ وہ پُر امید تھی۔ اس نے میٹنگ کے دوران اُس سے کہا تھا کہ انشاء اللہ ملک مصطفیٰ علی بہت جلد آپ کو جوائن کریں گے۔ بھرپور اعتماد و یقین تھا ماہین عمار کے لہجے میں۔
وقت نے اُسے اس قدر پُر اعتماد بنا دیا تھا جو اس وقت صدارتی چیئر پر بیٹھی کس قدر با اعتماد، باوقار مرعوب کن پرسنالٹی دکھائی دے رہی تھی۔
ماہین اس وقت آفس سے نکل ہی رہی تھی کہ کاشان احمد کی کال آ گئی۔
''ہائے کاشان۔''
''کیسی ہو ماہی؟''
''اللہ کا شکر ہے بہت اچھی ہوں۔ تم کہاں غائب تھے؟''
''میں امریکہ میں ہوتا ہوں۔''
''ارے کب؟ تم نے کچھ بتایا ہی نہیں۔''
''میں نے تمہیں جان کر فون نہیں کیا تھا۔'' وہ بہت آہستگی سے بولا تھا۔

''آٹھ ماہ پہلے میں یہاں آیا ہوں۔ ٹیکساس میں ہوتا ہوں۔ یہاں کے بینک سے اچھی آفر تھی۔ سو چلا آیا۔ پرسوں ہی پاکستان پہنچا ہوں۔''

''آنٹی انکل کیسے ہیں؟''

''ٹھیک ہیں ماں کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ بہت یاد کرتی تھیں سو مجھے اُن کے لیے آنا پڑا۔'' اریبہ نے تمہارے دوسرے بیٹے کے بارے میں بتایا تھا۔ بہت مبارک ہو۔''

''شکریہ۔''

''آج کل کیا ہو رہا ہے؟'' پھر ماہین نے اُسے تفصیل سے اپنے بارے میں سب بتا دیا۔

اچانک کاشان احمد کا فون آ جانے سے اُسے گونا گوخوشی بھی ملی تھی۔ اس کے بچپن کا دوست کاشان احمد اب بھی اس کا بہترین دوست تھا۔ ماہین سے روحانی محبت کرنے والا جس نے ماہی سے دل کی گہرائیوں سے محبت کی تھی۔ اُس کا عشق ہر قسم کے طمع سے بھرا تھا، پاک تھا۔ عقیدتوں سے ہمکنار ہوتا متبرک تھا۔ وہ اس کا سچا قدردان تھا۔ اُس کی حب (محبت) میں سچائی تھی۔ اپنی اس پاکیزہ محبت کے بابت وہ خود نہیں جانتا تھا۔

☆.........☆.........☆

مولوی صاحب اور بے بے جی بھی ہفتے میں دوبار ملک مصطفیٰ علی کو دیکھنے جاتے تھے۔ وہ دونوں فکر مند تھے۔ اُن کی بیٹی کا مستقبل خطرے میں تھا۔ مصطفیٰ علی کوما سے باہر نہ لوٹے تو کیا ہوگا؟

مہر النساء بیگم ہر ہر آہٹ پر چونک جاتیں۔ انہیں لگتا اچانک سے وہ لمحے آئیں گے جب اُن کے مصطفیٰ علی ہوش میں آ جائیں گے۔ انشاء اللہ میری آنکھیں ضرور دیکھیں گی جب میرا مصطفیٰ علی اس بھیانک نیند سے جاگے گا۔

مہر النساء کی صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی۔ ماہین اُن کے لیے فکر مند تھی۔ اس دن وہ ملک مصطفیٰ علی سے ملنے آئیں تو ماہین کے کہنے پر عرفان انہیں زبردستی ڈاکٹر زید یونس کے پاس لے گئے۔ تفصیلی چیک اپ کے بعد ڈاکٹر زید یونس نے اُن کے چند ٹیسٹ کرائے۔ رپورٹس آ چکی تھیں جو ٹھیک تھیں۔ ماں جی کو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ عمر کا تقاضا تھا جو اُن کے جوائنٹ میں شدید درد رہتا تھا۔ ملک مصطفیٰ علی کا انہوں نے بہت اثر لیا تھا۔ یہی وجہ تھی اُن کے دن بدن نڈھال ہونے کی۔

سیماں ماہین کو بتا رہی تھی کہ چھوٹی ملکانی جی، آپ کی برادری میں چھوٹے ملک جی کے متعلق طرح طرح کی باتیں بن رہی ہیں۔ میرے منہ میں خاک مجھے میرا گھر والا بتا رہا تھا۔ ملک اظفر خان کہیں بیٹھ کر بات مشہور کر رہا تھا کہ ملک مصطفیٰ علی اب بچ نہیں سکتے۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔'' سیماں ڈرتے ڈرتے بولی تھی۔ ماہین کے چہرے پر تناؤ بڑھا۔

''خاک جائے اُن سب کے منہ میں۔ آخر اظفر چاچو خود کو سمجھتے کیا ہیں۔ (اظفر ماہین کے دور کے رشتے دار تھے) یہ کوئی نہ سمجھے کہ ہم عورتیں تنہا ہیں اور جس کا جو دل چاہے ملک قاسم علی کے بچوں کے بارے میں بولتا رہے۔ میں دیکھ لوں گی ان سب کو۔'' ماہین بہت غصے میں تھی۔ وہ ہمیشہ سے دھیمے لہجے میں بات کرنے والی لڑکی تھی۔ لیکن اس وقت سیخ پا ہو رہی تھی۔ وہ کبھی بھی ذاتی باتوں پر نوکروں کے سامنے

یوں بلند آواز میں نہیں بولی تھی۔

''سیماں تم نے بہت اچھا کیا مجھے بتا کر۔''

''چھوٹی ملکانی جی ہم نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ میرے وڈیرے بھی آپ ملکوں کا نمک کھاتے ہوئے مر کھپ گئے۔'' مہر النساء اِدھر ہی آ رہی تھیں۔ وہ خاموش ہو گئیں۔ فضا پر یک بارگی سناٹا آن ٹھہرا ماحول کی سانسیں رُک سی گئی تھیں۔

''کیا بات ہے ماہین پتر۔'' اس کا لال بھبوکا چہرہ اور تیز تنفس دیکھ کر وہ فکر مند ہو گئیں۔ گریز پا ساعتوں کی تحیر زدگی میں گم ہوتے ہوئے۔ ماہین نے پھوپی ماں کی طرف دیکھا۔

''سیماں حسان اور حازم کو دیکھو وہ سو رہے ہیں۔ اور گل پری سے کہو اچھی سی چائے بنا کر لائے۔''

گل پری کو مہر النساء بیگم جہان آباد سے لائی تھیں۔ کیونکہ چھنو جا چکی تھی۔

گل پری یہاں آ کر بہت خوش تھی، حسان سے اُس کی خوب دوستی تھی۔

''ماہین پتر کیا بات ہے؟ کچھ تو بولو۔'' جیسے اُداسی کی نبض سے فوراً ہاتھ اٹھا لیا گیا۔

''پھوپی ماں وہ جو آپ کی تیسری پیڑھی کے چچیارے ملک الماس کے بہنوئی ملک اظفر خان ہیں۔ وہ مصطفیٰ بھائی کے متعلق اُوٹ پٹانگ باتیں پھیلا رہے ہیں۔ انہیں تو اچھی طرح سمجھاؤں گی کہ آئندہ کبھی بھول کر بھی ملک قاسم علی کے گھرانے کے بارے میں کوئی بات نہیں کریں گے۔ بلکہ اپنی سات پشتوں کو بھی سمجھا بجھا کر جائیں گے۔''

مہر النساء بیگم نے حیرانگی سے ماہین کو دیکھا۔ یہ چھوٹی سی نازک اندام لڑکی اتنی بہادر کب سے ہو گئی۔ ایسا اعتماد کہاں سے آیا اس میں۔ انہوں نے مسکرا کر ماہین کی طرف دیکھا۔ جس کو رب عظیم اُس پروردگار نے کیسی ہمت عطا فرما دی تھی۔ ملک عمار علی جاتے جاتے ماہین کو کس قدر بہادر بنا گئے تھے۔ اب وہ حفاظت کرنا جانتی تھی۔ ملک عمار علی کی تابناک وابستگی ماہین عمار کو مضبوط بنا گئی تھی۔ جس کا ادارک ماں جی کو آج ہوا تھا۔ اب انہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔

اچانک ماہین کو خیال آیا کئی دنوں سے بارہ دری کی صفائی نہیں کرائی۔ وہ عموماً بند رہتی تھی۔ یہاں کے مکین ہی کتنے تھے۔ کل سیماں سے کہہ کر صفائی کرواؤں گی۔ اُسے خنکی کا احساس ہوا۔ حویلی کے اندرونی گیٹ کی طرف سکیورٹی گارڈ کندھے پر کلاشنکوف لٹکائے ڈرائیو وے تک آتا پھر گیٹ کی طرف بڑھ جاتا۔

''مزید ایک اور گارڈ ہونا چاہیے۔ کل حیدر سے کہوں گی یہی کے کسی مزارعے کو یہ فرائض دے دیے جائیں۔'' خنکی بڑھ رہی تھی۔ وہ اندر آ گئی۔ تمام دروازے اُس نے چیک کیے حالانکہ یہ کام گل پری کے سپرد تھا۔ لیکن ماہین کی تسلی نہیں ہوتی تھی۔ ایک ایک دروازہ کھڑکی وہ خود چیک کرتی۔ ملک عمار علی کے جانے کے بعد اور پھر ملک مصطفیٰ علی کے کومہ میں جانے کے بعد وہ کس قدر ذمے دار اور سیانی ہو گئی تھی۔

ماہین اپنی خواب گاہ میں آ گئی۔ گل پری یہاں بھی فل پلازمہ اسکرین پر نگاہیں جمائے ہمہ تن گوش تھی کیونکہ آواز اس نے بے حد آہستہ کر رکھی تھی۔ ماہین مسکرائی۔

''بچے سو رہے ہیں؟''

''جی چھوٹی ملکانی۔''

''تم بھی جا کر سو جاؤ۔''

گل پری سونے کے لیے چل دی تھی۔

وہ پاس رکھے کاؤچ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اب اُسے بات کرنی تھی اظفر خان سے اور اُسے اُس کی نانی بھی یاد کرا دینی تھی۔

شام کو اُس نے انی بھائی سے کہہ کر ملک اظفر خان کا نمبر لے لیا تھا۔ بیل جا رہی تھی۔ چند بیل کے بعد فون اٹھا لیا گیا تھا۔

''السلام علیکم جی۔''

''وعلیکم السلام۔''

''آپ اظفر چاچا ہیں؟''

''ملک اظفر خان بات کر رہا ہوں۔''

''میں ماہین عمار علی ہوں۔''

''ہاں ماہین پُتر کیسی ہو؟ کیا حال ہے؟ بچے کیسے ہیں؟ برخوردار مصطفیٰ علی کی طبیعت کیسی ہے؟ بچے فکر نہ کرنا انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ ایک ہی سانس میں بولتے چلے گئے۔

''اظفر چاچا سانس تو لے لیں یہ نہ وہ کہ سانس ہی گھٹ کر گم ہو جائے۔'' زچ کر دینے والا طنز تھا ماہین کے لہجے میں۔

''اچھا اچھا۔'' وہ گلا کھنکارتے کھی کھی کر کے خجل ہو کر ہنسے۔

''پہلے تو آپ کو یہ بتاؤں ملک مصطفیٰ علی ہر اعتبار سے تندرست ہیں۔ ڈاکٹرز بھرپور یقین اور اُمید رکھتے ہیں اُن کی وقتی نیند کا دورانیہ مختصر ترین ہے۔''

''پتر اللہ کرے ایسا ہی ہو۔''

''چاچا جی انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا۔'' ماہین کے لہجے میں امرت گھلی شدید قسم کی کاٹ تھی۔ جو اُس کے ہر ہر لفظ سے عیاں ہو رہی تھی۔

''چاچا جی سنا ہے آج کل آپ کو بڑی خبریں مل رہی ہیں؟''

''میں سمجھا نہیں۔'' لہجے میں حیرانی تھی۔

''آپ کے گردسی آئی ڈی کے کافی نمائندے پھیلے ہوئے ہیں ناں؟''

''ہوا کیا ہے کھل کر بات کرو ماہین پُتر۔''

''چاچا جی آپ نے شادی کی کسی تقریب میں بیٹھ کر کہا ہے ناں۔ مصطفیٰ اب کبھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ اب وہ نہ زندوں میں ہے نہ مُردوں میں۔ کیا ڈاکٹرز کی آپ کے ساتھ کانفرنس میٹنگ ہوئی ہے؟''

''ماہین پتر! میں تمہارا بزرگ ہوں۔''

(عشق کی راہداریوں میں، زندگی کی سچ بیانیوں کی چشم کشائی کرتے اس خوبصورت ناول کی آخری قسط، انشاءاللہ آئندہ ماہ اکتوبر میں ملاحظہ کیجیے)

خالدہ حسین
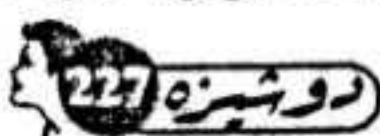
آخری وسِل

''کیا نمبر ہے جناب' آپ کی سیٹ کا؟'' اب کے سفید وردی پوش عینک ناک پر ٹکائے آیا۔ ''میاں' نمبر وُمبر تو کچھ نہیں۔'' ''اچھا تو چانس پر سیٹ لیجیے گا' مل جائے گی۔ یہ جو رش آپ کو نظر آرہا ہے' مسافروں کا نہیں ہے۔ مسافر ایک ہے تو چار......

ذخیرہ ادب سے ایک یادگار تحریر

اسٹیشن پر اس قدر ہجوم کہ گویا تمام دنیا ہی مسافر ہو گئی۔ عجب معاملہ ہے' اسپتالوں میں جاؤ تو جیسے تمام خلقِ خدا آزار میں گھری ہے۔ چھڑی ٹیکتا وہ ایک ایک سیڑھی چڑھتا اور پھر اترتا گیا۔ آنے جانے والے اندھا دھند اپنی اپنی آشفتگیوں کے اسیر اس سے ٹکراتے' اسے دھکیلتے' بڑھتے چلے گئے۔ اس درجہ تیز رفتار تھے سب کے سب۔ گرم گرم سانسوں کی بھاپ اس کے چاروں طرف اڑتی چلی گئی۔ وہ مزے سے دھکوں کے اس ریلے میں بہنے لگا۔ عجلت میں نہ ہونا بھی کتنا نیا احساس تھا چنانچہ آج اس کو شانوں پر دھرا اپنا سر بڑا ہلکا محسوس ہوا جیسے لکڑی کا ہلکا پھلکا ٹوٹا' بے کار فراموش کردہ تختہ مزے سے ہولے ہولے ہلکورے کھاتا پانی پر بہتا چلا جائے' بہتا چلا جائے اور کوئی بھی اس کو روکنے' پکڑنے' دیکھنے اور دیکھ کر پہچاننے اور پہچان کر پرانے خاک زدہ اسٹور میں رکھنے کی کوشش نہ کرے' یہاں تک کہ وہ شیطان' فتنہ سیرت بچے بھی اس کے پیچھے نہ بھاگیں۔ واہ یہ آزادی یوں جسم کا بوجھ ختم کر دیتی ہے کہ انسان ہواؤں میں پرزہ پرزہ کاغذوں کے ساتھ اڑتا پھرتا ہے۔

''سامان نہیں ہے جی......؟'' وہ سرخ پگڑی والا قلی نامعلوم کہاں سے اس کی تاک میں تھا۔ اس نے چھڑی کی لوہے دار نوک زمین میں گاڑنی چاہی مگر شاید اس کی گرفت ہی ایسی ڈھیلی تھی یا پھر وہ پلیٹ فارم ہی ایسا سخت لوہے کے سے پتھر کا تھا کہ چھڑی بھی فرش پر تیرتی رہی۔ واہ!

''میاں' سامان نہیں ہے۔'' وہ یہ جواب دے کر خود بھی حیران ہوا۔ ہاں' حیرت ہے' یوں بھی کوئی سفر کرتا ہے؟ اگر کوئی نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بھی نہ کرے۔ یہ بات آج ہی اچانک بجلی کے کوندے کی طرح اس کی سمجھ میں آئی تھی۔ سفر بغیر ارادہ اور تیاری کے بھی ہو سکتا ہے۔ آزادی کا یہ احساس کہ انسان اٹھے اور اٹھ کر چل دے اور سیدھا اسٹیشن پہنچ کر جس ریل میں چاہے' سوار ہو جائے اور جہاں جی چاہے' اتر جائے چنانچہ اس لہر کے ساتھ ہی وہ جاگی جاگی نیند سے ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا اور روانہ ہو گیا۔ صد شکر کہ اس جلتی جلاتی دوپہر میں کوئی بھی اس کو نہ دیکھ پایا ورنہ وضاحتیں' معذرتیں بہت تھکا دینے

والا سلسلہ ہیں اور تھکن کا سیاہ سایہ یوں اس کے پیچھے لگا تھا کہ کسی پل جدا ہی نہ ہوتا تھا۔
یہ تھکن بھی عجیب تھی۔ یہ نہیں کہ وہ تھکن کا عادی نہ تھا' اس کا تو اس سے ازل کا ناتا تھا۔ ٹینس کورٹ پر تھکن کا سرور تو اور تھا اور فیلڈ میں میلوں میل پیدل چل کر سروے کرنے میں جسم کا ٹوٹنا بھی اور رنگ رکھتا تھا۔ ان تکانوں میں ایک نشہ تھا۔ گہرا' جسم کو آسودگی بخشنے والا۔ وہ مہربان نیند کی مانند تھکن کہ ایک دم بخار کی طرح چڑھ کے جسم کو آسودگی بخشتی تھی۔ گہری' ٹھنڈی' میٹھی آسودگی! مگر یہ تھکن؟ اس میں ہڈیاں گداز کرنے والی ایک بے بسی تھی۔ یہ تھکن ایک آسیب کی طرح منہ کھولے بڑھتی چلی آئی تھی۔ ایک سپردگی چاہتی تھی' اندھی سپردگی تو بڑے حوصلے کی بات ہے۔ چنانچہ جب تک انسان کے اندر سکت ہے' وہ اس سپردگی کے آسیب سے بچتا ہے' بھاگتا ہے کہ سپردگی اپنے آپ کی نفی کرنے کو کہتی ہے اور اپنا آپ تو اپنے آپ سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں' کبھی کسی کی خاطر' کبھی کسی انتہائی جاں گداز لمحے میں ایک ثانیے کے لیے یوں ہوسکتا ہے مگر اس کے اتنے برسوں کی زندگی میں کبھی یوں نہ ہوا تھا اور ہوش و حواس کا حصار تو شروع ہی سے اس کا ایسا مضبوط تھا کہ کیا کہا جائے۔ تو اب یہ ہڈیاں گداز کرنے والی ایک تھکن تھی کہ مکمل' اٹل' لا انتہا سپردگی کا تقاضا کرتی تھی اور اپنے سیاہ پر پھیلائے اس کے سر پر سایہ سایہ منڈلاتی تھی جہاں وہ جاتا تھا' جہاں وہ ہوتا تھا اور وہاں بھی' جہاں وہ نہ ہوتا تھا۔ پس اس لیے اس نے شکر کیا کہ اس جلتی جلاتی دھوپ بھری دوپہر میں کسی نے اس کو یوں نکلتے نہ دیکھا اور وہ طویل معذرتوں اور وضاحتوں کے چکر سے بچ نکلا۔ اپنی اس چالاکی پر وہ دل ہی دل میں ہنس دیا۔

''کون سے ڈبے میں جایئے گا آپ؟'' قلی ابھی تک اس کے ساتھ ساتھ تھا۔

''میاں' وہ جو سامنے ریل کار ہے' بس اسی میں چلا جاؤں گا۔'' اس نے ذرا اپنی رفتار تیز کرنا چاہی مگر قدم تھے کہ زمین پر ٹکتے ہی نہ تھے' بس تیرتے چلے جاتے تھے۔ اس کے نہ چاہنے پر بھی قلی نے ڈبے کی اونچی سیڑھی اسے سہارا دے کر چڑھائی۔ چھوٹا سا تنگ راستہ گزرنے کے بعد اسے اندر کی ٹھنڈک بہت بھلی لگی۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ اللہ' اللہ' حد ہے! گویا تمام دنیا ہی مسافر ہوگئی ہے۔ شروع سے آخر تک

تمام سیٹیں رکی ہوئی تھیں۔
''کیا نمبر ہے جناب' آپ کی سیٹ کا؟'' اب کے سفید وردی پوش عینک ناک پر ٹکائے آیا۔
''میاں' نمبر ومبر تو کچھ نہیں۔''
''اچھا تو چانس پر سیٹ لیجیے گا' مل جائے گی۔ یہ جو رش آپ کو نظر آ رہا ہے' مسافروں کا نہیں ہے۔ مسافر ایک ہے تو چار اس کو رخصت کرنے والے ہیں۔ آپ یہاں تشریف رکھیں' فی الحال۔'' وردی پوش نے ہاتھ میں پکڑے کاغذ پر پنسل کی نوک پھیرنی شروع کی۔
وہ قریب کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ واہ! عجب طرح کی نشست تھی کہ نیچے ہی نیچے دھنستی جا رہی تھی۔ ''جی' سیٹ نمبر ۱۳ کا سامان ہے۔ ابھی تک یہ صاحب تشریف نہیں لائے' بس ابھی ٹکٹ بن جائے گا' آپ اطمینان رکھیں۔''
اس نے آہستہ سے سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا۔ کیسے الگ الگ سے چہرے تھے' اتنے بہت سے' ایک سے ایک نہ ملتا تھا۔ ان چہروں کی کثرت پر وہ ایک دم سے حیران رہ گیا۔ ہر ایک چہرہ ایک ایک جسم کے ساتھ کیا اطمینان سے چپکا ہوا تھا' شانوں پر دھرا ہوا تھا' مطمئن! اور ہر ہر چہرے میں دو دو جھروکے تھے کہ جن کے رستے باہر کی تمام کی تمام کائنات اندر آتی جاتی تھی' رچتی بستی تھی۔ ان کھڑکیوں کو بند کر دو تو پھر؟ پھر بھی یہ بند کہاں ہوتی ہیں۔ راستے اسی طرح کھلے رہتے ہیں اور دنیا جہان کا شور ہنگامہ' سیال' وارداتیں بھی چلی جاتی ہیں' اندر باہر' اندر باہر۔ ''جی کیا کہا؟ یہ کھڑکیاں کھلتی نہیں جناب! کھل جائیں تو سب کی سب ٹھنڈک غارت ہو جائے۔'' برابر کی سیٹ پر سے آواز آئی۔
اس نے ذرا گھوم کر دیکھا' بہت سے چہروں میں سے اک چہرہ کہ مطمئن تھا' اپنے جسم کے شانوں پر دھرا ہوا تھا۔ ''ہاں' یہ بھی عجیب معاملہ ہے' ٹھنڈک زندہ رکھنا چاہو تو کھڑکیاں' دروازے بند کر دو' کبھی نہ کھولو۔''
''مگر میرے محترم' یہ ریل تو ایئر کنڈیشنڈ ہے' اس کے شیشے دیوار کی مانند جامد ہیں' کھلتے نہیں۔'' ساتھ والے نے ذرا مسکرا کے کہا۔ ''ہاں میاں' ٹھیک کہتے ہو' مجھے کون سا ہر اسٹیشن سے پکوڑے خریدنا ہیں۔''
''ہاہاہا واہ صاحب' واہ......'' ساتھ والا ہنس دیا۔
''میں تو بس یہ کہہ رہا تھا کہ یہ سب ان کھڑکیوں' دروازوں' شگافوں ہی کا چکر نہ ہو۔ اب یہ دیکھو کہ ہر چہرے نے اپنے حسابوں کی ایک کائنات بنا رکھی ہے۔ اس طرح ہر چہرے کی ایک کائنات ہے نا' تو اتنی بہت سی دنیا میں ان گنت' بے حساب' انفنیٹی (infinity) تک۔ تو میاں' کیوں نہ اس چکر ہی سے چھٹکارہ پائیں یعنی کہ کیا معلوم تم کیا دیکھتے ہو اور میں کیا دیکھتا ہوں تو آؤ' اپنے دیکھنے سے باہر آ جائیں اور تب دیکھیں کہ کیا دِکھتا ہے۔ واہ' حد ہے کہ ایک چہرہ جل بجھا تو ساری کائنات' ان گنت دنیائیں ہی جل بجھیں یا پھر یوں کہ جب بہت ہی تھک جاؤ' بری طرح اور ایک اندھی تھکن کا سایہ تمہارے سر منڈلائے تو بس سپرد ہو جاؤ جناب' پھر یہ تمام شور و غوغا' فتنہ و فساد' انفنیٹی سب ختم۔ سنو بھیا' یہ سب کچھ خود ہی بناتے بگاڑتے ہو؟ لاحول ولا! بڑے شعبدہ باز ہو تم' سمجھے؟''
''السلام علیکم! جناب' معاف کیجیے گا' سو رہے تھے آپ؟ ہاں' ذرا تکلیف تو ہوگی' مجھے یہ اٹیچی کیس رکھنا ہے۔'' ایک شخص نے شانہ ہلایا۔ ''ہاں' ہاں......'' اس نے ٹانگیں سمیٹ لیں۔ واہ' اتنا سامان؟ ایک اٹیچی کیس کہہ کے اس نے سوٹ کیس' ہولڈال' ٹوکریاں' بنڈل اور نہ جانے کیا کچھ رکھنا شروع کر دیا۔ ''بہت تیاری کے ساتھ سفر ہو رہا ہے۔ اللہ' اللہ' اتنا سامان؟'' آخر اس سے رہا نہ گیا۔
''وہ جی' بس کیا کیا جائے' چھوٹے چھوٹے بچے ہیں' ایک ایک چیز بھی لو تو یہ ڈھیر سامان اٹھانا پڑتا ہے۔ وہ میری سیٹ دائیں ہاتھ کو ہے۔'' وہ اپنی سیٹ کی طرف مڑ گیا۔
گاڑی چلتی جا رہی تھی۔ اس نے سیٹ کی پشت کے ساتھ سر ٹکا دیا۔ اس کا ساتھی مزے سے سو رہا تھا' خوب گونج دار خراٹوں کے ساتھ۔ اچانک وہ ہڑبڑا کر اٹھ گیا'

گلا صاف کیا اور کہا۔ ''تو جناب، میں نے آپ کو پہلے کہیں دیکھا ہے۔ تعارف نہیں کرائیے گا؟ مجھے کہتے ہیں......''

اس نے کچھ نام بتایا۔ اب اس اچانک حملے پر وہ کچھ پریشان ہوا۔ ''ہاں میاں، کبھی دیکھے بھالے ہی ہوتے ہیں۔''

''نہیں جی، یوں تو بات نہیں بنتی نا، شاید اب سے کچھ عرصہ پہلے کہیں اخباروں میں آپ سے ملتی جلتی تصویریں...... میں اتنی دیر سے یہی سوچ رہا تھا۔''

اب اسے بھی سب کچھ یاد آ گیا اور تھکن کے ساتھ ساتھ اب کے پیاس کی ایک لہر اس کے گلے کے گرد لپٹ گئی۔ یہاں کہیں پانی وانی کا انتظام بھی تو ہو گا۔ اس کو گھنٹی کا بٹن یاد آیا مگر ہاتھ بڑھا کر گھنٹی دبانا ایک ہی محال تھا۔ یہاں ایک دوسرے کا جاننا نہ جاننا برابر ہے۔ دراصل وقت کی یادداشت بہت ہی کم ہے، انتہائی کم بلکہ ناقص۔ اب خود مجھ کو ہی یاد نہ تھا مگر یہ بھی اچھا ہی ہے۔ دراصل انسان کی یادداشت بھی کیا کمال کی کتر بیونت کرتی ہے۔

''بھئی آج یہ جھٹکے بہت دے رہی ہے گاڑی۔ کیا بات ہے؟ یہ ہیمرنگ اچھی نہیں یار، پچھلی دفعہ یوں ہی ہوا کہ بھئی، اماں تھیں میرے ساتھ۔ گاڑی تمام رستہ یوں گیند کی طرح اچھلتی گئی اور پلکوں پر تو خاص طور پر۔ اماں تو بس پڑھتی ہی گئیں......'' اس کے ساتھ والے نے اگلی سیٹ والے سے کہا۔ ''ہاں یار، پہلے تو ہوائی جہاز ہی میں ایسی ٹینشن ہوتی تھی، اب کم بخت یہ سواری بھی ایسی ہو گئی کہ زمین کے ساتھ ہی نہیں لگتی۔''

''یہ زمین ہی دھکے مارتی ہے میرے دوست! بہت تھکی ہوئی ہے، صدیوں سے کچھ کم بوجھ ہے اس کی چھاتی پر۔''

''میاں، یہاں کہیں ٹھنڈا پانی ملے گا؟'' اس نے برابر والے سے کہا۔ ''ذرا یہ بٹن تو دبایئے گا۔'' اور اس نے اپنی جیب ٹٹولنی شروع کی۔

''جناب، رہنے دیجیے، اب پانی بھی مول کا ملے گا کیا؟'' اس نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ ''عجیب بات ہے۔'' بہت زیادہ سامان والے نے گھوم کر کہا۔

''ہاں، تعجب کی بات ہے، شروع سے دیکھ رہا ہوں، یہ ساتھ والی بھی سے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ انتہا ہے اتنا فاصلہ ہو تو دو گاڑیاں برابر ساتھ ساتھ نہیں چلتیں۔''

''ہاں بھئی، یہ پٹریوں کا بھی کچھ نہ پوچھو، ایک تو باہر گھپ اندھیرا ہے، بس یہ ساتھ والی کی کھڑکیوں کی روشنی سے پتا چلتا ہے۔ یہ تو یوں ہے گویا مخبر ساتھ ساتھ دوڑا چلا جاتا ہو۔''

''جناب، پانی۔'' بیرے نے گلاس آگے بڑھایا۔

اس نے چونک کر گلاس پکڑا، ہونٹوں سے لگایا۔ عجیب طرح کا پانی تھا، بالکل خشک۔ اس نے بھڑکتی پیاس کے ساتھ گلاس واپس کر دیا۔

''بھئی، شرط لگا لو۔'' چند سیٹیں ادھر دو شخص آپس میں الجھ رہے تھے۔ اچانک ہی کسی اجنبی احساس نے اسے آ دبوچا۔ اس نے ادھر اُدھر نظر دوڑائی، سب اپنی اپنی سیٹوں پر براجمان تھے۔ کوئی کھڑا نہ تھا تو پھر واقعی وہ سیٹ نمبر ۱۳ والا نہیں پہنچا تو اب تو مل گئی سیٹ۔ اس نے ذرا اطمینان سے بیٹھنا چاہا۔

سامنے پرلے سرے پر ایک دوسرا وردی پوش ایک ایک کے پاس رکتا، شاید ٹکٹ چیک کر رہا تھا۔

''ہاں بھئی، تو شرط ہو جائے پھر؟ یار، عجیب گھپلا ہے۔ اے بھائی صاحب، ذرا توجہ کیجیے گا۔'' الجھنے والوں میں سے ایک نے وردی پوش کو پکارا۔ ''حاضر ہوا جناب......!'' اب وردی پوش اس سے کچھ سیٹیں پرے تھا۔

اس نے بٹوا ٹٹولا پھر اس نے دوسری جیب دیکھی اور پھر تیسری، چوتھی، ایک تو یہ لباس ہی بے کار ہے۔ اب جس میں اتنی ڈھیر ساری جیبیں ہوں، بھلا یاد کیسے رہے کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہے اور پھر انسان کی یادداشت بھی کیا کتر بیونت کرتی ہے۔ ارے واہ، اب اس کو کھڑا ہونا پڑا۔ بیک پاکٹ بھی خالی تھی۔ وہ کچھ تھوڑا سا پریشان ہوا تو پھر کیا گھر پر ہی رہ گیا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ پھر اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ بلا ارادہ سفر تو ایسا ہی ہوتا ہے، اٹھے اور اٹھ کر چل دیئے۔ خیر، اس نے

سوچا' گھڑی اور انگوٹھی تو ہے ہی مگر ہاتھ پر نظر پڑی تو خالی۔ آہم...... اس نے ذرا گلا صاف کیا اور پھر حیران ہوا کہ اس جیسا ہوش وحواس کا پکا' جہاں دیدہ' بین الاقوامی شخصیت رکھنے والا ایسے چکر میں پھنس گیا۔ یہ اس نے ساتھ والے کو نہیں بتانا چاہا تھا کہ وہ بین الاقوامی شہرت کا مالک ایک ...... مگر لاحول ولا' اگر ضرورت پڑی تو اس وردی پوش کو ضرور بتانا پڑے گا اور اسٹیج' فلم اور ادب کے بہت سے نام یاد آئے جو کہ میدان چھوڑ کر ایک بار گئے تو لوٹنے پر انہیں کسی نے نہ پہچانا اور وہ ایروں غیروں کو بتاتے پھرے کہ صاحب' میں فلاں ہوں فلاں...... اور پر امید نظروں سے بس ایرے غیروں کی آنکھیں ہی ٹٹولتے رہے اور وہاں خالی آنکھوں میں انہیں اپنا آپ بھیک منگا نظر آیا کہ جوں عمر کی حدیں پھلانگتی' ترلے مارتی ہیروئنیں...... لاحول ولا۔ یہ میں کس چکر میں پھنس گیا؟ وردی پوش ان دونوں الجھتے شخصوں کی سیٹ تک پہنچ چکا تھا۔

''جی!'' وردی پوش نے ان کے ٹکٹ دیکھتے ہوئے کہا۔

''صاحب' یہ تو سراسر' میرا مطلب ہے یعنی یہ تو......''

''جناب' بات کیا ہے؟'' وردی پوش نے کہا۔

''یعنی آپ نہیں جانتے؟ آپ سب جانتے ہیں۔'' دونوں میں سے ایک نے کہا۔

''آپ جانتے ہیں کہ ہماری گاڑی نہیں چل رہی ہے' کھڑی ہے' جامد ہے۔ دراصل ساتھ والی گاڑی چل رہی ہے اور ہم سمجھ رہے ہیں' ہماری گاڑی چل رہی ہے۔''

''جناب' ایسی بات نہیں' ذرا صبر......''

''خاک صبر' دوپہر سے گھپ رات ہوگئی۔'' اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ ''چلو' یہ تو اچھا ہی ہوا' جب گاڑی چلتی ہی نہیں تو سیٹ اور ٹکٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' وہ چھڑی کا سہارا لے کر اٹھا اور دروازے کی جانب چلا۔

''جناب! کہاں جایئے گا چلتی گاڑی سے؟''

''چلتی گاڑی......؟ میاں' وہ صاحب کہہ رہے ہیں کہ نہیں چل رہی' وہ تو دوسری ہے ساتھ والی جو چل رہی ہے۔ ہم تو کھڑے ہیں۔''

''بیٹھیے تو سہی جناب' تشریف رکھیے اور آپ کا ٹکٹ؟''

وہ ایک دم اپنی نشست میں گرا۔ ماتھے پر اسے ٹھنڈک سی محسوس ہوئی۔ رومال سے ماتھا پونچھا تو رومال تر بہ تر۔ وہ جو پہلے وردی پوش تھے' وہ کہہ رہے تھے کہ چانس سیٹ ہے' ٹکٹ بن جائے گا۔

''جی ہاں' ہے تو چانس سیٹ ہی' لیجیے! آپ کا ٹکٹ بنائے دیتے ہیں۔''

اس کا ہاتھ خالی جیب پر رک گیا۔ ''اچھا' تو یہ بات ہے۔'' وردی پوش نے ناک پر سے عینک اتاری۔ ''میں بھی کہوں' یہ چلتی ٹرین میں سے کہاں جاتے ہیں؟''

''نہیں میاں' تم غلط سمجھے ہو' دراصل میں بے ارادہ ہی...... وہ سب کا سب گھر میں میز پر دھرا رہ گیا۔ انسان کی یادداشت بھی کیا ناقص ہے اور پھر تم نے شاید مجھے پہچانا نہیں؟'' اس نے وردی پوش کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا اور سکتے میں آ گیا۔ وہاں آنکھوں کے شیشوں میں' ایک دوسرا چہرہ' بالکل اجنبی' چپکا ہوا تھا۔

وردی پوش نے ہاتھ بڑھا کر دیوار میں لگے سرخ ہینڈل کو نیچے گرا دیا۔ ایک شدید جھٹکے سے جیسے سب کچھ رک گیا۔

اس نے اپنے ہلکے پھلکے ٹوٹے پھوٹے تختہ سر کو رواں پانیوں میں ہلکورے کھاتے دیکھا۔

''ارے بھائی' یہ جنگل ویرانے میں کہاں رک گئے؟''

وردی پوش نے اس کو ہاتھ میں چھڑی پکڑائی اور سہارا دے کر اٹھایا اور دھیرے دھیرے اس کو دروازے سے باہر لے آیا' گھپ اندھیرے میں۔

گاڑی کی سیٹی کہ ایک سسکی تھی' اٹھی پھر ڈوب گئی۔ پاؤں تھے کہ میلوں گہری ریت میں دھنستے جاتے تھے اور کانٹوں بھری پیاس تھی کہ ایک زنجیر بنی اس کے گلے کے گرد لپٹتی جاتی تھی۔

☆☆......☆☆

دوشیزہ گلستان

اسماء اعوان

نعت رسول ﷺ

خدا نے میری دل جوئی کا کچھ ایسا سبب رکھا
نبیؐ کی یاد میں دل کو ہمیشہ مضطرب رکھا
خدا کا عشق اور اس کے نبیؐ کا عشق مل جائے
فقط اس کے سوا ہم نے کوئی احساس کب رکھا
خدا اپنی جگہ پر ہے نبیؐ اپنی جگہ پر ہیں
ادب سے جب جسے لکھا تو پھر پاسِ ادب رکھا
ان ہی کے در سے پا کر ان کے آگے پیش کرتا ہوں
میری نعتوں کا گلدستہ بھی ہے حسب طلب رکھا

شاعر: محسن علوی

عظیم ہستیوں کی سنہری باتیں

1) کشادہ دلی اور شیریں زبانی سے آدمی جنت حاصل کرسکتا ہے (حضرت محمد ﷺ)۔

2) کسی کے منہ پر تعریف کرنا، اسے قتل کر دینے کے مترادف ہے۔ (حضرت علیؓ)۔

3) ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا خود ایک جرم ہے۔ (حضرت امام حسینؓ)۔

4) کسی نیکی کو معمولی خیال نہ کرو وہی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا باعث ہوسکتی ہے۔ (امام جعفر صادقؒ)

5) اگر خود برا ہے لیکن دوسروں کی برائی نہیں کرتا تو یہ بھی نیکی ہے۔ (خواجہ نظام الدین اولیاؒ)۔

مرسلہ: معصومہ رضا۔ کراچی

تجارت

جب بھی تم کو اپنے رزق میں کمی نظر آنے لگے تو کچھ مال اللہ کی راہ میں دے کر اللہ کے ساتھ تجارت کرلیا کرو۔ (حضرت عمر فاروقؓ)

مرسلہ: شعبان کھوسہ۔ کوئٹہ

خوبصورت جواب

حضرت علیؓ کے پاس ایک عیسائی اور ایک یہودی آئے اور آپ کو لاجواب کرنے کے لیے دو سوال کیے۔

1) یہ بتائیں وہ کون سی چیز ہے جو ہم دیکھتے ہیں لیکن اللہ نہیں دیکھتا۔

2) آپ کہتے ہیں قرآن میں ہر چیز کا علم ہے وہ کیا ہے جو قرآن میں نہیں لکھا۔

حضرت علیؓ مسکرائے اور آپ نے کہا۔ اللہ خواب نہیں دیکھتا کیونکہ اُسے نیند نہیں آتی ہے اور دوسرے سوال کا جواب ہے کہ قرآن میں سب سچ لکھا ہے جھوٹ نہیں لکھا۔

مرسلہ: نگہت غفار۔ کراچی

غزل

جب واسطہ نہیں ہے ہمیں تیرے نام سے
بیٹھے ہیں انتظار میں پھر کیوں شام سے
سازشیں کرتے ہیں جب میرے خلاف وہ
گر جاتے ہیں احباب تو اپنے مقام سے

بے لطف زندگی تھی جن کی میرے بغیر
کیوں پھر گئے ہیں آج دعا و سلام سے
میں سوچتی ہوں آج اکیلے میں بیٹھ کر
اُس نے فریب کیوں دیا اُلفت کے نام سے
منسوب جن کا چین میرے دم سے تھا کبھی
اُن کو قرار مل گیا کسی اور نام سے
دیکھا تھا اُس نے مجھ کو ستونوں کی آڑ سے
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے اہتمام سے
ایسا نہیں ہے ہم سے ملتے نہ ہوں کبھی
آتے ہیں ہم سے ملنے مگر اپنے کام سے
نیلم پری کا ذکر بھی ہوتا ہے بار بار
ہم اُن کو یاد کرتے ہیں اہتمام سے
دل کی تسلی کے لیے شگفتہ لکھے غزل
شہرت سے واسطہ نہ ہم کو نام سے
شاعرہ: شگفتہ شفیق، پسند: صبوحی کاظمی۔ کراچی

جاہل

شوہر بیوی کو چار دن سے انگریزی سکھا رہا تھا۔
بیوی (دوپہر میں) ڈنر لے لوجی۔
شوہر: جاہل یہ ڈنر نہیں لنچ ہے۔
بیوی: جاہل ہوگے تم۔ یہ رات کا بچا ہوا کھانا ہے۔
مرسلہ: ریحانہ مجاہد۔ کراچی

منتر

کوئی ٹونا کوئی منتر
کوئی تعویذ ہوا ایسا
کہ جس کو گھول کر پی لیں
تو پھر وہ میرا ہو جائے
فقط دو بوند نہ برسے
نہ ہلکی بونداباندی ہو
وہ طوفاں کی طرح آئے
جھڑی ہو جیسے ساون کی
گھٹا بن کے برس جائے
میں اس کے روٹھ جانے پر
مناؤں تو وہ من جائے
ہو میری ہر خوشی میں خوش
وہ میرے بن نہ رہ پائے
کوئی ٹونا کوئی منتر
کوئی تعویذ ہوا ایسا
کہ جس کو گھول کر پی لے
تو پھر وہ میرا ہو جائے
پسند: ماہین خاور۔ سیالکوٹ

زندگی کے رنگ

1) زندگی کا اپنا ہی رنگ ہوتا ہے۔ دکھ والی رات سویا نہیں جاتا اور خوشی والی رات سونے نہیں دیتی۔

2) اچھی زندگی گزارنی ہے تو اس کے دو طریقے ہیں۔ جو پسند ہے اُسے حاصل کرلو یا جو حاصل ہے اُسے پسند کرلو۔ زندگی بہت اچھی اور پُرسکون گزرے گی۔

مرسلہ: افشاں رضا۔ اسلام آباد

انتظار

بیوی نے اپنے شوہر سے پوچھا۔ "تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو۔"
شوہر نے جواب دیا: میں ساری دنیا سے زیادہ تم سے پیار کرتا ہوں۔
بیوی (اٹھلا کر) اگر میں مرگئی تو میرے لیے تاج محل بنواؤ گے۔
شوہر محبت سے: ارے پگلی میں نے تو پلاٹ بھی خرید لیا ہے۔ بس اب تمہاری طرف سے انتظار ہے۔

مرسلہ: اخلاق احمد۔ کوئٹہ

شوہر کا گلہ

دنیا کی سب سے Best ماں تو

ہر بیٹے کے پاس ہوتی ہے
لیکن پتا نہیں
دنیا کی بیسٹ بیوی
دوسروں کے پاس ہی کیوں ہوتی ہے۔
مرسلہ: شاہانہ احمد۔ کراچی

خوبصورت کہاوت

چھوٹی سوچ اور پاؤں میں موچ انسان کو کبھی آگے نہیں بڑھنے دیتی
مرسلہ: نسیم شفیق۔ اسلام آباد

ہم سے پوچھیے

اک پل میں اک صدی کا مزہ ہم سے پوچھیے
دو دن کی زندگی کا مزہ ہم سے پوچھیے
بھولے ہیں رفتہ رفتہ انہیں مدتوں میں ہم
قسطوں میں خودکشی کا مزہ ہم سے پوچھیے
وہ جان گئے ہیں ہمیں ان سے پیار ہے
آنکھوں کی مخبری کا مزہ ہم سے پوچھیے
شاعر: خمار بارہ بنکوی، پسند: خولہ عرفان

ٹوتھ برش

انگریز ڈاکٹر نے پوچھا کہ ایک ٹوتھ برش کتنے عرصے میں ریٹائرڈ ہو جاتا ہے۔
چائنیز نے جواب دیا۔ 2 دن میں۔ امریکی بولا ایک ماہ میں۔ برطانوی نے کہا ڈیڑھ ماہ میں، پاکستانی بڑے فکر سے بولا۔" ہمارے یہاں ٹوتھ برش کبھی ریٹائرڈ نہیں ہوتا۔
انگریز ڈاکٹر نے حیرت سے پوچھا۔" وہ کیسے۔"
پاکستانی: پہلے ٹوتھ برش دانت صاف کرنے کے کام آتا ہے۔ اس کے بعد بال کو رنگنے کے کام آتا ہے اور پھر آخر میں یہ ازار بند ڈالنے کے کام آ جاتا ہے۔
مرسلہ: وقار قیوم۔ سکھر

برجستگی

ایک جرنیل سے پوچھا گیا آپ کسی دہشت گرد کو معاف کر سکتے ہیں۔
جرنیل نے متانت سے جواب دیا۔" معاف کرنا یا نہ کرنا اللہ کا کام ہے۔ میں تو بس اس دہشت گرد کی اللہ سے ملاقات کروا سکتا ہوں۔
مرسلہ: انزا نقوی۔ کراچی

نہیں

محبت کس ہے اور کس دکھلایا نہیں جاتا
یہ اپنا آپ ہے دنیا کو سمجھایا نہیں جاتا
بہت سی وحشتیں ہیں جو ادھورے خواب بنتی ہیں
کسی کو نامکمل خواب بتلایا نہیں جاتا
کسی دن شام سے پہلے اتر آئے گا آنکھوں میں
وہ اک منظر جسے ہر روز دہرایا نہیں جاتا
تمہاری دسترس میں ہوں کبھی ہیرا سمجھتے ہو
مگر اے جانِ جاں ہیرے کو پگھلایا نہیں جاتا
شاعر: شکیل اختر۔ پسند: ندیا مسعود۔ کراچی

تم کیا جانو

لوگ کہتے ہیں کسی ایک کے چلے جانے سے زندگی نہیں رک جاتی
لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ لاکھوں کے مل جانے سے بھی اس ایک کی کمی پوری نہیں ہوتی۔
مرسلہ: سائرہ خورشید۔ سیالکوٹ

اطمینان

ایک سردار جی کو اپنی بیٹی کے کمرے سے ایک دن سگریٹ ملی تو بہت پریشان ہوئے۔ دوسرے دن شراب کی بوتل ملی تو مزید پریشان ہو گئے۔ اس سے اگلے دن لڑکی کے کمرے سے ایک نوجوان برآمد ہوا تو سردار جی اطمینان سے بولے شکر ہے یہ سب اس لڑکے کا تھا۔
مرسلہ: ندیم عباس ڈھکو۔ ساہیوال

ماں

میں نے اپنی ماں کے کندھے پر سر رکھ کر ان سے پوچھا: کب تک اپنے کندھے پر سر رکھنے دو گی۔

ماں مسکرائی اور کہا۔

جب تک لوگ مجھے اپنے کاندھوں پر نہ اٹھالیں۔

مرسلہ: افشاں پری۔ حویلیاں

نئی پود

دادا: ایک زمانہ تھا میری جیب میں صرف 2 روپے ہوتے تھے اور میں اسٹور سے دودھ دہی گھی، دالیں، سبزی لے آتا تھا۔

پوتا بولا۔ اب یہ حرکتیں نہیں چل سکتیں کیونکہ اب دکانوں پر کیمرے لگے ہوئے ہیں۔

مرسلہ: ریاض حسین تبسم چوہان۔ فیصل آباد

جو میرا تمہارا رشتہ ہے

میں کیا لکھوں کہ جو میرا تمہارا رشتہ ہے
وہ عاشقی کی زبان میں کہیں بھی درج نہیں
لکھا گیا ہے بہت لطفِ وصل و دردِ فراق
مگر یہ کیفیت اپنی رقم نہیں ہے کہیں
یہ اپنا عشق ہم آغوش جس میں ہجر و وصال
یہ اپنا درد کہ ہے کب سے ہمدم ماہ و سال
اس عشقِ خاص کو ہر ایک سے چھپائے ہوئے
گزر گیا ہے زمانہ گلے لگائے ہوئے

شاعر: فیض احمد فیض۔

پسند رضوانہ کوثر۔ لاہور

مشق

دوست: تم نے گانے کی مشق کرنا کیوں چھوڑ دی۔

دوسرا دوست: اپنے گلے کی وجہ سے۔

دوست: کیوں، کیا ہوا تمہارے گلے کو؟

دوسرا دوست: پڑوسیوں نے اس کو دبانے کی دھمکی دی تھی۔

مرسلہ: احسن رضا۔ اسلام آباد

عورت

آپ عورت کے ساتھ کتنی بھی عقل و دانش کی بات کر لیں، کیسے بھی دلائل کیوں نہ دیں۔ اگر اس کی مرضی نہیں ہے تو وہ اس کی منطق کو کبھی نہیں سمجھے گی۔ اس کے ذہن کے اندر اپنی منطق کا ایک ڈرائنگ روم ہوتا ہے جسے اس نے اپنی مرضی سے سجایا ہوا ہوتا۔ اور وہ اُسے روشن کرنے کے لیے باہر کی روشنی کی محتاج نہیں ہوتی۔ اس نے جو فیصلہ کر لیا ہوتا ہے وہی اس مسئلے کا واحد اور آخری حل ہوتا ہے۔

انتخاب: فاطمہ سلیم۔ کراچی

لکیر پار

ایک سردار نے کار سے پہلوان کو ٹکر مار دی۔ پہلوان نے غصے سے سردا کو کار سے نکالا اور کار سے دس میٹر دور کھڑا کر کے روڈ پر ایک لائن کھینچ دی اور کہا۔ اگر لائن سے ذرا بھی ادھر آگے آئے تو جان سے ماردوں گا۔

پھر ڈنڈے سے سردار کی گاڑی توڑنے لگا۔ جب کار کا کافی نقصان کر دیا تو پیچھے مڑ کر دیکھا اور حیران رہ گیا۔ سردار زور زور سے ہنس رہا تھا۔

''آخر تم کیوں ہنس رہے ہو؟'' پہلوان نے حیران ہو کر پوچھا۔ جب تم گاڑی توڑ رہے تھے تو میں نے پانچ دفعہ لکیر پار کی تھی۔

سردار نے ہنستے ہوئے پہلوان کو جواب دیا۔

مرسلہ: یاسمین اقبال۔ سنگھ پورہ لاہور

نئے لہجے نئی آوازیں

مجھے تم یاد آتے ہو

مجھے تم یاد آتے ہو
نئے موسم کی آہٹ پہ
صدائیں دے کوئی بھی رنگ
مجھے سارے تمہارے رنگ
تمہارے ساتھ بیتے پل
محبت کی سبھی قسمیں
وفا کی بھی سبھی رسمیں
جو تم سے کی تھیں وہ باتیں
مجھے سب یاد آتی ہیں
مرے ہمدم، مرے ساتھی
مجھے تم یاد آتے ہو

شاعر: بلال خان۔کراچی

ایک وار

میرا دل تو، کانچ سے بھی نازک تھا
اسی لیے تو
اس کے تیز لہجے کے تیروں سے
اس کی شعلہ اگلتی آنکھوں سے
اس کی سرد مہری کے، ایک ہی وار سے
ایک ہی آن میں، ریزہ ریزہ ہوگیا

شاعرہ: فصیحہ آصف خان۔ملتان

آئیں گے

بہت حساب کھلتے ہیں تمہاری طرف اپنے
یہ سارے حساب اک دن تم سے چکانے آئیں گے
کچھ زخم دیے تم نے، کچھ دیے وقت نے گھاؤ
روز حساب یہ سب تمہیں دکھانے آئیں گے

ابھی تو غم دوراں سے ہی فرصت نہیں جاناں
کبھی فرصت ملی تو تم کو منانے آئیں گے
اپنے ہر غم کو دل میں چھپا لو صائمہ
چہرے بدل بدل کے لوگ ستانے آئیں گے

شاعرہ: صائمہ شبیر۔سرگودھا

گر کوئی اپنا ہوتا

زندگی کتنی حسین ہوتی گر کوئی اپنا ہوتا
جو پیار سے کہتا تم کیسی ہو!
شب و روز کیسے گزرتے ہیں
یہ آنکھیں کیوں بھیگ جاتی ہیں......
تنہائی میں کس کی غزلیں اور گیت گنگناتی ہو
کیا خوشی میں تم بھی چراغاں کرتی ہو
کوئی پیار سے پوچھے
عید تم نے کیسے منائی
خالی ہاتھوں پر مہندی کیوں نہ سجائی
نہیں کوئی اپنا نہیں پوچھنے والا
آس پاس ایک ہی آواز کی گونج ہے
تم نے اپنا کام ختم کرلیا
کام وقت پر ختم ہونا چاہیے

شاعرہ: روبینہ شاہین۔کراچی

غزل

مڑ مڑ کے دیکھنے کی عادت نہیں گئی
دل سے کبھی بھی تیری ضرورت نہیں گئی
نظروں سے سارے حسن کے مناظر ہٹادیے
دل سے مگر حسین سی صورت نہیں گئی
بخشا تو بہت کچھ ہے بن مانگے خدا نے
لیکن تجھے پا لینے کی چاہت نہیں گئی

دنیا کے دکھاوے کو ہم چپ تو ہیں فرح
لیکن مزاج کی وہ بغاوت نہیں گئی
دنیا میں اور لوگ بہت معتبر سہی
لیکن ترے لیے وہ عقیدت نہیں گئی
شاعرہ: فرح علی۔ کراچی

تم کیا جانو!

بے صلہ تو ضرور تھے، بے سبب تو نہیں تھے۔
تیری یاد میں کاٹے، جو ہم نے رت جگے
تم کیا جانو!......
ہر ایک میں شامل تھا، خون دل کا
شب انتظار میں
جو جلائے تھے
ہم نے دیے
شاعر: شاہد فراز۔ حیدر آباد

مجبوری

بہت معصوم تھے سب کی طرح
وہ عہد طفلی میں
مچلتے تھے، وبلکتے تھے، دریچوں پہ لٹکتے تھے
کہ ہم آغوش ہو جائیں، کسی کے دوست ہو جائیں
میں ان کو پیار کرتی اور انہیں یہ بات سمجھاتی
ہر اِک کے پاس مت جاؤ، کسی کو دوست نہ پاؤ
وگرنہ بے نیازی اور خوشی بے چین کر دے گی
متاعِ قیمتی ہو تم میری کوئی نہیں جانے
بہت کی ضد مگر یوں ہی کی ان کی پرورش میں نے
اب کچھ دن سے تغیر آیا ہے ان کے رویوں میں
وہ مجھ سے ضد نہیں کرتے
میں نم آنکھوں سے اک ٹک دیکھتی ہوں، مسکراتی ہوں
کہ دکھ اندر کے اب میرے بہت مجبور ہو گئے ہیں
شاعرہ: خولہ عرفان۔ کراچی

غزل

میں گیا وقت نہیں ہو کہ جو آ بھی نہ سکے
میرا اندازِ محبت وہ بھلا بھی نہ سکے
وہ جو شیشے کے بنے گھر میں رہا کرتے ہیں
سنگریزوں سے وہ گھر اپنا بچا بھی نہ سکے
تیری بے نام سی چاہت پہ فدا ہو جاؤں
کوئی بھی عشق کے درجے پہ یوں آ بھی نہ سکے
زخم کھا کر بھی کیے فیصلے حق میں ان کے
ہر کوئی پاسِ وفا ایسے نبھا بھی نہ سکے
مل گیا تم کو تو شاہوں کا مقدر انزا
کوئی بھی بڑھ کے مقدر سے تو پا بھی نہ سکے
شاعرہ: انزا النقوی۔ کراچی

چار اشعار

جب نئے زخم پرانے ہوں گے
وہ کوئی اور زمانے ہوں گے
یوں اندھیرے ہیں جہاں میں جیسے
کچھ نئے دیپ جلانے ہوں گے
کون ہے جو غم ہمارے بانٹے
غم تو تنہاء ہی اٹھانے ہوں گے
پھول مہکیں گے دریچے میں جمال
کتنے موسم وہ سہانے ہوں گے
شاعر: سمیع جمال۔ کراچی

خواہش

ہم اگر مٹ بھی گئے یاد رکھو
آسماں تک تجھے پکاریں گے
اور اتنا تجھے ہاں بتلادیں
ترے دل میں ہاں امر ہوں گے ہم
شاعر: ریاض حسین تبسم چوہان۔ فیصل آباد

سوال آپ کے..... جواب زین العابدین کے!!

اِس ماہ عینی، حاصل پور کا سوال انعام کا حق دار ٹھہرا۔ انہیں اعزازی طور پر دوشیزہ گفٹ ہیمپر روانہ کیا جا رہا ہے (ادارہ)

صوفیہ۔ پڈعیدن

☺: زین بھیا! اگر آئیڈیل چکنا چور ہو جائے تو کیا کیا جائے؟

✎: یہ تو بعد کی بات ہے ویسے یہ 'آئیڈیل' ہوتا کیسا ہے اور ہوتا کیا ہے؟

کیتھرین۔ سیالکوٹ

☺: زین بھیا! یہ بتائیں کہ بیوی اپنی عمر اور میاں اپنی تنخواہ چھپاتے ہیں۔ لیکن بچے کیا چھپاتے ہیں؟

✎: ان دونوں کے جھوٹ۔

فرزانہ شاہ۔ ٹنڈو آدم

☺: زین بھیا! کسی نے کہا محبت روگ ہوتی ہے، کسی نے کہا محبت سوگ ہوتی ہے۔ کسی نے کہا محبت شام ہوتی ہے، کسی نے کہا محبت رات ہوتی ہے! آپ کیا کہتے ہیں اس بارے میں؟

✎: پتا نہیں آپ 'کسی' کی باتوں میں کیسے آگئیں۔ بہر حال میں کسی کی باتوں میں نہیں آتا ہوں۔

جمیلہ۔ ساہیوال

☺: زین جی! دیکھیں پیڑ پہ طوطا مینا سے کچھ کہتا ہے؟

✎: طوطے سے دوبارہ کہلواؤ میں ذرا اُسے ٹیپ کرلوں پھر سن کر جواب دوں گا۔

شرمیلا انور۔ جہانیاں

☺: لوگوں کو اپنی اوقات کب یاد آتی ہے بھیا؟

✎: جب گھڑی دیکھتے ہیں۔

صبیحہ بابر۔ ملتان

☺: تم اتنا جو مسکرا رہے ہو کیا غم ہے جس کو چھپا رہے ہو؟

✎: آپ کو پتا چل گیا۔

شاہین۔ میانوالی

☺: زین بھائی تاجر بھی خون چوستا ہے اور مچھر بھی، تاجر موٹا ہو جاتا ہے مچھر موٹا کیوں نہیں ہوتا؟

✎: مچھر صرف اپنا پیٹ بھرتا ہے جبکہ تاجر ناجائز خون چوستا ہے۔

حورین۔ سوہاوہ

☺: بھیا پاؤں کی لغزش اور زبان کی لغزش میں کیا فرق ہے؟

✎: زبان کی لغزش دوسروں پر اثر انداز ہوتی ہے جبکہ پاؤں کی لغزش سے خود نقصان ہوتا ہے۔

پھول۔ کراچی

☺: بعض لوگ دھوکا دے کر مسکراتے ہیں بعض دھوکا کھا کر بتایئے جیت کس کی ہوتی ہے؟

✎: ظاہری بات دھوکا کھا کر مسکرانے والے کی کم از کم ہماری نظروں میں۔

صابرہ سلطانہ۔ مرید کے

☺: زین بھیا! یہاں تو بہت گرمی ہے۔ کراچی کا موسم کیسا ہے؟

✎: تو ہم جیسے برسات کا مزہ لوٹ رہے ہیں۔

نائلہ۔ گوجرنوالہ

☺: زین بھیا! سنا ہے عشق دماغ کا خلل ہے کیا واقعی؟

✎: صرف سنا ہے یا......؟

ایم وکیل عامر جٹ۔ ساہیوال

☺: کہتے ہیں کہ چاند دن میں بھی نکلتا ہے کبھی کبھی، کیا واقعی؟

✎: ہاں! کھڑکی کا چاند نکل آتا ہے، دن میں۔

فصیحہ مغل۔ نذیر آباد

☺: سنا ہے بچے اور بوڑھے میں کوئی فرق نہیں ہوتا، بتایئے پھر بوڑھے ''چوسنی'' کیوں استعمال نہیں کرتے؟

✎: وہ بتیسی استعمال کرتے ہیں۔

فاخرہ علی۔ جھنگ

☺: گاڑیاں آپس میں ٹکرائیں تو ٹوٹ جاتی ہیں دو دل ٹکرائیں تو......؟

✎: وہ مل جاتے ہیں۔

عائشہ۔ پھول نگر

☺: جب میں آنکھیں بند کروں تو کچھ دکھائی نہیں دیتا، پانی پیتی ہوں تو منہ گیلا ہو جاتا ہے، بہت پریشان ہوں؟

✎: آنکھیں کھول کر پانی پیا کریں۔

رومانہ۔ پشاور

☺: آج کل انسان کے لیے سب سے قیمتی چیز کیا ہے؟

✎: امن......امان۔

ثمینہ فرحان۔ ڈیرہ غازی خان

☺: لیلیٰ کالی تھی مگر اُس نے خود کو گورا کرنے کے لیے کوئی بھی کریم استعمال نہیں کی؟

✎: مگر آج کی لیلیٰ کو ہر حال میں استعمال کرنی پڑے گی۔

ھمینہ علی۔ سرگودھا

☺: یہ دل چپ چاپ کیوں جلتا ہے؟

✎: بعض اوقات دھوم دھڑکے سے بھی جلتا ہے۔

عینی۔ حاصل پور

☺: بھیا! نفرت کے بیج تو جا بجا بکھرے پڑے ہیں، محبت کے بیج کہاں سے دستیاب ہیں؟

✎: محبت کے بیج ہم اپنے من میں چھپائے بیٹھے ہیں۔

صالحہ رشید۔ حیدر آباد

☺: ہماری محبتیں نفرتوں میں کیوں تبدیل ہو چکی ہیں، بتائیں تو سہی؟

✎: یہ وقتی سانحے تھے ورنہ ہم سب ایک دوسرے سے دلی محبت کرتے ہیں۔

ثمر۔ شہداد کوٹ

☺: زین بھائی! اگر کھیتوں سے سبزیاں اور چاول پکے ہوئے اگنے لگیں تو؟

✎: ملک سے ایندھن کی کمی دور ہو جائے گی۔

بدر حمید۔ عارف والا

☺: بھیا! اچھے لوگوں کی پہچان کیسے ممکن ہے؟

✎: قرض دے کر واپس نہ مانگیں۔

خالدہ۔ شکر گڑھ

☺: یہ زندگی محبت کے لیے بہت تھوڑی ہے پھر لوگ نفرتوں کے لیے وقت کیسے نکال لیتے ہیں؟

✎: اوور ٹائم کر کے۔

ناصرہ۔ گوجرنوالہ

☺: کون سی عینک لگا کر لوگ دوسروں کے چہرے پڑھ لیتے ہیں؟

✎: چہرہ شناسی ایک مشکل فن ہے، اس فن کے ماہر ذہین ترین لوگ ہی ہوتے ہیں۔

فرحانہ۔ تلمبہ

☺: کیا محبت کو ٹھکرانا گھر آئی دولت کو ٹھکرانے کے مترادف نہیں؟

✎: ہاں! دولت مند محبت کے بارے میں آپ کا خیال خاصا درست ہے۔

☆☆......☆☆

پڑوسی نہ ہوتے تو...

ایک اور پڑوسی کو جب معلوم ہوا کہ دوسروں کو کھلانے پلانے اور لینے دینے کا ثواب کتنا ہے تو اسی دن سے وہ حق پڑوسی ادا کرنے کو ہمیں ثواب کما کر دینے پر تل گئے۔ ان کے ملازم غریب نے ہمارے گھر کی ڈھول لے ڈالی۔ کبھی لہسن، کبھی پیاز، کبھی......

پڑوسیوں کی خصوصیات بیان کرتا وہ رنگ جو لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دے گا

میں حال ہی میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ دنیا میں رونق عورت سے ہے نہ چمن زاروں سے بلکہ صرف پڑوسی کے دم سے ہے۔ پڑوسی بھی اللہ میاں کی کیا نعمت ہیں کہ آپ کے ہر غم اور خوشی میں شریک ہیں یہ اور بات ہے کہ خوشی کے موقع پر غم اور غم کے موقع پر خوشی کا اظہار غیر شعوری طور پر کرتے ہیں۔ ایسی باتوں سے ان کی نیک نیتی اور جذبہ پڑوسیت پر حرف نہیں آتا۔ ہمارے ایک پڑوسی تھے کہ گھر سے گھر ملا ہوا تھا۔ بڑے خلوص کے آدمی تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ہم میاں بیوی کو موسیقی سے شغف ہے تو انہوں نے ایک گدھا پال لیا جو تڑ کے نسیم سحری کے ساتھ بھیرویں کا آغاز کر کے اور گرمی کی جھلسی لمبی دوپہروں میں مالکونس الاپ کر مدتوں ہمیں محفوظ کرتا رہا۔ یہ گدھا ہندوستان کی سرحد سے پکڑ کر لایا گیا تھا اور ہمیں یقین ہے کہ اس میں کسی بڑے گوتے کی روح حلول کر گئی تھی۔ ایک دن ہم نے پڑوسیوں کو کھانے پر مدعو کیا اور گدھے کو ساتھ لانے پر اصرار کیا۔ ایک اردو فلم کی کہانی پر عمل کرتے ہوئے ہم نے گدھے کی ڈش میں سندور ملا کر دے دیا۔ اس کے بعد...... اس کے بعد یہ ہوا کہ وہ حضرات پہلے صرف خیال سے شوق فرماتے تھے، اب دھرپد بھی الاپنے لگے۔

ایک اور پڑوسی کو جب معلوم ہوا کہ دوسروں کو کھلانے پلانے اور لینے دینے کا ثواب کتنا ہے تو اسی دن سے وہ حق پڑوسی ادا کرنے کو ہمیں ثواب کما کر دینے پر تل گئے۔ ان کے ملازم غریب نے ہمارے گھر کی ڈھول لے ڈالی۔ کبھی لہسن، کبھی پیاز، کبھی ہلدی، کبھی گھی، یعنی ان کی کوئی ہانڈی ہمارے تعاون کے بغیر نہ پکتی۔ کہ کسی وقت کے کھانے پر ہم ثواب سے محروم نہ رہیں۔ اسی ثواب دارین کی تھیوری کے تحت وہ راتوں کو ہمارے گھر کے نلکوں میں ربر کا پائپ لگا کر اپنے لان میں پانی دیتے رہے۔ ہم نے کبھی کانوں کان انہیں خبر نہ ہونے دی کہ ان کے اس ثواب سے بے جا پہنچانے سے ہمارے گھر کی ٹینکی

میں پانی نہیں چڑھتا اور ہم گرمیوں کی صبح بولائے ہوئے نہانے کے لیے جاتے ہیں اور صرف لوٹا بھر پانی سے ڈرائی کلین کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

بعض چیزیں خرچ ہو جاتی ہیں مگر بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو صرف استعمال ہوتی ہیں جیسے تھرما میٹر، فاؤنٹین پین اور قینچی وغیرہ۔ وہ چیزیں پڑوسی ہماری یادگار کے طور پر رکھ لیتے ہیں۔ جانتے تھے دنیا سرائے اور سفر کا نام ہے۔ آج اکٹھے ہیں کل ہم کہاں وہ کہاں۔

بعض چیزیں استعمال کے بعد واپس آ جاتی تھیں۔ مثلاً کپڑے سینے اور قیمہ نکالنے کی مشین مگر ان کی کوئی گارنٹی نہیں ہوتی اور ہو بھی کیسے سکتی ہے۔ پل بھر میں انسان چٹ پٹ ہو جاتا ہے۔ یہ تو صرف استعمال کی چیزیں ہیں۔ یادش بخیر مدتوں یہ دستور رہا کہ ان کے بچے روز ہمارے بچوں کے وکٹ، گیند، بلا، ریکٹ اور چڑیاں مانگ کر لے جاتے ہیں اور بلاناغہ لوٹا دیتے۔ چڑیوں میں تو خیر دم ہی کتنا ہوتا ہے۔ گیندیں بھی اکثر کھو جاتی تھیں مگر کھیل میں تو یونہی ہوا کرتا ہے۔

ایک پڑوسی تھے۔ احاطے سے احاطہ ملا ہوا اور گیراج سے گیراج۔ جب بھی باہر ملتے، کہتے ''ہم ایک دن آپ کے ہاں آئے تھے۔ آپ باہر گئے ہوئے تھے۔، ہم گیراج خالی دیکھ کر لوٹ گئے۔ ایک دن ان کا گیراج خالی دیکھ کر ہم واقعی ان کے ہاں گئے۔ گھنٹی بجائی، ملازم کو اپنے آنے سے آگاہ کیا اور واپس چلے آئے۔ اس کے بعد سے انہوں نے ہمارے ہاں آنا چھوڑ دیا۔

ایک اور پڑوسی تھے۔ یوں کبھی نہ آتے مگر جب کبھی ہمارے ہاں کچھ چہل پہل دیکھتے، معصوم سی شکل بنائے آتے اور دروازے کے باہر کھڑے ہو کر بار بار کہتے ''کہیں پارٹی وارٹی تو نہیں؟ بہت لوگ ہیں۔ نہیں ضرور کوئی بات ہے۔ باہر بھی بہت گاڑیاں کھڑی ہیں۔ بھئی میں چلا۔ پھر کبھی سہی'' آخر انہیں ہاتھ پکڑ کر اندر لانا پڑتا'' تب وہ اس بے تکلفی سے آبیٹھتے جیسے باقاعدہ بلائے گئے ہوں۔

ایک اور پڑوسی ملے۔ ایک لحاظ سے تو ان کا پڑوس بہت اچھا تھا کہ ان کا ہم سے اور ہمارا ان سے کوئی واسطہ نہ تھا مگر ایک بات ان میں یہ تھی کہ ایک سے ایک جگادری اور چھنٹی ہوئی گالی دیتے تھے اور ہمیشہ باآواز بلند۔ ان کی بیگم اور بچوں کو بھی یہی شوق تھا۔ ایسے میں کوئی ان کے تین چار سالہ بچے کو چھیڑ دیتا تو وہ من بھر کی گالی توتلی زبان میں دیتا۔ سارے گھر والے مہمانوں سمیت کھلکھلا کر ہنس دیتے اور ہم اپنے مہمانوں کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔

اب پڑوس کی باتیں نکلی ہیں تو چند باتیں تفصیل سے ہو جائیں۔ آپ نے ضرور محسوس کیا ہوگا کہ بعض عادتیں پڑوسیوں میں مشترک ہوتی ہیں یعنی ہر جگہ کے پڑوسی یہی حرکت کرتے ہیں ان میں سے ایک عادت ہے ٹرانزسٹر پر گانے سننے کی۔ دنیا کا شاید ہی کوئی پڑوسی ہو جو یہ شوق نہ رکھتا ہو۔ آپ اردو ایم اے کی تیاری کر رہے ہیں اور اردو رباعی کی عہد بہ عہد ترقی کو اپنے ذہن میں بٹھا رہے ہیں۔ ایک تو یوں ہی آپ کو موضوع اور اس کی ترقی سے کوئی لگاؤ نہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ پڑوسی آکاش وانی جالندھر لگائے بیٹھے ہیں۔ اب آپ کے ذہن میں رباعی کی ترقی یوں مرتسم ہو رہی ہے۔

''سکینہ نے بعض شعراء کے حالات میں لکھا ہے کہ بجن جی جھوٹ مت بولو۔ خدا کے پاس جانا ہے......

اور بعض شعراء نے رباعی کے وزن پر غزلیں بھی کہی ہیں۔ مثلاً ارے مار ڈالا دہائی دہائی۔''

ایک بات اور بھی طے ہے کہ پڑوسیوں کے بچے ہمیشہ زیادہ ہوتے ہیں۔ شاید انہیں ''چھوٹا کنبہ بڑی خوشحالی'' کے بڑے بڑے بورڈ دکھائی نہیں دیتے یا یہ بورڈ ہماری بدقسمتی سے اس وقت لگائے گئے جب انگریزی محاورے کے مطابق بہت دیر ہو چکی تھی۔''

بچے ہونا کوئی عیب کی بات نہیں، بشرطیکہ وہ اپنے گھر میں ہوں اور اپنے گھر میں ہی رہیں۔ مگر عموماً جملے کی صرف پہلی شرط پوری ہوتی ہے۔ یعنی وہ ہوتے تو اپنے گھر یا اسپتال میں ہیں مگر بعد ازاں رہتے ہمارے گھر میں۔ ہمارے گھر کا ڈرائنگ روم انہیں زیادہ آرام دہ معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے بچوں کے کھلونے زیادہ جاذبِ نظر اور ہماری کتابوں کی جلدیں زیادہ نرم اور آسانی سے نکل جانے والی دکھائی دیتی ہیں۔

کہیں آپ کو یہ شبہ تو نہیں کہ بچوں کو ان کے گھر سے سکھا کر بھیجا جاتا ہے۔ کہ وہ پڑوسی کے گھر رہیں۔ میں یہ بات ماننے کو تیار نہیں، چلیے انسانی بچوں کو تو مار پیٹ کر سکھلا بھی دیں مگر مرغی کے بچوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟۔

یہ بات اب پورے طور پر پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ مرغیاں اور ان کے بچے ہمیشہ اپنے گھر کے بجائے پڑوس کے گھر رہتے ہیں۔ اسی لیے آپ نے دیکھا ہوگا۔ کہ پڑوسی بلا کسی تردد کے مرغیاں پال لیتے ہیں تاکہ وہ آپ کے مالی کی حرام خوری کا بدل ثابت ہو سکیں اور دن رات آپ کے باغ کی کیاریوں میں 'گوڈی' کرتی رہیں۔

ابھی تک ہم نے صرف چند پڑوسیوں کی باتیں رقم کی ہیں۔ اگر تحقیق کر کے دنیا بھر کے پڑوسیوں کی باتیں تحریر کی جائیں تو انسائیکلو پیڈیا، کی کئی جلدیں تیار ہو جائیں۔ پڑوسیوں پر لکھنے کا ارادہ تو ایک عرصے تھا مگر آج ایک تازہ چرکا یہ لگا کہ آج تک ہم پڑوس کو دو چار گھروں پر مشتمل سمجھتے آرہے تھے۔ اور آج کسی صاحب نے فرمایا کہ پڑوس میں شمار ہوتے ہیں چالیس گھر ادھر۔ ظاہر ہے چالیس گھر آگے اور پیچھے کے بھی ہوں گے۔ اسی طرح تقریباً ساری چھاؤنی پڑوس کے زمرے میں آجاتی ہے جو ہمیں کسی طرح منظور نہیں۔

خدا کرے کہ یہ سطریں ہمارے کسی پڑوسی کی نظر سے نہ گزریں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے پڑوس پر ایک مضمون لکھ ماریں اور ہم کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں۔

☆☆......☆☆

ڈی ۔ خان

دیکھ مگر پیار سے!

جوں جوں لولی وڈ کی پروڈکشن بڑھتی جا رہی ہے، اسی اعتبار سے تقاریب میں بھی تیزی دیکھی جا

رہی ہے! جلد ریلیز ہونے والی پاکستانی فلموں یلغار، اور دیکھ مگر پیار سے، کے ٹریلر کی تقاریب پچھلے دنوں منعقد کی گئیں! یلغار کے ٹریلر نے سوشل میڈیا پر دھوم مچا رکھی ہے، اس کی کاسٹ میں شان، ثنا بچہ، ایوب کھوسہ، ہمایوں سعید، اور عدنان صدیقی نمایاں ہیں! ٹریلر آؤٹ ہونے کے دو دن کے اندر اندر اسے لاکھوں لوگوں نے دیکھا اور لائیک کیا! ڈائریکٹر اسد الحق کی دیکھ مگر پیار سے، کی تقریب مقامی ہوٹل میں رکھی گئی۔ اس فلم میں حمائمہ ملک کے مقابل میڈم نور جہاں کے پوتے سکندر رضوی نے ہیرو کا رول نبھایا ہے۔

عمران عباس، جانثار

گذشتہ ماہ پاکستان کے ہارٹ تھروب عمران عباس کی سیکنڈ بولی وڈ مووی جانثار، کی شاندار میوزک لاونچنگ ہوئی! اس تقریب میں ڈائریکٹر مظفر علی، پروڈیوسر میرا علی، فلم کی نئی ہیروئن پرنیا قریشی اور پاکستان کے نامور سنگر شفقت علی خان بھی موجود تھے۔ اس خاص فلم کے میوزک ایونٹ کو خاص نام شام اودھ دیا گیا تھا! چونکہ جانثار کی اسٹوری لائن تقسیم ہند سے قبل کی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک لڑکی قریشی

انگلینڈ سے آنے والے پرنس عمران عباس کی محبت

میں گرفتار ہو جاتی ہے! فلم کا میوزک بولی وڈ کے ساتھ پاکستانی بینڈ بھی ہے اور اس گانے شریا گھوشل، سکھ ویندر سنگھ، مالنی اوستھی، عابدہ پروین اور شفقت علی نے گائے ہیں، شفقت میوزک لانچ اٹینڈ کرنے خاص طور پر پاکستان سے بھارت آئے تھے۔

شائستہ کا ستارہ

مارننگ شو کے حوالے سے مشہور شائستہ لودھی نے ماہ صیام میں ساؤتھ افریقہ کے بزنس مین عدنان سے

شادی رچالی جو ان کے کزن ہیں۔ پچھلے برس جیو پر ایک متنازع پروگرام کے بعد شائستہ، بیرون ملک چلی گئی تھیں اور اس سے قبل اپنے شوہر سے خلع لے چکی تھیں۔ ماہ رمضان سے پہلے وہ، دبئی میں کئی ماہ تک رہنے کے بعد کراچی آئیں اور اپنے گھر والوں کی رضا مندی سے ساؤتھ افریقا میں رہنے والے کزن عدنان سے یہاں نکاح کیا! خاص بات یہ تھی کہ شوبز انڈسٹری سے کوئی شخصیت اس تقریب میں موجود نہ تھی۔

بشریٰ انصاری کی ویب سائٹ

بشریٰ انصاری نے دھڑا دھڑ فلمیں شروع کر دی ہیں! ہومن جہاں! اور جوانی پھر نہیں آنی، تیزی سے بن رہی ہیں جبکہ کچھ اور فلموں میں بشریٰ جی کی کاسٹنگ طے پا گئی ہے! بشریٰ جی کی بیٹی نے ان کے لیے ایک ویب سائٹ ڈیزائن کی ہے جس پر وزٹ کرنے کا مشورہ، ہر ملنے والے کو دیا جا رہا ہے، اس ویب سائٹ میں بشریٰ جی کی اچیومنٹس کو باوقار انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ہاف گرل فرینڈ

موہیت سوری نے چیتن بھگت کے ناول ہاف گرل فرینڈ پر فلم بنانے کا فیصلہ کرتے ہوئے لیڈ رول کے لیے وُرون ڈھون کو کنسیڈر کیا تھا اور بات تقریباً بن گئی تھی لیکن سوری کی جون ریلیز ہماری ادھوری کہانی، کی بدترین ناکامی نے کامیابی کی جانب تیز پرواز کرتے وُرون کو وارن کر دیا اور اس نے اپنا فیصلہ بدل ڈالا! تازہ خبر کے مطابق اس کردار کے لیے سوری کا دوسرا نام انتخاب عاشقی ٹو فیم آدتیہ رائے کپور ہے!

بپاشا کی ممی پریشان!

بپاشا باسو کے پریمیوں میں آج کل کرن سنگھ

گروور کا نام آرہا ہے اور دونوں کا اچھا خاصا وقت ساتھ گزرتا ہے جس سے باقی سب تو خوش ہوں گے مگر ایک ہستی نا خوش ہے۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ بپاشا کی ممی ہیں! گروور کی امیج اچھی نہیں، اُسے لیڈیز مین کہا جاتا ہے، دو لڑکیوں کو چھوڑ چکا ہے سو بپاشا کی ممی کو نہیں لگتا کہ ان کی بیٹی سے وفا کر پائے گا! ممی چاہتی ہیں کہ بپاشا گروور سے مکمل کٹ آف کر دے......

یہ عشق ہے

صرف رن ویر سنگھ ہی دپیکا پر نہیں مرمٹا، لڑکی خود اور اس کی پوری فیملی بھی اس سنگھ پر فدا دکھائی دیتی ہے! رن ویر

نے تو اشاروں کنایوں میں میڈیا پر اعتراف محبت کر لیا ہے لیکن یہ دپیکا ہے۔ جو ابھی اس معاملے کو خفیہ رکھنا

چاہتی ہے۔ پچھلے دنوں دیپکا کے اسکواش پلیئر پاپا پرکاش پڈوکون کا ساٹھواں جنم دن تھا تو اس میں شرکت کی خاطر رن ویر، ملائیشیا، سیاٹی فا کی ریہرسلز سے بریک لے کر چند گھنٹوں کے لیے بنگلور آیا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سوہنا منڈا، دیپکا ہی نہیں اس کی پوری فیملی کو کتنی اہمیت دیتا ہے۔ اس بار فیملی نے بدلہ چکایا اور لندن میں رن ویر کی سالگرہ کو بھرپور بنا ڈالا۔

عمران ہاشمی کی پرسنل لائف

عمران ہاشمی، پرسنل لائف کے معاملے میں بہت

ریزرو ہے اور جب بچپن کی گرل فرینڈ پروین سے شادی کر رہا تھا، تب بھی اس کے بارے میں میڈیا سے بات کرنا اسے اچھا نہیں لگتا تھا لیکن جب کمسن بیٹا آیان کینسر کے موذی مرض کا شکار ہوا۔ اس دوران میڈیا نے بہت ہی ذمہ داری سے کوریج کرتے ہوئے آیان کے لیے عام لوگوں سے ڈھیروں دعاؤں کا بندوبست کیا۔ تب سے عمران کی میڈیا سے دوستی ہوئی ہے۔

گھائل ونس اگین

سنی دیول کی کم بیک مووی گھائل ونس اگین، جو 90 کی سپرہٹ گھائل کے سیکوئل کے طور پر بنائی جا
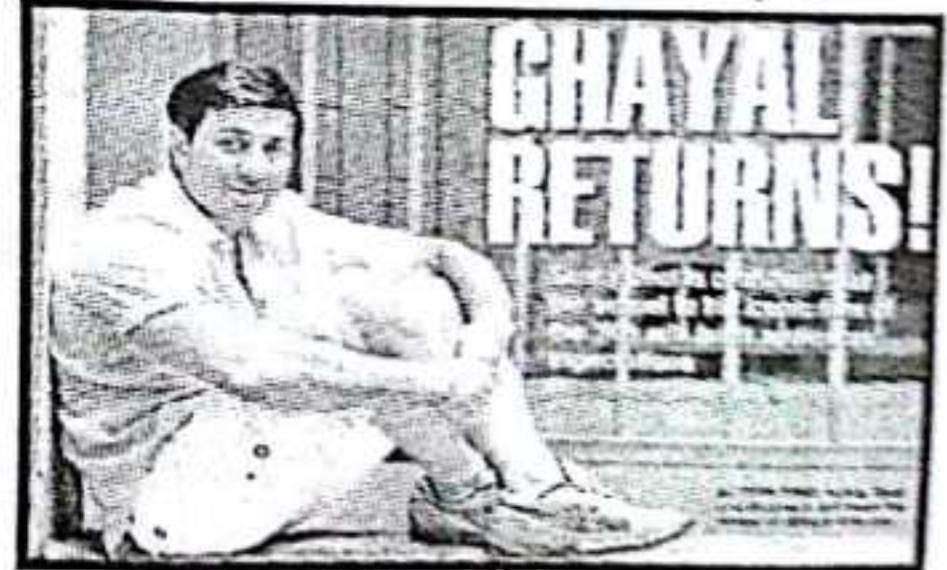
رہی ہے اور فلاپ دل لگی۔ کے بعد سنی کی دوسری ڈائریکٹوریل ہے۔ بہت تیزی سے بننے کے بعد ایک

دم رُک گئی ہے اور اس کی وجہ ہے فلم کا فنانشل کرائسس میں مبتلا ہونا۔ پچھلے دنوں نیکسٹ شیڈول کو صرف اس لیے کینسل کر دینا پڑا کہ ٹیکنیکل اسٹاف اور بعض کریو ممبرز کو ادا کیے جانے والے چیکس باؤنس ہو گئے تھے اور معاوضہ ملنے تک ان سب نے کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ پہلی ڈائریکٹوریل دل لگی، جسے لندن ٹائٹل سے شروع کیا گیا تھا۔ وہ فلم بھی مالی مسائل کا شکار ہو گئی تھی۔ برسوں بعد دوسری ڈائریکٹوریل کے ساتھ بھی مالی مسئلے کا ہونا ثابت کرتا ہے کہ منی میٹرز میں سنی دیول بالکل بھی ٹھیک نہیں۔

ری تھک نے کہا یادوں کو الوداع

ری تھک روشن فائنلی جوہو کے Sea فیسنگ اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو گیا ہے جہاں کوئی اور نہیں بلکہ

کھلاڑی اکشے کمار اس کا پڑوسی ہے۔ سوزانے سے ترک تعلق کے بعد ری تھک کو وہ گھر کاٹنے کو دوڑ رہا تھا اسی لیے کوشش میں تھا کہ جلد از جلد کسی اور جگہ شفٹ ہو جائے تا کہ در و دیوار سے چپکی یادیں پریشان نہ کر سکیں۔ اس سے ایک بات تو طے ہوئی کہ ری تھک سوزانے سے بہت محبت کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہے۔

اجے دیوگن کا مس فائر

کاجل کی واپسی کا بہت انتظار تھا اور یہ کارنامہ انجام دیا روہیت شیٹھی نے دل والے، کی صورت! شاہ رُخ اسٹار اس فلم کی بجائے کاجل کو بھی

اجے دیوگن کی کسی فلم سے ری اسٹارٹ لینا تھا لیکن

مس فائر ہوگیا اور اس کا ذمے دار اجے پوری طرح خود کو مانتا ہے۔ دیوگن کا کہنا ہے کہ اس نے ایک دوست کے مشورے پر اسکرپٹ دیکھے بغیر پلاننگ کر لی تھی لیکن جب اسکرپٹ دیکھا تو صاف اندازہ ہوا کہ بات بنے گی نہیں! اجے کی کئی فلمیں فلاپ رہی ہوں گی مگر یہ سچ ہے اُس کا اسکرپٹ سینس جاندار ہے، اور اسی لیے تو مہیش بھٹ کی زخم، پرکاش جہا کی گنگا جل، اور نشی کانت کامت کی درشیام، پانچ منٹ کے اندر سائن کر لی تھیں۔

جذبہ...... بارشوں کی نذر

سنجے گپتا کی اگلی ایشوریا رائے اسٹارر کا ٹائٹل ہے

جذبہ، جس کی تیز رفتار شوٹنگ کی جاتی رہی لیکن پچھلے دنوں ممبئی کی تیز بارشوں نے فلم میکر کا جذبہ ہی نہیں بلکہ باقی سب کے جذبات بھی ٹھیک ٹھاک متاثر کیے کیونکہ طوفانی بارشوں کے سبب ممکن ہی نہیں رہا کہ ٹیم جمع ہو کر ممبئی کے الورا اسٹوڈیو میں سکون سے کام کر سکے۔ گپتا ہالی ڈے ٹرپ پر دبئی گئے تھے۔ جہاں سے لوٹتے ہی شوٹنگ کا پروگرام تھا مگر ممبئی میں بارشوں کا آغاز ہوگیا اور یوں ایشوریا سمیت شبانہ اعظمی، جیکی شیروف اور چندن رائے سانیال سے لی گئی ڈیٹس ڈسٹرب ہو گئیں۔ جذبہ ساؤتھ کورین کرائم ڈرامہ مووی سیون ڈیز، سے متاثر ہو کر بنائی جا رہی ہے اور اس سال اکتوبر میں ریلیز کر دی جائے گی۔

چندو کی کمپنی۔ٹو

ویویک اوبرائے کا ڈاؤن فال جاری ہے اور پچھلے کئی سالوں سے اس کی کوئی فلم چل کے نہیں دے

رہی ہے تو ایسے میں بے چارے کو پہلی فلم کمپنی کا قابل ذکر کردار چندو یاد آ گیا۔ کمپنی رام گوپال ورما نے بنائی ہے اور اس کا اینڈ یوں تھا کہ مالک یعنی اجے دیوگن کی موت کے بعد چندو جیل چلا جاتا ہے۔ اپنے بُرے دور سے نکلنے کے لیے ویویک نے ایک کمپنی ٹو پلان کی ہے جس کی ابتداء وہاں سے ہوگی جہاں کمپنی کا انجام ہوا تھا یعنی تیرہ سال کی قید کے بعد چندو، جیل سے باہر آتا ہے! یہ فلم ویویک خود پرڈیوس کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ کمپنی ٹو کو پہلی فلم کی طرح رام گوپال ورما ہی ڈائریکٹ کریں گے یا یہ کام بھی ویویک اپنے کاندھوں پر اٹھائے رکھنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

☆☆......☆☆

نفسیاتی اُلجھنیں اور اُن کا حل

مختار بانو طاہرہ

زندگی اپنے ساتھ جہاں بہت ساری خوشیاں لے کر آتی ہے وہیں بہت سارے ایسے مسائل بھی جنم لیتے ہیں جو اس زندگی کو مشکلات کے شکنجے میں جکڑ لیتے ہیں ان میں سے بیشتر الجھنیں انسان کی نفسیات سے جڑی ہوتی ہیں اور انہیں انسان از خود حل کر سکتا ہے۔ یہ سلسلہ بھی اُن ہی الجھنوں کو سلجھانے کی ایک کڑی ہے۔ اپنے مسائل لکھ بھیجیں، ہماری کوشش ہوگی کہ آپ ان مسائل سے چھٹکارہ پالیں۔

افسر جہاں۔ لاڑکانہ

میری بیٹی کی شادی ہوئی، ایک سال بعد بچی کی پیدائش ہوئی، اس کی بیٹی بہت خوبصورت، گوری اور نیلی آنکھوں والی تھی۔ میرے داماد نے میری بیٹی پر طرح طرح کے الزامات لگانے شروع کر دیے۔ دراصل وہ سارے لوگ بہت سانولے اور بدصورت ہیں۔ شاید میں ان کے لیے ایسے الفاظ استعمال نہ کرتی مگر انہوں نے میری بیٹی کے ساتھ زیادتی کی، وہ بیمار رہنے لگی، مگر شوہر کا گھر نہ چھوڑا۔ اس کی بچی کو نمونیہ ہوگیا تو باپ اسپتال لے کر نہیں گیا۔ بچی دو ہفتے میں اللہ کو پیاری ہوگئی۔ اس کے بعد سے بیٹی میرے گھر پر ہے، ہر وقت روتی ہے، بہت دبلی ہوگئی ہے۔ سسرال کے نام سے ڈرتی ہے، شوہر آتا ہے تو چھپ جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر گھر نہیں آؤ گی تو طلاق دے دوں گا۔

ج: ایک ایسا شخص جس کے دل میں رحم نہ ہو جو اپنی اولاد کو اپنا ماننے پر تیار نہ ہو، بیوی کو طلاق کی دھمکی دے رہا ہو، کسی بھی طرح اس قابل نہیں کہ اس کے ساتھ ساری عمر گزاری جائے۔ آپ کی بیٹی کی ہمت تھی جو اتنا وقت بھی گزار لیا۔ آپ ہمت کریں اور انہیں بتا دیں کہ تم ذہنی طور پر ٹھیک نہیں ہو۔ جب تک تم ٹھیک نہیں ہو جاتے ہم اپنی بیٹی کو نہیں بھیج سکتے۔ بیٹی کو اطمینان دلائیں کہ اس کے ساتھ زبردستی نہیں کی جائے گی۔ وہ نہیں جانا چاہتی تو نہ جائے، اسے اتنی ہمت دیں کہ وہ چھپنے کے بجائے مشکل حالات کا مقابلہ کرنے کے قابل بن جائے۔

رضوان احمد۔ اٹک

میری عمر انیس سال ہے، کالج کا طالب علم ہوں، مستقبل میں انجینئر بننے کا ارادہ ہے۔ پڑھائی کے دوران کسی قسم کی دشواری نہیں ہوتی، نمبر بھی اچھے آتے ہیں لیکن جب بھی ٹیچر کوئی سوال کریں یا مجھے کوئی بات سمجھ میں نہ آئے اور پوچھنے کی کوشش کرتا ہوں تو گھبراہٹ ہونے لگتی ہے، دل بہت زور زور سے دھڑکتا ہے، لگتا ہے دل میں سے دھڑ دھڑ کی آواز آرہی ہے، سانس پھول جاتا ہے، بعض اوقات یاد نہیں آتا کہ کیا کہنا ہے۔

ج: ہمارے اکثر اسکولوں میں بچوں کو ٹیچر کا خوف ہوتا ہے۔ عام طور پر ٹیچر کا رویہ بھی کچھ اسی قسم کا ہوتا ہے کہ ان سے خوف زدہ رہنے میں ہی بچے سختی اور سزا سے خود کو بچا پاتے ہیں۔ بعض بچے بڑے

ہونے پر اس خوف پر قابو پالیتے ہیں اور بعض کو فوبیا ہوجاتا ہے، یعنی وہ اس صورت حال اور ایسے لوگوں سے ڈرتے ہیں جو ان کے خوف کا سبب نہ ہوں۔ آپ کے ساتھ بھی اسی طرح ہو رہا ہے۔ چند لڑکے جو پڑھنے میں اچھے ہوں، ان کے ساتھ پڑھیں اور ذہن میں وہ صورت حال لائیں جو ٹیچر سے سوال کرتے ہوئے ہوتی ہے۔ اس دوران اپنے گروپ میں سوال کریں اور انہیں بھی موقع دیں کہ وہ آپ سے سوالات پوچھیں جن کا وضاحت سے جواب دیا جاسکے۔ اس طرح اپنے مضامین ذہن نشین بھی ہوجائیں گے اور پھر ٹیچر سے وہی سوالات کرتے ہوئے گھبراہٹ میں بہت حد تک کمی محسوس ہوگی۔ کوشش جاری رکھی تو معمولی سی گھبراہٹ پر بھی قابو حاصل ہوجائے گا۔

روبینہ شمیم۔ کوٹ ادو

✪: خاندان میں کوئی بھی اسپتال میں داخل ہوتا ہے تو مجھے رونا آنے لگتا ہے۔ کھانا پینا چھوڑ دیتی ہوں۔ بار بار خیال آتا ہے کہ اب موت کی خبر آئے، فون کی گھنٹی پر گھبرا جاتی ہوں۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ گھر میں کوئی میری حالت پر توجہ نہیں دیتا۔ کسی دن میرا دل بھی زور زور سے دھڑک کر بند ہوجائے گا۔

✎: کوئی قریبی عزیز اچانک اسپتال میں داخل ہوجائے تو گھبراہٹ ہونی فطری بات ہے، لیکن جب یہ حد سے گزر جائے اور انسان کو اپنا دل ہی بند ہوجانے کا خطرہ محسوس ہو سمجھ لینا چاہیے کہ شدید گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ اس کیفیت میں دل کی دھڑکن معمول سے زیادہ ہوجاتی ہے۔ بعض لوگوں کو ٹھنڈے پسینے آتے ہیں، کسی کو محسوس ہوتا ہے دل کا دورہ پڑ رہا ہے۔ کوئی سمجھتا ہے سانس بند ہوجائے گی اور انہیں دم گھٹتا محسوس ہوتا ہے۔ موت کا خوف بھی ہوسکتا ہے۔ اگر یہ بات سمجھ لیں کہ آپ کو صرف گھبراہٹ ہے، کسی کے اسپتال میں داخل ہونے پر تشویش ہوجاتی ہے اور یہ کہ اسپتال میں داخل ہونے والوں کی ایسی کتنی تعداد ہے جو ٹھیک ہوکر اپنے گھر واپس آتے ہیں، اگر ان کا بروقت علاج نہ ہوتا تو زندگی کو خطرہ لاحق تھا۔ لہٰذا اسپتال میں داخل ہونا فکر کی بات نہیں، البتہ اس حوالے سے منفی خیالات آنا باعث تکلیف ہیں۔ آپ ان خیالات کو مثبت میں بدلیں۔ جب کسی کی موت کا خیال آئے تو فوراً سوچیں کہ وہ ٹھیک ہوجائیں گے۔ دوسروں کے حوالے سے اچھی سوچ اور بہتر خیالات آپ کے اپنے ذہنی رویے پر بھی اثر انداز ہوں گے۔ یہ بھی بہتر ہے کہ آپ کو توجہ کم مل رہی ہے کیونکہ اس حوالے سے زیادہ توجہ اپنے بارے میں ہونے والی تشویش میں اضافہ کا سبب ہوسکتی ہے۔

فیصل۔ کراچی

✪: میرا مسئلہ اتنا خاص نہیں، مگر میرے لیے بے حد تکلیف دہ بن گیا ہے۔ میری بیوی اور امی میں ہر وقت لڑائی ہوتی ہے۔ بیوی اب الگ رہنے کا مطالبہ کرتی ہے، مگر میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ انہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ بیوی کو بھی ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔ ذہنی دباؤ اس قدر بڑھتا ہے کہ دماغ کام نہیں کرتا۔

✎: ساس بہو کا جھگڑا نیا نہیں۔ اختلافی باتیں جتنی سُنیں گے اور توجہ دیں گے اتنی ہی بڑھیں گی۔ پہلے اپنی بیوی کو سمجھائیں کہ وہ آپ کی ماں کی عزت کرے اور بیوی کی غیر موجودگی میں ماں سے کہیں کہ آپ ان کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتے، لیکن اختلافات سے بے حد پریشان ہیں، یہی حالات رہے تو سب کا ساتھ رہنا مشکل بلکہ ناممکن ہوسکتا ہے لہٰذا وہ بھی درگزر سے کام لیں، کوئی بات ناگوار ہو بھی تو نہ کہیں کہ سب کو مل کر رہنا ہی ہے۔

☆☆......☆☆

پیارے قارئین۔ عیدالاضحیٰ کی آمد جہاں مردوں کو متحرک کردیتی ہے۔ وہیں بعداز قربانی' خواتین اور کچن پھر سے لازم وملزوم ہوجاتے ہیں۔ عیدالاضحیٰ کی مناسبت سے اِس بار آپ کے لیے مٹن اور بیف کی منفرد اور لذیز تراکیب کچن کارنر کا حصہ ہیں۔ اِس ماہ کا کچن کارنر آپ کو کیسا لگا؟ آپ کی آراء کا انتظار رہے گا۔

اسپیشل اسپائسی بیف

اجزاء

انڈرکٹ (چھوٹے ٹکڑے)	آدھا کلو
آلو (چوکور کٹے ہوئے)	2 عدد
پیاز (چوپ کی ہوئی)	2 عدد
ٹماٹر (پسے ہوئے)	2 پیالی
پسا ہوا لہسن	ایک کھانے کا چمچہ
کُٹی ہوئی کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	3 کھانے کے چمچے
لیموں کے چھلکے	ایک چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا (چوپ کیا ہوا)	آدھی پیالی
پسی ہوئی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	آدھا چائے کا چمچہ
تیل	3 کھانے کے چمچے
ہرا دھنیا	سجانے کے لیے

ترکیب:

دیگچی میں تیل گرم کرکے پیاز سنہری کریں۔ اس میں لہسن' گوشت' لال مرچ' کالی مرچ اور نمک ڈال کر چند منٹ تک بھونیں۔ اس میں ٹماٹر اور آلو ڈال کر گوشت گلنے اور پانی خشک ہونے تک پکائیں۔ اس میں لیموں کا رس اور لیموں کے چھلکے ڈال کر ڈش میں نکالیں اور ہرے دھنیے سے سجا کر پیش کریں۔

بیف جلفریزی

اجزاء

انڈرکٹ (باریک کٹا ہوا)	آدھا کلو
ٹماٹر (باریک کٹا ہوا)	2 عدد
شملہ مرچ (باریک کٹی ہوئی)	ایک عدد
پیاز (باریک کٹی ہوئی)	ایک عدد
ادرک (باریک کٹی ہوئی)	2 کھانے کے چمچے
ہری مرچیں (لمبائی میں کٹی ہوئی)	2 عدد
پسا ہوا لہسن	ایک چائے کا چمچہ
کُٹی ہوئی لال مرچ	2 چائے کے چمچے
بُھنا ہوا' کُٹا ہوا سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
چلی گارلک ساس	2 کھانے کے چمچے
سفید سرکہ	2 کھانے کے چمچے
سویا ساس	2 کھانے کے چمچے
نمک	ایک چائے کا چمچہ
تیل	پون پیالی
آملیٹ (پٹیوں میں کٹا ہوا)	سجانے کے لیے

ترکیب:

کڑاہی میں تیل گرم کریں' اس میں لہسن بُھون کر انڈرکٹ ڈالیں اور تیز آنچ پر رنگ تبدیل ہونے تک پکائیں۔

اس میں لال مرچ، زیرہ، سرکہ، سویا ساس، چلی گارلک ساس، ادرک اور نمک ڈال کر چند منٹ تک پکائیں۔ اس میں پیاز ہری مرچیں اور شملہ مرچ ڈال کر پانی خشک ہونے تک پکائیں، پھر ٹماٹر شامل کریں اور 5 منٹ پکا کر ڈش میں نکالیں۔ اسے آملیٹ سے سجا کر پیش کریں۔

اسپیشل تکہ بوٹی

اجزاء:

گائے کی بوٹیاں	آدھا کلو
پسا ہوا کچا پپیتہ	2 کھانے کے چمچے
پسی ہوئی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
پسا ہوا سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
ادرک (چوپ کی ہوئی)	ایک کھانے کا چمچہ
لیموں	3 عدد
تیار تکہ بوٹی مسالا	آدھا کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

رائتے کے اجزاء:

دہی	250 گرام
پودینہ	آدھی گڈی
ہری مرچیں	3 عدد
کارن فلور	ایک چائے کا چمچہ
تازہ دودھ	آدھی پیالی
پسا ہوا سفید زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
ہرا دھنیا، لیموں	سجانے کے لیے

ترکیب:

ہری مرچوں میں پودینہ ملا کر پیسیں اور ایک پیالے میں نکالیں۔ اس میں رائتے کے باقی اجزاء ڈال کر یکجان کریں۔ بوٹیوں کو کسی بھاری چیز کی مدد سے ہلکا کچل کر ایک پیالے میں ڈالیں۔ اس میں بوٹیوں کے باقی اجزاء ملا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ گرم پین کو چکنا کر کے بوٹیوں کو الگ الگ سینک لیں۔ درمیان میں برش کی مدد سے تیل لگاتے جائیں۔ جب دونوں طرف سے سنہری ہو جائے تو ڈش میں نکالیں۔ اسے ہرے دھنیے اور لیموں سے سجا کر پیش کریں۔

اسپیشل پلاؤ

اجزاء

گائے کا گوشت (اُبال لیں)	آدھا کلو
چاول (اُبلے ہوئے)	2 کپ
پیاز (چوپ کرلیں)	2 عدد
ہری مرچیں (چوپ کرلیں)	2 عدد
نمک	حسب ذائقہ
سیاہ مرچ پاؤڈر	1 چائے کا چمچہ
ٹماٹو پیوری	2 کپ
بریڈ کرمبز	1 کپ
ہری پیاز (چوپ کرلیں)	آدھا کپ
مکھن یا گھی	حسب ضرورت

ترکیب:

گوشت، چاول اور ٹماٹو پیوری کو 5 منٹ پکائیں۔ اب اس میں پیاز، ہری مرچیں، نمک، سیاہ مرچیں اور ہری پیاز ملا کر ایک بیکنگ ٹرے میں رکھ کر بریڈ کرمب سے کور کریں۔ اوپر سے تھوڑا سا مکھن یا گھی چھڑکیں اور ہلکی آنچ پر آدھا گھنٹہ بیک کریں۔ سرونگ ڈش میں نکال کر گرم سرو کریں۔

مٹکا گوشت

اجزاء

گائے کا گوشت	1 کلو (بڑی بوٹیاں بنالیں)
پیاز (سلائس کاٹ لیں	3 عدد
لہسن پیسٹ	1 کھانے کا چمچہ
ادرک پیسٹ	1 چائے کا چمچہ
ہلدی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
لال مرچ پاؤڈر	1 کھانے کا چمچہ

دھنیا پاؤڈر	1 چائے کا چمچہ
سیاہ زیرہ	1 چائے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
دہی	1 کپ
آٹا	آدھا کپ
گھی	1 کپ
نمک	حسبِ ذائقہ

سرونگ کے لیے:

ہرا دھنیا (چوپ کیا ہوا)	حسبِ ضرورت
ہری مرچیں (چوپ کی ہوئی)	حسبِ ضرورت
ادرک (سلائس کاٹ لیں)	حسبِ ضرورت
لیموں (ٹکڑوں میں کاٹ لیں)	2 عدد

ترکیب:

مٹکے کو چولہے پر رکھیں۔ اس میں گھی گرم کر کے پیاز ڈال کر ساتے فرائی کر لیں اور گوشت ڈال کر بھونیں۔ گوشت بھن جائے تو لہسن، ادرک پیسٹ، نمک، لال مرچ پاؤڈر، ہلدی پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر، سیاہ زیرہ آدھا چائے کا چمچہ اور پانی ڈال کر ڈھک کر آٹے سے ڈھکنا بند کر دیں اور ہلکی آنچ پر گوشت پکائیں۔ گوشت گل جائے تو روغن الگ نکال لیں اور ایک طرف رکھیں۔ گوشت میں دہی ڈال کر بھونیں 5-4 گلاس پانی ڈال دیں۔ اُبال آنے پر آٹا آدھا کپ پانی میں گھول کر تھوڑا تھوڑا ڈالیں اور چمچہ چلاتے رہیں۔

سالن کو زیادہ گاڑھا نہ کریں ہلکا سا گاڑھا ہو جائے تو باقی سیاہ زیرہ ڈال کر ہلکی آنچ پر 10 منٹ پکائیں گرم مسالا پاؤڈر شامل کر کے مکس کر دیں۔ چولہے سے اُتار کر جو روغن سالن سے نکالا تھا وہ واپس سالن میں ڈال دیں سرونگ ڈش میں نکال کر ہرے مسالے اور نان کے ساتھ سرو کریں۔

مٹن مکس پلیٹ

اجزاء:

چانپ	4 عدد
گردے	4 عدد
دل	1 عدد
کلیجی	250 گرام
مغز (اُبال کر چوپ کر لیں)	2 عدد
پیاز (باریک کاٹ لیں)	2 عدد
لہسن، ادرک پیسٹ	1 کھانے کا چمچہ
لال مرچ پاؤڈر	1 چائے کا چمچہ
ہلدی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسبِ ذائقہ
ٹماٹر (چوپ کر لیں)	3 عدد
دہی	3 کھانے کے چمچے
گرم مسالا پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
زیرہ (کٹا ہوا)	آدھا چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا، ہری مرچیں	حسبِ ضرورت
تیل	تین پاؤ
لہسن	2 کھانے کے چمچے
ثابت دھنیا (کٹا ہوا)	آدھا چائے کا چمچہ

ترکیب:

گردے، کلیجی اور دل کی بوٹیاں بنا کر دیگچی میں چانپ، گردے، کلیجی اور دل ڈال کر اُبال لیں۔ سوس پین میں تیل گرم کر کے پیاز ڈال کر فرائی کریں۔ چانپ، دل، گردے، لہسن، ادرک، نمک، لال مرچ پاؤڈر، ہلدی پاؤڈر اور ٹماٹر ڈال کر ڈھک کر درمیانی آنچ پر پکائیں۔ ٹماٹر نرم ہو جائیں تو کلیجی ڈال کر پکائیں اور 5 منٹ دہی ڈال کر بھون لیں۔ چوپ کیا ہوا مغز کٹا ہوا زیرہ، دھنیا، گرم مسالا، ہرا دھنیا، ہری مرچیں ڈال کر مکس کر کے ہلکا سا بھون لیں سرونگ پلیٹ میں نکال کر نان سلاد اور رائتے کے ساتھ سرو کریں۔

☆☆......☆☆

حکیم جی!

محمد رضوان حکیم

ساتھیو! اکثر ہمیں کسی ایسی بیماری سے سامنا کرنا پڑتا ہے جس کے لیے ہمیں سمندر کی تہہ یا آسمان کی بلندیوں، جنگل بیابانوں یا پہاڑوں تک پر جانا پڑ جاتا ہے مگر...... جان ہے تو جہان ہے۔ خدا اگر بیماری دیتا ہے تو اُس نے شفاء بھی دی ہے۔ قدرت کے طریقۂ علاج کا آج بھی کوئی مول نہیں۔ حکمت کو آج بھی روزِ اول کی طرح عروج حاصل ہے۔ اسی لیے طبیب اور حکیم صاحبان کو خدائی تحفہ کہا جاتا ہے۔ آپ کی صحت اور تندرستی کے لیے ہم نے یہ سلسلہ بعنوان 'حکیم جی' شروع کیا ہے۔ اُمید ہے ہمارے مستند اور تجربہ کار حکیم صاحب آپ کی جملہ بیماریوں کے خاتمے کے لیے اہم کردار ادا کریں گے۔ نیا سلسلہ حکیم جی! آپ کو کیسا لگا؟ اپنی آراء سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

اسپغول سے تقریباً ہر شخص واقف ہے۔ بڑی مشہور و معروف دوا ہے۔ اسپغول ایک بیج ہے جس کا پودا ایک گز کے قریب اونچا ہوتا ہے۔ اس کی ٹہنیاں باریک ہوتی ہیں اور پتے لمبے یعنی جامن کے پتوں سے تقریباً مشابہ ہوتے ہیں۔ اس کا رنگ سرخی مائل سفید اور سیاہ ہوتا ہے۔ یہ بے ذائقہ اور بے لعاب ہوتا ہے۔ اس کا مزاج سرد اور تر ہوتا ہے۔ اس کی مقدار خوراک تین ماشہ سے ایک تولہ تک ہوتی ہے۔ اسپغول کے چھلکے کو سبوس اسپغول بھی کہتے ہیں۔

اسپغول کے فوائد

☆ گرمی اور پیاس کو تسکین دیتا ہے۔

☆ گرمی کے بخار اور خون کے جوش کو تسکین دے کر طبیعت کو نرم کرتا ہے۔

☆ سینہ، زبان، حلق کے کھر کھر پن اور صفرادی و سودی بیماریوں کے لیے مفید ہے۔

☆ آنتوں کے زخموں اور مروڑ ہونے کی حالت میں مفید ہے۔ اس کے لیے اسے شربت صندل میں ایک بڑا چمچ ڈال کر پینا مفید ہوتا ہے۔

اسپغول سے علاج

قبض کے لیے

☆ قبض کشا ہے۔ آنتوں میں پھسلن پیدا کرتا ہے۔

اس کے لیے اگر رات سوتے وقت ایک گلاس دودھ میں ایک تولہ اسپغول کا چھلکا ملا کر تین چار منٹ بعد استعمال کرنے سے کھل کر اجابت ہوتی ہے۔ یہ دائمی قبض میں بھی بے حد مفید ہے۔

سر درد کے لیے

سر درد کی صورت میں اسپغول سرکہ میں رگڑ کر چنبیلی کا تیل ملا کر پیشانی پر لیپ کرنے سے فائدہ ہوتا ہے۔

اگر چنبیلی کے روغن کے بجائے بادام روغن ملا کر پیا جائے تو سر درد کو فائدہ ہوتا ہے۔

جریان کے لیے

جریان میں اسپغول کا چھلکا ہمراہ شربت بزوری یا صندل کے ہمراہ صبح نہار منہ پینا فائدہ مند ہے۔

دماغی طاقت کے لیے

☆ دماغی طاقت بڑھاتا ہے۔ دماغی کام کرنے والوں کے لیے ضروری ہے۔ کہ رات سوتے وقت ایک تولہ اسپغول دودھ میں ملا کر پانچ دانے گری بادام چبا کر کھائیں اور بعد میں اسپغول ملا دودھ پئیں۔ یہ مقوی دماغ نسخہ ہے۔

نسیان کے لیے

☆ نسیان کی امراض میں اسپغول ایک بڑا چمچ ہمراہ شربت صندل صبح نہار منہ پینا بے حد مفید ہے اور رات کو سوتے وقت پانچ دانہ گری بادام، سونف ایک تولہ اور کوزہ مصری حسب ضرورت ہمراہ دودھ استعمال کریں۔

منہ کے دانوں کے لیے

☆ منہ کے دانوں میں اسپغول کا استعمال بے حد مفید ہے۔ ایسی صورت میں دہی میں ایک بڑا چمچ اسپغول ملا کر صبح نہار منہ کھایا جائے اور ہر کھانے کے بعد دہی کے ایک یا دو چمچ استعمال کیے جائیں۔

ورم کے لیے

☆ ورموں کو تحلیل کرنے کے لیے اسپغول کو سرکہ میں رگڑ کر متاثرہ جگہ پر لیپ کرنا بے حد مفید ہے۔

بالوں کے لیے

☆ بالوں کو نرم کرنے اور بڑھانے کے لیے عرق گلاب میں رگڑ کر بالوں پر لیپ کرنے اور دو گھنٹے بعد دھونے سے فائدہ ہوتا ہے۔ (یہ علاج موسم گرما کے لیے ہے)

خشک کھانسی کے لیے

خشک کھانسی اور دمہ کے لیے روزانہ ایک تولہ اسپغول دودھ یا پانی کے ساتھ چالیس روز تک روزانہ استعمال کریں۔

☆ اسپغول کا جوشاندہ بطور مسکن و ملین مشروب سوزش معدہ اور قہم اور سینے کی جلن میں مفید ہے۔

☆☆......☆☆

آپ کے جانے پہچانے اسکن اسپیشلسٹ ڈاکٹر خرم مشیر

ہر ماہ آپ کی بیوٹی سے متعلقہ مسائل کے حل کے ساتھ

پیارے قارئین! کون ہے جو دوسروں سے نمایاں نظر نہیں آنا چاہتا اور اگر یہ انفرادیت گھر بیٹھے حاصل ہو جائے تو کیا ہی بات ہے۔ چلیں ہم آپ کی مشکل آسان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ آپ بغیر پیسے خرچ کیے گھر بیٹھے اپنے چہرے کو حسین و دلکش کیسے بنا سکتے ہیں۔

پئیں، چند ہی دنوں میں فرق نظر آئے گا، اسی طرح سے تازہ دودھ سے چند دنوں تک مسلسل چہرہ دھونے سے رنگت نکھر جاتی ہے۔

دودھ کی بالائی میں تھوڑا سا شہد ملا کر اس سے چہرے پر اچھی طرح مساج کریں۔ چند منٹ بعد چہرہ دھولیں۔ گرمی میں یہ عمل ہفتے میں 3 مرتبہ جب کہ سردیوں میں روزانہ دہرانے سے چہرہ نرم وملائم رہتا ہے۔

رات کو سونے سے قبل ایک لیموں کے رس میں ایک چٹکی زعفران گھولیں اور اس میں چائے کا چمچہ زیتون کا تیل ملا کر ملیں، اس سے چہرہ نکھر جاتا ہے۔ اگر چہرے پر دانے نکلتے ہوں تو پودینے کے پتے آدھی پیالی میں اُبالیں اور ٹھنڈا کر کے

انڈے کی زردی میں 2 چائے کے چمچے بادام کا تیل اور ایک چائے کا چمچہ لیموں کا رس ملا کر جھاگ بننے تک پھینٹیں۔ اس آمیزے کو چہرے پر لگائیں اور 10 منٹ بعد نیم گرم پانی سے چہرہ دھولیں، چہرہ تر و تازہ ہو جائے گا۔

خربوزے کے چھلے ہوئے بیج پانی میں پیسیں اور چہرے پر اس کا لیپ کریں، اس سے چہرہ نکھر جائے گا۔

دھوپ میں جلے ہوئے چہرے پر تازہ دہی ملیں اور 10 منٹ بعد چہرہ پانی سے دھولیں۔

دھوپ کے مضر نشانات دور ہو جائیں گے۔

رنگت نکھارنے کے لیے خشخاش کو باریک پیس کر چہرے پر ملیں، اسی طرح سے چہرے پر ٹماٹر کا رس ملنے سے بھی رنگت بہتر ہو جاتی ہے۔
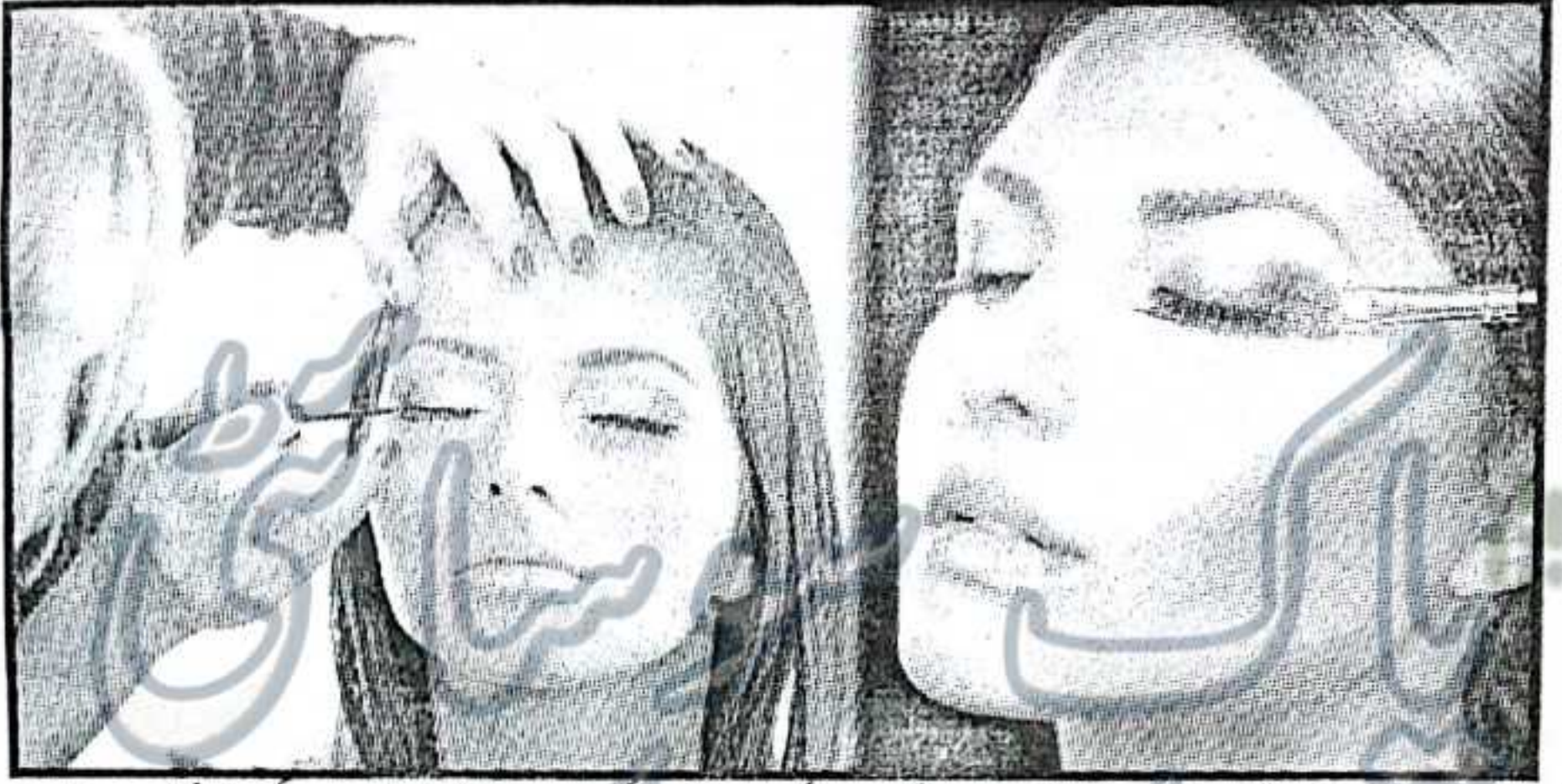
مولی کے بیج باریک پیس کر دودھ کی بالائی میں ملا کر رات کو سوتے وقت چہرے پر ملیں اور صبح اٹھ کر کسی اچھے صابن سے دھولیں۔ صبح نہار منہ نیم گرم پانی میں لیموں کا رس ملا کر پینے سے چہرہ شاداب رہتا ہے۔ چہرے کی شادابی کے لیے بادام کو چھلکے سمیت مٹی کے کھردرے برتن میں رگڑیں۔ اس میں تھوڑی سی بالائی ملا کر چہرے پر ملیں، پھر ایک گھنٹے بعد چہرہ دھولیں۔

خمیر ہوئے آٹے کو اچھی طرح سے چہرے پر ملیں اور اس کے بعد کم از کم ایک گھنٹے تک چہرہ نہ دھوئیں۔ اس سے چہرے کا سارا گرد غبار نکل جائے گا۔ نمک ملے پانی سے منہ دھونے سے چہرے کا رنگ نکھر جاتا ہے۔ روغن بادام کو پانی میں پھینٹ کر چہرے پر لیپ کرنے سے رنگت نکھر جاتی ہے۔ زیتون کے خالص تیل میں لیموں کا رس چند قطرے ملا کر چہرے کی مالش کرنے سے چہرہ خوبصورت ہو جاتا ہے۔

اکثر گرمی سے پسینہ آتا ہے اور چہرے کے مسام کھل جاتے ہیں۔ اس مسئلے کے حل کے لیے تربوز، کھیرے اور ٹماٹر میں سے کسی کا بھی رس فرج میں ٹھنڈا کر کے چہرے پر لگائیں۔ 15 منٹ تک یہ رس چہرے پر لگا رہنے دیں، پھر چہرہ دھولیں۔ اگر جلد چکنی ہو یا دانے نکلتے ہوں تو جو کا آٹا پانی میں ملا کر، اور اگر خشک ہے تو دہی اور دودھ میں ملا کر چہرے پر لگائیں۔ دن میں کئی بار سادہ پانی سے چہرہ دھونا بھی فائدہ مند ہے۔

☆☆......☆☆